اصولِ ترجمہ و تفسیر القرآن

(مترجم)

قرآن پاک کے ترجمہ اور تفسیر کے جامع اور مفصل اصول و قواعد کا بیان

تصنیف

السید محمد بن علوی المالکی الحسنی

ڈاکٹر پروفیسر حرم شریف مکہ معظمہ

مترجم

غلام نصیر الدین

جامعہ نعیمیہ لاہور

فرید بک سٹال

۳۸۔ اردو بازار لاہور

وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ

اور ہم نے آپ کی طرف قرآن نازل کیا کہ آپ لوگوں کو صاف صاف بتا دیں جو ان کی طرف نازل کیا گیا

(النحل: ۴۴)

زُبدۃ الاتقان فی عُلُوم القرآن (عربی)

اُصُولِ ترجمہ و تفسیر القرآن (مترجم)

قرآن پاک کے ترجمہ اور تفسیر کے جامع اور مفصل
اصُول و قواعد کا بیان

تصنیف

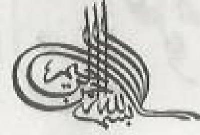
السید مُحمد بن علوی المالکی الحسنی
ڈاکٹر پروفیسر حرم شریف مکہ معظمہ

مُترجم

غلام نصیر الدّین
جامعہ نعیمیہ لاہور

ناشر

فرید بک سٹال ۳۸۔ اُردو بازار لاہور





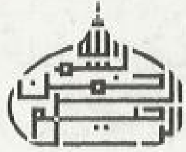
تصحیح : حافظ محمد اکرم ساجد محمد اشتیاق
مطبع : رومی پبلیکیشنز اینڈ پرنٹرز لاہور
الطبع الاوّل : صفر 1430ھ / فروری 2009ء
قیمت : روپے

فرید بک سٹال ۳۸۔ اردو بازار لاہور
فون نمبر ۰۹۲۔۴۲۔۷۳۱۲۱۷۳۔۷۱۲۳۴۳۵
فیکس نمبر ۰۹۲۔۴۲۔۷۲۲۴۸۹۹
ای میل: info@faridbookstall.com
ویب سائٹ: www.faridbookstall.com

Farid Book Stall
Phone No:092-42-7312173-7123435
Fax No.092-42-7224899
Email:info@faridbookstall.com
Visit us at:www.faridbookstall.com

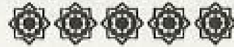
فہرس

زبدۃ الاتقان فی علوم القرآن



الاھداء

ترجمان القرآن
حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما
کے نام
جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اور دعا کی برکت سے
تمام امت میں سب سے
بڑے ماہر قرآن ٹھہرے۔





تعارف مصنف

عالم عرب کے عظیم مصلح اور مفکر

فضیلۃ الشیخ پروفیسر ڈاکٹر محمد علوی الحسنی المالکی مدظلہ

آپ کا اسم گرامی محمد، والد کا نام علوی اور دادا کا نام عباس ہے۔ آپ کا تعلق خاندان سادات سے ہے۔ سلسلہ نسب ستائیس واسطوں سے رسالت مآب ﷺ تک پہنچتا ہے۔ مسلکاً مالکی اور مشرباً قادری ہیں۔ کیونکہ آپ کے دادا اور والد گرامی دونوں، شہزادہ اعلیٰ حضرت مفتی اعظم ہند شاہ مصطفیٰ رضا خان رحمہ اللہ تعالیٰ کے خلفاء تھے اور خود آپ خلیفہ اعلیٰ حضرت مولانا ضیاء الدین مدنی قادری کے خلیفہ ہیں۔

آپ مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے، وہیں آپ نے پرورش پائی، مسجد حرام مدرسہ الفلاح اور مدرسہ تحفیظ القرآن الکریم سے آپ نے تعلیم حاصل کی، آپ نہایت حسین وجمیل، قد آور شخصیت کے مالک تھے۔

تعلیمی سفر

آپ نے صرف اپنے وطن میں علوم حاصل کرنے پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ اس کے لیے تمام عالم اسلام کا سفر کیا۔

فن حدیث میں ڈاکٹریٹ

آپ نے جامعہ ازہر مصر میں فن حدیث اور اصول حدیث کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کی۔

فرائض تدریس اور عدم بلوغ

آپ بچپن ہی سے نہایت ذہین وفطین ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے بلوغ سے قبل بہت سے علوم کی تدریس کے فرائض سرانجام دیئے ہیں۔ اس کرم پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے

لکھتے ہیں:

وَقَدْ بَدَأْتُ التَّدْرِيْسَ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَاَنَا دُوْنَ الْبُلُوْغِ بِاَمْرِ وَالِدِىْ الْمَرْحُوْمِ السَّيِّدِ عَلَوِىْ الْمَالِكِيِّ الَّذِىْ كَانَ يَاْمُرُنِىْ بِتَدْرِيْسِ كُلِّ كِتَابٍ اَتْمَمْتُ قِرَاءَتَهٗ عَلَيْهِ فِىْ ذٰلِكَ الْوَقْتِ فَكَانَ يَاْمُرُ الطُّلَّابَ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ عِنْدَهٗ بِالْحُضُوْرِ عِنْدِىْ.

میں نے اللہ کے فضل وکرم سے جب تدریس شروع کی تو اس وقت ابھی نابالغ تھا، میں اپنے والد گرامی علوی المالکی سے جو کتاب بھی پڑھتا، جب ختم ہوتی تو آپ اس کی تدریس کا حکم دیتے۔ جو طالب علم بھی مذکورہ کتاب پڑھنے کے لیے ان کے پاس آتا، اسے میرے پاس بھیج دیتے۔

الکلیہ الشرعیہ کے ساتھ تعلق

علمی ثقاہت وشہرت کی وجہ سے آپ کو ۱۳۹۰ھ میں کلیہ الشرعیہ مکۃ المکرمہ میں استاد مقررر کیا گیا۔

مسجد حرام میں تدریس

جب ۱۳۹۱ھ میں آپ کے والد گرامی سید علوی المالکی کا وصال ہوگیا تو علماء مکہ نے آپ کی خدمت میں حاضر ہوکر کہا کہ اب ان کی مسند کی ذمہ داری نبھانا آپ کا ہی کام ہے۔

نداء الاسلام پر درس

مسجد حرام میں اپنے والد گرامی کی جگہ درس دینے کے ساتھ ساتھ مکۃ المکرمہ کے نداء الاسلام ریڈیو سے اسلامی موضوعات پر درس کا سلسلہ بھی شروع فرمایا، جس طرح آپ کے والد گرامی کا درس ہر جمعہ کی صبح کو نداء الاسلام نشر کرتا تھا، اسی طرح آپ کا درس بھی اسی موقع پر شروع کردیا گیا۔

ادارے کا قیام

آپ نے مکۃ المکرمہ کے محلّہ رصیفہ میں دینی علوم کا ایک مرکز قائم کر رکھا ہے، جس کا نام مدرسہ عتیبیہ ہے۔

ہر روز محفل ذکر و نعت

آپ کے پاس چونکہ ہر روز مختلف مقامات سے تربیت' زیارت اور ملاقات کے لیے کافی تعداد میں لوگ آتے رہتے ہیں۔اس لیے ہر روز مغرب کی نماز کے بعد آپ کے ہاں محفل ذکر و نعت منعقد ہوتی ہے۔

عالمی کانفرنسوں میں شرکت

حجاز مقدس میں اپنی گوناں گوں مصروفیات کے باوجود آپ نے متعدد دفعہ الجزائر' انڈونیشیا' کینیڈا' مراکش' برطانیہ' پاکستان اور ہندوستان سمیت کئی ممالک میں بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کی۔

عالمی مقابلہ قراءت کی صدارت

آپ سعودیہ میں منعقد ہونے والے بین الاقوامی مقابلہ قراءت کے تین سال تک صدر رہے'

تصانیف

آپ نے مختلف تعلیمی' تدریسی' تربیتی اور انتظامی ذمہ داریاں سنبھالنے کے ساتھ ساتھ تیس سے زائد کتب تصنیف کی ہیں' جو عالم اسلام کے لیے رہتی دنیا تک رہنمائی کا کام دیں گی۔آپ نے عقائد' تفسیر' حدیث' سیرت' معیشت' معاشرت پر جس طرح قلم اٹھایا ہے' وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ہر کتاب کا مطالعہ کرنے والا شخص یوں سمجھتا ہے کہ اس فن میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔

آپ کی تصانیف کے نام

(۱) الانسان الکامل

(۲) زبدة الاتقان فی علوم القرآن

(۳) المنهل اللطيف فی اصول الحديث

(۴) القواعد الاساسيه فی علم مصطلح الحديث

(۵) فضل المؤطا وعناية الامة الاسلاميه

(۶) حول خصائص القرآن

(۷) قل هذه سبيلی

(۸) لبيك اللهم لبيك

(۹) حول الاحتفال بالمولد النبوی الشريف

(۱۰) حاشيه المختصر فی السيره النبويه

(۱۱) فی رحاب البيت الحرام

(۱۲) ذكريات و مناسبات

(۱۳) المستشرقون بين الانصاف و العصبيه

(۱۴) الدعوه الاصلاحيه

(۱۵) فی سُبُل الهدى و الرشاد

(۱۶) ادب السلام فی نظام الأسرة

(۱۷) الطالع السعيد المنتخب من المسلسلات و الأسانيد

(۱۸) شريعة الله الخالدة

(۱۹) حاشيه المورد الروی

(۲۰) شرح المولد لابن كثير

(۲۱) الذخائر المُحمّديه

(۲۲) مفاهيم يجب ان تصحح

(۲۳) شرف الأمة المُحمّديه

(۲۴) القدوة الحسنه فی منهج الدعوة الى الله

(۲۵) تحقيق و تعليق على قريب المُجيب

(۲۶) الحصون المنيعه

(۲۷) مقبرة جنت المعلى

(۲۸) شفاء الفواد بزياره خير العباد

(۲۹) تاريخ الحوادث والأحوال النبويه

(۳۰) مفهوم التطور و التجديد فی الشريعة الاسلاميه

اور جس کے ہر دعویٰ کو آنے والے وقت نے سچا کر دکھایا۔

قرآن کریم سے پہلے نازل ہونے والی آسمانی کتابوں میں سے آج کوئی کتاب اپنی اس زبان میں موجود نہیں ہے' جس زبان میں وہ نازل ہوئی تھی اور نہ کسی دوسری آسمانی کتاب کے ماننے والے یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ان کی کتاب آج ان کے ہاتھوں میں بعینہٖ اسی طرح موجود ہے' جس طرح وہ نازل ہوئی تھی اور اس میں کوئی کمی بیشی یا تبدیلی اور تحریف نہیں ہوئی۔ اس کے برخلاف قرآن مجید نے دعویٰ کیا:

''اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ O'' (الحجر: ۹)

بے شک ہم نے قرآن مجید کو نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

قرآن مجید کا یہ چیلنج چودہ صدیوں سے موجود ہے اور اسلام کا کٹر سے کٹر مخالف بھی یہ ثابت نہیں کر سکا کہ قرآن کریم میں فلاں سورت یا فلاں آیت کم یا زیادہ ہوگئی اور قرآن مجید کا یہ دعویٰ جھوٹا ہوگیا۔ کسی سورت یا آیت میں کمی بیشی تو بڑی بات ہے' یہ تک نہیں ثابت کیا جا سکا کہ قرآن کریم میں کسی نقطہ یا زیر زبر کی کمی بیشی ہوگئی۔

اسی طرح قرآن مجید نے یہ دعویٰ کیا کہ اس کی کسی آیت میں تحریف نہیں ہو سکتی' قرآن کریم کی کسی آیت کو دوسرے الفاظ میں بدلا نہیں جا سکتا ''لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ'' (حٰم السجدہ: ۴۲) غیر قرآن' قرآن میں شامل نہیں ہو سکتا نہ آگے نہ پیچھے سے۔

چودہ صدیاں گزر جانے کے بعد کوئی بڑے سے بڑا منکرِ اسلام بھی یہ ثابت نہیں کر سکا کہ قرآن مجید کی فلاں آیت پہلے اس طرح تھی اور اب اس طرح ہے۔ قرآن مجید میں چھ ہزار چھ سو سولہ آیات ستر ہزار نو سو چونتیس کلمات اور تین لاکھ تئیس ہزار چھ سو اکہتر حروف ہیں۔

(علامہ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ الاتقان فی علوم القرآن ج ا ص ۷۰۔ ۶۷ 'مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور)

اور کسی آیت کسی کلمہ بلکہ کسی حرف کے بارے میں بھی کمی بیشی یا تبدیلی اور تحریف کا کوئی شخص دعویٰ نہیں کر سکا اور قرآن مجید کی جتنی آیات' جتنے کلمات بلکہ جتنے حروف ہیں' وہ سب تین طرح قرآن مجید کی صداقت پر دلیل ہیں' نہ کسی کی کمی ہو سکی نہ زیادتی ہو سکی نہ اس میں کوئی تبدیلی ہو سکی۔ دنیا کی کسی اور کتاب کی صداقت پر اتنے دلائل آج تک نہیں دیئے جا سکے۔

قرآن کریم نے اپنی صداقت اور حقانیت پر ایک اور طرز سے دلیل قائم کی کہ جن وانس

میں سے کوئی شخص اس کی نظیر اور مثیل نہیں لا سکتا' پہلے فرمایا: ''قُلْ لَّىِٕنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ'' (بنی اسرائیل: ۸۸) آپ فرما دیجئے کہ اگر تمام انسان اور جنات قرآن مجید کی مثال لانے پر اکٹھے ہو جائیں تو پھر بھی اس جیسا کلام نہیں لا سکتے' اس کے بعد فرمایا:

''اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ'' (ھود: ۱۳) کیا یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ نے یہ خود بنا لیا ہے' آپ کہہ دیجئے کہ تم اس جیسی دس سورتیں بنا کر لے آؤ۔

پھر فرمایا:

''وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ'' (البقرہ: ۲۳)

اگر تم اس کلام (کے کلام ربانی ہونے) میں شک کرتے ہو' جس کو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے تو اس کلام کی مثل ایک سورت ہی لے آؤ۔

اس کے بعد فرمایا:

''فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖۤ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ'' (الطور: ۳۴) اگر یہ سچے ہیں تو اس جیسی ایک آیت ہی لے آئیں۔

چودہ صدیاں گزر چکی ہیں اور دن بدن دنیا میں علوم وفنون کی ترقی ہو رہی ہے اور زبان و بیان کے متعلق ہر فن پر سینکڑوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ اور اسلام کے مخالفین اور منکرین کی بے پناہ کثرت اور یورش ہے' اس کے باوجود چودہ سو سال سے لے کر آج تک کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکا کہ میں نے قرآن مجید یا اس کی ایک سورت یا ایک آیت کی مثال بنا لی ہے۔

اور قرآن مجید کی جس قدر سورتیں اور جتنی آیات ہیں' منکرین کے سامنے اتنے ہی چیلنج ہیں اور قرآن کریم کی حقانیت اور صاحبِ قرآن کی صداقت پر اتنی ہی دلیلیں ہیں' کیونکہ ہر ہر سورت اور ہر ہر آیت ایک چیلنج ہے۔

اگر کسی کے بس میں قرآن مجید یا اس کی کسی سورت یا کسی آیت کی مثل لانا ممکن ہوتی تو اب تک لا چکا ہوتا' جس وقت قرآن مجید نے یہ دعویٰ کیا' اُس وقت کوئی مثال لا سکا نہ اب تک لا سکا ہے۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ یہ قرآن جس طرح چودہ سو سال پہلے رسول اللہ ﷺ

کی صداقت پر دلیل تھا' آج بھی دلیل ہے' بلکہ اس کی ہر آیت آپ کی نبوت کی دلیل ہے اور متعدد وجوہ سے دلیل ہے' نہ اس کی کسی آیت کی کوئی مثل لاسکتا ہے اور جب کہ قرآن مجید میں چھ ہزار سے زیادہ آیات ہیں تو آپ کی نبوت پر چوبیس ہزار سے زیادہ دلائل ہیں اور ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء ورسل میں سے کسی نبی اور رسول کی نبوت اور رسالت پر اس قدر دلائل نہیں ہیں اور جب تک قرآن رہے گا' آپ کی نبوت پر یہ دلائل قائم رہیں گے۔

سرکار دوعالم ﷺ کے معجزات میں سب سے بڑا معجزہ قرآن کریم ہے اور یہ کہنا بڑا اعجاز ہے کہ تمام انبیائے کرام علیہم السلام کے معجزات ان کے ساتھ رخصت ہو گئے' لیکن آپ کی نبوت کا معجزہ قیامت تک قائم رہے گا۔

دوسرے انبیاء علیہم السلام کے ماننے والوں سے اگر کوئی پوچھے کہ تمہارے نبی (علیہ السلام) کی نبوت پر کیا دلیل ہے تو کوئی دلیل نہیں پیش کرسکتا اور اگر ہم سے پوچھے کہ تمہارے نبی کی نبوت پر کیا دلیل ہے تو ہم سرکار کی نبوت پر ایک دو نہیں' چوبیس ہزار سے زیادہ دلیلیں پیش کر سکتے ہیں۔ اس طرح اگر کسی دین کا پیروکار اپنے دین کے بارے میں شاکی ہو تو اس کو مطمئن کرنے کے لیے کوئی چیز نہیں ہے اور اگر خدانخواستہ کوئی مسلمان اپنے دین سے مشکوک ہو تو اس کو مطمئن کرنے کے لیے چوبیس ہزار سے زیادہ وجوہات ہیں۔ وللہ الحمد علی ذلک

(حضرت مولانا علامہ غلام رسول سعیدی دامت برکاتہم العالیہ' شرح صحیح مسلم شریف' ج ۲ ص ۵۶۸' فرید بک سٹال' اردو بازار' لاہور)

قرآن مجید پر عمل کرنے والے اور اس کی تعلیم دینے والے کی فضیلت

عن سالم عن ابیه عن النبی ﷺ قال لا حسد الا فی اثنین رجل اتاه الله القر'ان فهو یقوم اناء اللیل واناء النهار ورجل اتاه الله مالاً فهو ینفقه اناء اللیل واناء النهار.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: دو آدمیوں کے سوا اور کسی پر رشک نہیں کرنا چاہیے' ایک وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید عطا کیا اور وہ رات اور دن اس کی تلاوت کرتا ہو' دوسرا وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے مال عطا فرمایا ہو اور وہ رات اور دن اس مال کو (اللہ

تعالیٰ کی راہ میں) خرچ کرتا ہو۔

حافظ قرآن کی فضیلت

عن عائشة رضی الله تعالٰی عنها قالت قال رسول الله ﷺ الماهر بالقران مع السفرة الكرام البررة والذی یقرا القران ویتتعتع فیه وهو علیه شاق له اجران.

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص قرآن مجید میں ماہر ہو' وہ ان فرشتوں کے ساتھ رہتا ہے جو معزز اور بزرگ ہیں اور (نامۂ اعمال یا لوحِ محفوظ کو لکھتے ہیں) اور جس شخص کو قرآن مجید پڑھنے میں دشواری ہوتی ہے اور اٹک اٹک کر پڑھتا ہو' اُس کو دو اَجر ملتے ہیں۔

تشریح

اس حدیث شریف کی تشریح کرتے ہوئے شارح مسلم لکھتے ہیں:

پہلا مرتبہ اس مسلمان کا ہے' جو قرآن مجید کے حفظ' اس کی کثرت تلاوت اور اس کے معانی اور مطالب پر غور وخوض میں منہمک اور مستغرق رہتا ہے۔ جس کو یہ ملکہ اور مہارت حاصل ہوتی ہے کہ وہ قرآنی آیات کے مطالب اور معانی اور ان سے حاصل شدہ مسائل آسانی سے بیان کرسکتا ہے' اس شخص کو یہ عزت دی جاتی ہے کہ اس کو اُونچے درجہ کے فرشتوں کی رفاقت عطا کی جاتی ہے۔

دوسرا درجہ اُس مسلمان کا ہے جس کو مہارت کا یہ مرتبہ تو حاصل نہیں ہوتا' لیکن وہ قرآن کریم کی تلاوت میں کوشاں رہتا ہے اور باوجود استعداد اور صلاحیت کی کمی کے قرآن مجید سے رابطہ ٹوٹنے نہیں دیتا' اس وجہ سے دو اَجر ملتے ہیں۔

اور جو مسلمان قرآن مجید کی تلاوت کرے نہ اُس کے معنی پر غور وخوض کرے' اس کی بدبختی پر جس قدر افسوس کیا جائے' کم ہے۔

قرآن کریم کو یاد رکھنے کا حکم

حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

تعاهدوا القران فوالذی نفس محمد بیده لهو اشد تفلتا من الابل فی عقلها. (مسلم شریف' کتاب فضائل القرآن)

قرآن کریم کو یاد رکھو' قسم اُس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں محمد (ﷺ) کی جان ہے! قرآن مجید رسیاں تڑانے والے اونٹ کی نسبت زیادہ (سینوں سے) نکلنے والا ہے۔

خوش الحانی کے ساتھ قرآن مجید پڑھنے کا استحباب

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا:

اللہ تعالیٰ کسی کام پر اس قدر اجر نہیں دیتا' جتنا نبی کے خوش الحانی سے قرآن مجید پڑھنے پر اجر عطا فرماتا ہے۔ (صحیح مسلم' کتاب فضائل القرآن)

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جو مؤمن قرآن کریم پڑھتا ہے' اس کی مثال ترنج کی طرح ہے' جس کی خوشبو پسندیدہ اور ذائقہ خوش گوار ہے اور جو مؤمن قرآن مجید نہیں پڑھتا' وہ کھجور کی طرح ہے جس میں خوشبو نہیں لیکن ذائقہ میٹھا ہے اور جو منافق قرآن پڑھتا ہے' اُس کی مثال ریحان کی طرح ہے' جس کی خوشبو اچھی ہے اور ذائقہ کڑوا ہے اور منافق جو قرآن مجید نہیں پڑھتا' اس کی مثال اندرائن کی طرح ہے' اس میں خوشبو نہیں اور مزا کڑوا ہے''۔ (صحیح مسلم' کتاب فضائل القرآن)

نماز میں قرآن مجید پڑھنے اور اس کو سیکھنے کی فضیلت

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

''تم میں سے کسی شخص کو یہ پسند ہے کہ جب وہ گھر جائے تو وہاں تین حاملہ اونٹنیاں موجود ہوں' جو نہایت بڑی اور موٹی ہوں؟ ہم نے عرض کیا: یقیناً!

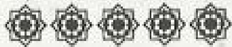
آپ ﷺ نے فرمایا: جن تین آیتوں کو تم میں سے کوئی شخص نماز میں پڑھتا ہے' وہ تین بڑی اور فربہ اونٹنیوں سے بہتر ہیں''۔ (صحیح مسلم)

یعنی فربہ اونٹنیوں کے صدقہ کی بہ نسبت قرآن مجید سیکھنے اور سکھانے کا ثواب زیادہ ہے۔

ایک اور حدیث میں اس طرح ہے: حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے' دراں حالیکہ ہم چبوترے پر (بیٹھے ہوئے) تھے آپ ﷺ

نے فرمایا:

تم میں سے کسی شخص کو یہ پسند ہے کہ وہ ہر روز صبح بطحان (مدینہ کی پتھریلی زمین) یا عقیق (ایک بازار) جائے اور وہاں سے بغیر کسی گناہ اور قطع رحمی کے دو بڑے بڑے کوہان والی اونٹنیاں لے آئے۔ ہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! ہم سب کو یہ بات پسند ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: پھر تم میں سے کوئی شخص صبح کو مسجد میں کیوں نہیں جاتا' تا کہ قرآن مجید کی دو آیتیں خود سیکھے یا کسی کو سکھائے۔ اور یہ (دو آیتوں کی تعلیم) دو اونٹنیوں (کے حصول) سے بہتر ہے اور تین' تین سے بہتر ہیں اور چار' چار سے۔ علیٰ ہذا القیاس آیات کی تعداد اونٹنیوں کی تعداد سے بہتر ہے۔ (صحیح مسلم' کتاب فضائل القرآن)



قواعدِ قرآنیہ

مغزِ قرآں رُوحِ ایماں جانِ دیں
ہست حُبِّ رحمۃ اللعالمین

قرآن مجید میں بعض جگہ ایک لفظ کئی معنوں کے لیے آتا ہے۔ ہر مقام پر لفظ کے وہی معنی کرنا چاہئیں، جو اس جگہ مناسب ہوں۔ اب ہم وہ قواعد بیان کرتے ہیں، جن سے معلوم ہو جائے کہ لفظ کے کون سے معنی کس جگہ مناسب و موزوں ہیں۔ ان قواعد کا بغور مطالعہ کرنے اور ان کا لحاظ رکھنے سے قرآن مجید کا طالب علم غلطی سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

نوٹ: طوالت کے خوف سے یہاں صرف قواعد کے بیان پر اکتفا کیا جائے گا' توضیح اور تفصیل کے لیے بطور مثال آیات کے حوالہ جات' سورت اور آیت کے نمبر کے ساتھ ذکر کر دیئے ہیں۔ طالب علم خود قرآن مجید سے نکال کر دیکھ لیں۔ واضح رہے کہ تقریباً ہر قاعدہ کی دو شقیں ہوں گی: الف اور ب۔ اسی ترتیب سے مثالوں میں آیات کے معانی کا لحاظ رکھا جائے۔

قاعدہ نمبر ۱

(الف) جب وحی کی نسبت نبی کی طرف ہو تو اس کا معنی ہوتا ہے بذریعہ فرشتہ یا بلا واسطہ فرشتہ اللہ تعالیٰ کا رسول (ﷺ) سے کلام فرمانا یعنی وحی الٰہی جو اصطلاحی عرفی معنی ہے۔

(ب) جب وحی کی نسبت غیر نبی کی طرف ہو تو اس کا معنی دل میں (بات) ڈالنا اور خیال پیدا کر دینا ہوگا۔

الف کی مثال ان آیات سے ہے:

(۱) النساء: ۱۶۳ (۲) ہود: ۳۶ (۳) النجم: ۱۰-۹' یہ اور ان جیسی متعدد آیات میں ''وحی'' سے مراد وحی الٰہی ہے' جو رسولوں کی طرف آتی ہے۔

''ب'' کی مثالیں یہ آیات ہیں:

(۱) النحل: ۶۸ (۲) الانعام: ۱۲۲ (۳) القصص: ۷

قاعدہ نمبر ۲

(الف) جب لفظ ''عبد'' کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس سے مراد مخلوق' عابد یا بندہ ہوتا ہے۔

(ب) اور جب ''عبد'' کی نسبت بندے کی طرف ہو تو اس کے معنی خادم' نوکر ہوں گے۔

الف کی مثال ان آیات میں ہے:

(۱) الاسراء: ۱ (۲) ص: ۴۱

ب کی مثال ان آیات میں ہے:

(۱) النور: ۳۲ (۲) الزمر: ۵۳

ان آیتوں میں چونکہ ''عبد'' کی نسبت بندوں کی طرف ہے' اس لیے اس کے معنی مخلوق نہ ہوں گے' بلکہ خادم' غلام ہوں گے' لہٰذا عبد النبی اور عبد الرسول کے معنی ہیں نبی پاک ﷺ کا خادم۔

قاعدہ نمبر ۳

(الف) جب لفظ رب کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس سے مراد حقیقی پالنے والا یعنی اللہ تعالیٰ۔

(ب) جب کسی بندے کو رب کہا جائے تو اس کے معنی ہوں گے' مربی' محسن' پرورش کرنے والا۔

الف کی مثال یہ آیات ہیں:

(۱) الفاتحہ: ۱ (۲) الدخان: ۸ (۳) الناس: ۱

ب کی مثال ان آیات میں ہے:

(۱) یوسف: ۵۰ (۲) یوسف: ۲۳

قاعدہ نمبر ۴

(الف) جب ضلال کی نسبت غیر نبی کی طرف ہو تو اس کے معنی گمراہ ہوتے ہیں۔

(ب) جب ضلال کی نسبت نبی کی طرف ہو تو اس کا معنی وارفتۂ محبت یا راہ سے ناواقف ہوں گے۔

الف کی مثال یہ آیات ہیں:

(۱)الاعراف:۱۸۶(۲)الفاتحہ:۷(۳)الکہف:۱۷

ب کی مثال ان آیات میں ہے:

(۱)والضحیٰ:۷(۲)یوسف:۹۵(۳)الشعراء:۲۰(۴)النجم:۲۰(۵)الاعراف:۶۱

قاعدہ نمبر ۵

(الف) ''مکر'' یا خداع کی نسبت جب اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس کے معنی دھوکا یا فریب نہ ہوں گے' کیونکہ یہ عیب ہیں بلکہ اس کے معنی ہوں گے: دھوکا کی سزا دینا یا خفیہ تدبیر کرنا۔

(ب) جب اس کی نسبت بندوں کی طرف ہو تو ''مکر'' کے معنی دھوکا' مکاری' دغابازی اور خداع کے معنی فریب ہوں گے۔

ان دونوں کی مثالیں یہ آیات ہیں:

(۱)النساء:۱۴۲(۲)البقرہ:۹(۳)آل عمران:۵۴

قاعدہ نمبر ۶

(الف) جب تقویٰ کی نسبت رب کی طرف ہو تو اس سے مراد ''ڈرنا'' ہوگا۔

(ب) جب تقویٰ کی نسبت اور اضافت آگ' کفر یا گناہ کی طرف ہو تو اس سے مراد ''بچنا'' ہوگا۔

ان دونوں کی مثالیں یہ ہیں:

(۱)البقرہ:۲۱(۲)البقرہ:۲۴

قاعدہ نمبر ۷

(الف) جب ''مِنْ دُوْنِ اللّٰہ'' عبادت کے ساتھ آئے تو اس کے معنی ہوں گے: ''اللہ کے سوا''۔

(ب) جب ''مِنْ دُوْنِ اللّٰہ'' مدد' نصرت' ولایت' دعا بمعنی پکارنا کے ساتھ آئے تو اس کے معنی ہوں گے اللہ کے مقابل یعنی اللہ کے سوا وہ لوگ جو اللہ کے مقابل ہیں۔

ان دونوں کی مثالیں یہ ہیں:

الف (۱)الانبیاء:۹۸(۲)الانبیاء:۱۱۷(۳)الجن:۱۸

(ب) (۱)البقرہ:۱۰۷(۲)الانبیاء:۴۳(۳)بنی اسرائیل:۲(۴)الزمر:۴۳

تائیدی آیات:(۱)الاحزاب:۱۷(۲)آل عمران:۱۶۰

قاعدہ نمبر ۸

(الف) جب ''ولی'' ''رب'' کے مقابل آئے تو اس سے مراد معبود یا مالک حقیقی ہے اور ایسا ولی اختیار کرنا شرک و کفر ہے۔

(ب) جب ''ولی'' ''رب'' کے مقابل نہ ہو تو اس سے مراد دوست' مددگار' قریب وغیرہ ہیں۔

الف کی مثالیں:

(۱)الکہف:۱۰۲(۲)العنکبوت:۴۱

ب کی مثالیں:

(۱)المائدہ:۵۵(۲)النساء:۷۵

قاعدہ نمبر ۹

(الف) جب دُعا کے بعد دشمنِ خدا کا ذکر ہو یا دُعا کا فاعل کافر ہو یا دعا پر رب تعالیٰ کی ناراضی کا اظہار ہو یا دُعا کرنے والے کو رب تعالیٰ نے کافر' مشرک' گمراہ فرمایا ہو تو دُعا سے مراد عبادت اور پوجنا وغیرہ ہوگا' نہ کہ محض پکارنا یا بلانا۔

(ب) جب دُعا کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ذکر ہو تو وہاں اس کے معنی پکارنا' پوجنا' دُعا مانگنا ہوگا۔ حسب موقع معنی کیے جائیں گے۔

الف کی مثالیں:

(۱)الاحقاف:۵(۲)الجن:۱۸(۳)المومن:۶۵

ب کی مثالیں:

(۱)الاعراف:۵۵(۲)البقرہ:۱۸۶

قاعدہ نمبر ۱۰

(الف) جب شرک کا مقابلہ ایمان سے ہوگا تو شرک سے مراد کفر ہوگا۔

(ب) جب شرک کا مقابلہ اعمال سے ہوگا تو شرک سے مراد مشرکوں ایسا کام ہوگا نہ کہ کفر۔

الف کی مثالیں:

(۱) البقرہ:۲۲۱ (۲) النساء:۱۱۶

ب کی مثالیں:

(۱) الروم:۳۱

قاعدہ نمبر (۱۱) مُردوں کا سننا

جب قرآن مجید میں مردے، اندھے، بہرے، گونگے، قبر والے کے ساتھ رجوع نہ کرنے، ہدایت نہ پانے اور نہ سُنانے وغیرہ کا ذکر ہوگا تو ان لفظوں سے مراد کافر ہوں گے یعنی دل کے مُردے، دل کے اندھے وغیرہ عام مُردے وغیرہ مراد نہ ہوں گے اور ان کے نہ سننے سے مُراد ان کا ہدایت نہ پانا ہوگا نہ کہ واقع میں نہ سننا۔ اور ان آیات کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ دل کے مُردے، اندھے، بہرے کافروں کو نہیں سُنا سکتے، جس سے وہ ہدایت پر آ جائیں۔ یہ مطلب نہ ہوگا کہ آپ مُردوں کو نہیں سُنا سکتے۔

مثالیں: (۱) البقرہ:۱۸ (۲) الروم:۵۲ (۳) بنی اسرائیل:۷۲

محولہ بالا آیات میں دیکھیں، جو قرآن مجید میں متعدد جگہ آئی ہیں، ان سب میں مُردوں، اندھوں، بہروں سے مراد کفار ہی ہیں نہ کہ ظاہری آنکھوں کے اندھے اور بے جان مردے۔

ان آیات کی تفسیر ان آیتوں سے ہو رہی ہے:

(۱) النمل:۸۰۔۸۱ (۲) حٰم السجدہ:۴۴ (۳) محمد:۲۳ (۴) الزخرف:۴۵

قاعدہ نمبر ۱۲

(الف) جب مومن کو ایمان کا حکم دیا جائے یا نبی کو تقویٰ کا حکم ہو تو اُس سے مراد ایمان اور تقویٰ پر قائم رہنا ہوگا، کیونکہ وہاں ایمان اور تقویٰ تو پہلے ہی موجود ہے اور حاصل شدہ کو حاصل کرنا چہ معنی دارد؟

مثالیں: (۱) النساء:۱۳۶ (۲) الاحزاب:۱ (۳) النساء:۱۷۱

قاعدہ نمبر ۱۳

(الف) جب "خلق" کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس سے مراد پیدا کرنا ہوگا یعنی نیست کو ہست کرنا۔

(ب) جب خلق کی نسبت بندے کی طرف ہو تو اس سے مراد ہوگا: بنانا، گھڑنا۔

الف کی مثالیں:

(۱) الملک:۲ (۲) البقرہ:۲۱

ب کی مثالیں:

(۱) آل عمران:۴۹ (۲) العنکبوت:۱۷ (۳) المؤمنون:۱۴

قاعدہ نمبر ۱۴

(الف) حکم، گواہی، وکالت، حساب لینا، مالک ہونا۔ ان اُمور کو جہاں قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص کیا گیا ہے۔ وہاں حقیقی، دائمی، مستقل مراد ہوگا، مثلاً جب کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز کا مالک ہے یا اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو وکیل نہ بناؤ تو اس سے مراد حقیقی دائمی مالک اور مستقل وکیل ہے۔

(ب) جب ان اُمور کی نسبت بندوں کی طرف کی جائے تو ان سے مراد عارضی، عطائی اور مجازی مالک وغیرہ ہوں گے۔

الف کی مثالیں:

(۱) الانعام:۵۷ (۲) النساء:۱۲۶ (۳) بنی اسرائیل:۶۵۔۵۴۔۲ (۴) الانعام:۱۰۸ (۵) الاحزاب:۳۹ (۶) الحشر:۱ (۷) المزمل:۹

ب کی مثال ان آیات میں ہے:

(۱) النساء:۳۵ (۲) النساء:۶۵ (۳) البقرہ:۱۸۸ (۴) بنی اسرائیل:۱۴ (۵) النساء:۲۴ (۶) البقرہ:۲۸۲ (۷) المائدہ:۱۰۶

ان جیسی آیتوں میں عارضی، غیر مستقل، عطائی ملکیت، گواہی، وکالت، حکومت، حساب لینا بندوں کے لیے ثابت کیا گیا ہے، یعنی اللہ کے بندے مجازی طور پر حاکم و وکیل ہیں، گواہ ہیں۔ لہٰذا ان آیات میں تعارض نہیں، جیسے "سمیع، بصیر، حی" وغیرہ اللہ تعالیٰ کی صفتیں ہیں۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے: "اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ" "اللہ تعالیٰ ہی سننے والا دیکھنے والا ہے" اور بندوں کی بھی یہ صفتیں ہیں۔ فرماتا ہے: "فَجَعَلْنٰهُ سَمِیْعًۢا بَصِیْرًا" "ہم نے انسان کو سننے والا، دیکھنے والا بنا دیا۔ اللہ کا سننا، دیکھنا دائمی، غیر محدود، مستقل، ذاتی ہے اور بندوں کا دیکھنا، سننا، زندہ ہونا، عارضی، محدود، عطائی، غیر مستقل ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ کا نام بھی "علی" ہے۔ "وَهُوَ الْعَلِیُّ"

الْعَظِیْمُ'' اور حضرت علی مرتضیٰ کا نام بھی ''علی'' ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے: ''مولٰینا''۔ ''انت مولٰنا'' اور عالموں کو بھی ''مولنا'' صاحب کہا جاتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کا ''علی'' یا ''مولیٰ'' ہونا اور طرح کا ہے اور بندوں کا علی اور مولا ہونا کچھ اور قسم کا' یہ فرق ضروری ہے۔

قاعدہ نمبر ۱۵

(الف) جہاں علم غیب کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص کیا جائے یا اس کی بندوں سے نفی کی جائے تو اس علم غیب سے ذاتی' دائمی' جمیع علوم غیبیہ' قدیمی مراد ہوگا۔

(ب) جہاں علم غیب بندوں کے لیے ثابت کیا جائے یا کسی نبی کا قول قرآن مجید میں نقل کیا جائے کہ فلاں رسول (علیہ السلام) نے فرمایا کہ میں غیب جانتا ہوں۔ وہاں مجازی' حادث' عطائی علم غیب مراد ہوگا' جیسا کہ قاعدہ نمبر ۱۴ میں دیگر صفات کے بارے میں بیان کر دیا گیا ہے۔

الف کی مثالیں:

(۱) النمل:۶۵ (۲) الانعام:۵۹ (۳) لقمان:۳۴ (۴) الاعراف:۱۸۸

ب کی مثالیں:

(۱) البقرہ:۳۔۲ (۲) الجن:۲۶ (۳) النساء:۱۱۳ (۴) الاعراف:۱۶۲ (۵) آل عمران:۴۹ (۶) یوسف:۳۷ (۷) التکویر:۲۴

قاعدہ نمبر ۱۶

(الف) جن آیاتِ قرآنیہ میں شفاعت کی نفی ہے' وہاں یا تو دھونس کی شفاعت مراد ہے یا کفار کے لیے شفاعت یا بتوں کی شفاعت مراد ہے' یعنی اللہ تعالیٰ کے سامنے جبراً شفاعت کوئی نہیں کر سکتا یا کافروں کی شفاعت نہیں یا بُت شفیع نہیں۔

(ب) جہاں قرآن مجید میں شفاعت کا ثبوت ہے' وہاں اللہ کے پیاروں کی ایمان والوں کے لیے محبت والی شفاعت بالاذن مراد ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے پیارے بندے مؤمنوں کو اللہ تعالیٰ کی اجازت سے محبوبیت کی بناء پر بخشوائیں گے۔

الف کی مثالیں:

(۱) البقرہ:۲۵۴ (۲) البقرہ:۱۲۳ (۳) المدثر:۴۸ (۴) الزمر:۴۳ (۵) الغافر:۱۸

(۶) المومن:۱۸ (۷) الزخرف:۸۶

ب کی مثالیں:

(۱) التوبہ:۱۰۳ (۲) البقرہ:۲۵۵ (۳) مریم:۸۷ (۴) طٰہٰ:۱۰۹

قاعدہ نمبر ۱۷

(الف) جب غیر خدا کو پکارنے سے منع فرمایا جائے یا پکارنے والوں کی بُرائی بیان ہو تو اس پکارنے سے مراد معبود سمجھ کر پکارنا ہے یعنی پوجنا۔

(ب) جہاں غیر خدا کو پکارنے کا حکم ہے یا اس پکارنے پر ناراضی کا اظہار نہ ہو' تو اس سے مراد بلانا یا پکارنا ہی ہوگا۔

الف کی مثال یہ ہے:

(۱) الاحقاف:۵ (۲) الجن:۱۸

ب کی مثال اس آیت میں ہے:

(۱) یونس:۳۸

قاعدہ نمبر ۱۸

(الف) جب غیر خدا کو ''ولی'' بنانے سے منع کیا جائے یا ''ولی'' ماننے پر ناراضگی اور عتاب ہو یا ایسے کو مشرک کافر کہا جائے تو ولی سے مراد معبود یا رب کے مقابل مددگار ہوگا۔ یا آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ قیامت میں کافروں کا مددگار کوئی نہیں۔

(ب) جب غیر خدا کو ولی بنانے کا حکم دیا جائے یا اس پر ناراضگی کا اظہار نہ ہو تو ولی سے مراد دوست' مددگار' باذن اللہ یا قریب ہوگا۔

الف کی مثالیں:

(۱) الشوریٰ:۸ (۲) البقرہ:۱۰۷

ب کی مثالیں:

(۱) المائدہ:۵۵ (۲) النساء:۷۵

قاعدہ نمبر ۱۹

(الف) جہاں وسیلہ کا انکار ہے' وہاں بتوں کا وسیلہ یا کفار کے لیے وسیلہ مراد ہے یا وہ وسیلہ

مراد ہے جس کی پوجا پاٹ کی جائے۔

(ب) جہاں وسیلہ کا ثبوت ہے، وہاں رب کے پیاروں کا وسیلہ یا مؤمنوں کے لیے وسیلہ مراد ہے تاکہ آیاتِ قرآنیہ میں تعارض اور ٹکراؤ واقع نہ ہو۔

الف کی مثال: (۱) الزمر: ۳

ب کی مثالیں:

(۱) المائدہ: ۳۵ (۲) النساء: ۶۴ (۳) آل عمران: ۱۶۴ (۴) السجدہ: ۱۱

قاعدہ نمبر ۲۰

(الف) قرآن مجید کی جن آیات میں فرمایا گیا ہے کہ انسان کو صرف اپنے عمل ہی کام آئیں گے یا فرمایا گیا ہے کہ ”نہیں ہے انسان کے لیے مگر وہ جو خود کرے“۔ اس سے مراد بدنی فرض عبادتیں ہیں یا یہ مطلب ہے کہ قابل اعتماد اپنے اعمال ہیں، کسی کے بھیجنے کا یقین نہیں۔

(ب) جن آیات میں فرمایا گیا ہے کہ دوسروں کی نیکی اپنے کام آتی ہے، اس سے مراد اعمال کا ثواب ہے یا مصیبت دُور ہونا یا درجے بلند ہونا۔

الف کی مثالیں:

(۱) النجم: ۳۹ (۲) البقرہ: ۲۸۶

ب کی مثالیں:

(۱) الکہف: ۸۲ (۲) الطور: ۲۱

قاعدہ نمبر ۲۱

(الف) جن آیتوں میں فرمایا گیا ہے کہ قیامت میں کوئی کسی کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا۔ اس کا مطلب ہے کہ بہ خوشی نہ اُٹھائے گا یا اس طرح نہ اُٹھائے گا، جس سے مجرم آزاد ہو جائے گا۔

(ب) جن آیات میں فرمایا گیا ہے کہ قیامت میں بعض لوگ بعض کا بوجھ اُٹھائیں گے، اس کا مطلب یہ ہے کہ مجبوراً اُٹھائیں گے یا یہ بھی اُٹھائیں گے اور مجرم بھی، یہ تو اُٹھائیں گے گناہ کرانے کی وجہ سے اور مجرم بوجھ اُٹھائے گا گناہ کرنے کی وجہ سے۔

الف کی مثالیں:

(۱) الانعام: ۱۶۵ (۲) بنی اسرائیل: ۱۵۔۷ (۳) العنکبوت: ۱۲ (۴) البقرہ: ۱۳۴

ب کی مثالیں:

(۱) العنکبوت: ۱۳ (۲) التحریم: ۶ (۳) الانفال: ۲۵

قاعدہ نمبر ۲۲

(الف) قرآن مجید کی جن آیات میں ہے کہ رسولوں میں فرق نہ کرو، وہاں ایمان میں فرق کرنا مراد ہے یعنی ایسے فرق نہ کرو کہ بعض کو مانو اور بعض کو نہ مانو، یا مراد یہ ہے کہ اپنی طرف سے فرق پیدا نہ کرو یعنی ان کے فضائل اپنی طرف سے نہ گھٹاؤ یا ایسا فرق نہ کرو جس سے بعض پیغمبروں کی توہین ہو جائے۔

(ب) اور جن آیاتِ قرآنیہ میں فرمایا گیا ہے کہ رسولوں میں فرق ہے، وہاں درجات اور مراتب کا فرق مراد ہے، یعنی بعضوں کے درجے بعض سے اعلیٰ ہیں۔

الف کی یہ مثالیں ہیں:

(۱) البقرہ: ۲۸۵ (۲) النساء: ۱۵۲

ان آیتوں میں ایمان کا فرق مُراد ہے یعنی بعض رسولوں کو ماننا اور بعض کو نہ ماننا یہ کفر ہے۔ ایمان کے لیے سب نبیوں کو ماننا ضروری ہے۔

ب کی یہ مثالیں ہیں:

(۱) البقرہ: ۲۵۳ (۲) الاحزاب: ۴۶۔۴۵ (۳) الانبیاء: ۱۰۷

قاعدہ نمبر ۲۳

(الف) قرآن شریف میں جہاں حضور ﷺ سے کہلوایا گیا ہے کہ ”مجھے خبر نہیں کہ میرے اور تمہارے ساتھ کیا ہوگا“ وہاں اٹکل، حساب، قیاس اندازے سے جاننا مراد ہے یعنی میں اندازے یا قیاس سے یہ نہیں جانتا۔

(ب) اور جہاں اس کے خلاف ہے، وہاں وحی، الہام کے ذریعے سے علم دینا مراد ہے۔

الف کی مثالیں:

(۱) الاحقاف: ۹ (۲) الشوریٰ: ۵۲ (۳) مریم: ۳۰

ب کی مثالیں:

(۱) الفتح: ۲ (۲) الکوثر: ۱ (۳) الم نشرح: ۴

قاعدہ نمبر ۲۴

(الف) جن آیتوں میں فرمایا گیا ہے کہ نبی ہدایت نہیں کرتے، وہاں مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف اس کے مقابل ہدایت نہیں کرتے کہ رب کسی کو (اس کی بدعملیوں کی وجہ سے) گمراہی و ضلالت میں بے یارومددگار چھوڑ دینا چاہے اور نبی ہدایت کردیں، یہ ناممکن ہے۔

(ب) اور جہاں فرمایا ہے کہ ہدایت کرتے ہیں، وہاں مراد ہے باذن الٰہی ہدایت کرتے ہیں۔

الف کی مثالیں:

(۱) القصص: ۵۶ (۲) الانعام: ۳۵ (۳) البقرہ: ۲۷۲

ب کی مثالیں:

(۱) الشوریٰ: ۵۲ (۲) بنی اسرائیل: ۹ (۳) آل عمران: ۱۶۴ (۴) البقرہ: ۱۸۵

قاعدہ نمبر ۲۵

(الف) جن آیات میں فرمایا گیا ہے کہ غیر خدا کے نام پر پکارا ہوا جانور حرام ہے۔ وہاں ذبح کے وقت کسی کا نام پکارنا مراد ہے۔

(ب) اور جن آیتوں میں فرمایا گیا ہے کہ غیر خدا کے نام پر پکارا ہوا جانور حرام نہیں ہے، حلال ہے۔ ان میں زندگی کی حالت میں کسی کا نام پکارنا مراد ہے، جیسے بتوں کے نام پر چھوڑا ہوا جانور یا زید کا بکرا، عبدالرحیم کی گائے وغیرہ۔

الف کی مثالیں:

(۱) البقرہ: ۱۷۳ (۲) الانعام: ۱۲۰ (۳) المائدہ: ۳

ب کی مثال یہ ہے: (۱) المائدہ: ۱۰۳

قاعدہ نمبر ۲۶

(الف) جہاں نبی کریم ﷺ سے کہلوایا گیا ہے کہ ''میں اپنے اور تمہارے نفع کا مالک نہیں

ہوں''۔ وہاں اللہ تعالیٰ کے بغیر مرضی ملکیت مراد ہے۔

(ب) جہاں فرمایا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ غنی کر دیتے ہیں، وہاں بہ عطائے الٰہی اللہ کے ارادے سے غنی کرنا اور دینا اور عطا کرنا مراد ہے۔

الف کی مثالیں:

(۱) الاعراف: ۱۸۸ (۲) یوسف: ۶۷-۶۸

ب کی مثالیں:

(۱) التوبہ: ۷۴ (۲) التوبہ: ۵۹ (۳) الاحزاب: ۳۷

قاعدہ نمبر ۲۷

(الف) جب ''رفع'' کا مفعول کوئی زمینی جسم ہو تو ''رفع'' کے معنی ہوں گے: اونچی جگہ میں اُٹھانا، چڑھانا، اُونچا کرنا۔

(ب) جب ''رفع'' کا مفعول کوئی زمینی جسم نہ ہو تو اس کے معنی ہوں گے: روحانی بلندی، مرتبہ کا اُونچا ہونا۔

الف کی مثالیں:

(۱) آل عمران: ۵۵ (۲) یوسف: ۱۰۰ (۳) النساء: ۱۵۴

ب کی مثالیں:

(۱) البقرہ: ۲۵۳ (۲) النور: ۳۶

قاعدہ نمبر ۲۸

(الف) جن آیتوں میں نبی سے کہلوایا گیا ہے کہ ہم تم جیسے ''بشر'' ہیں۔ وہاں مطلب یہ ہے کہ خالص بندے ہونے میں تم جیسے بشر ہیں کہ جیسے تم نہ خدا ہو نہ خدا کے بیٹے، نہ خدا کے ساجھی شریک، ایسے ہی ہم نہ خدا ہیں، نہ اُس کے بیٹے، نہ اُس کے ساجھی، خالص بندے ہیں۔

(ب) اور جن آیتوں میں نبی کو بشر کہنے پر کفر کا فتویٰ صادر کیا گیا ہے۔ اور انہیں ''بشر'' کہنے والوں کو کافر کہا گیا ہے۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ جو نبی کی ہمسری اور برابری کا دعویٰ کرتے ہوئے انہیں بشر کہے یا ان کی اہانت کرنے کے لیے بشر کہے یا یوں کہے کہ

جیسے ہم محض بشر ہیں' نبی نہیں' ایسے ہی تم نبوت سے خالی ہو محض بشر ہو وہ کافر ہے۔

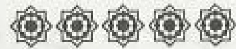
الف کی مثالیں:

(۱) الکہف:۱۱۰ (۲) ابراہیم:۱۱ (۳) النور:۳۵

ب کی مثالیں:

(۱) التغابن:۶ (۲) الحجر:۳۳ (۳) المؤمنون:۴۷ ـ ۳۴ ـ ۲۴

نوٹ: حضور نبی کریم ﷺ کا بارہا اپنی بندگی اور بشریت کا اعلان کرنا اس لیے تھا کہ عیسائیوں نے حضرت عیسٰی علیہ السلام میں دو معجزے دیکھ کرانہیں خدا کا بیٹا کہہ دیا' ایک تو ان کا بغیر باپ پیدا ہونا اور دوسرا مُردے زندہ کرنا۔ مسلمانوں نے صدہا معجزے حضور ﷺ کے دیکھے' چاند شق ہوا' سورج اُلٹے پھرتے دیکھا' انگلیوں سے پانی کے چشمے بہتے دیکھے۔ اندیشہ تھا کہ وہ بھی حضور ﷺ کو خدا یا خدا کا بیٹا کہہ دیں۔ اس احتیاط کے لیے بار بار اپنی بشریت کا اعلان فرمایا۔ (ملخص علم القرآن' حکیم الامت حضرت مفتی احمد یار خان نعیمی قدس سرہ العزیز)



قرآن مجید کے تراجم کا تقابلی جائزہ

قرآن کریم کا ترجمہ کرنے کے لیے صرف لغت کا جاننا کافی نہیں' ورنہ صلوٰۃ کا لفظی ترجمہ سرین ہلانا کیا جائے' زکوٰۃ کا ترجمہ پاکیزگی اور حج اور تیمم کا ترجمہ ارادہ کے ساتھ کیا جائے' بلکہ ترجمہ کے لیے تمام تفاسیرِ معتبرہ' احادیث شریفہ اور فقہی مسائل پر نظر ہونا ضروری ہے۔ غرض یہ کہ جب تک تمام اسلامی علوم پر کسی شخص کو عبور نہ ہو تو اُس وقت تک وہ قرآن کریم کا صحیح ترجمہ نہیں کرسکتا۔

اس وقت قرآن مجید کے یوں تو کئی مترجمین کے کیے ہوئے اُردو تراجم مارکیٹ میں دستیاب ہیں' لیکن قرآن پاک کا صحیح اور سب سے زیادہ مقبول ترجمہ جس کی زبان کوثر و تسنیم سے دھلی ہوئی ہو' جو مسلک اہل سنت و جماعت اور سلف صالحین کا سچا ترجمان اور بارگاہِ الوہیت کے تقدس اور احترامِ نبوت کا کما حقہ پاسدار ہو' وہ ''کنز الایمان'' شریف ہے' جو مجدد ملّت محدثِ ہند حضرت امام احمد رضا خان بریلوی قدس سرہٗ کے قلم کا شاہکار ہے' جس پر تفسیری حواشی خزائن العرفان اور نور العرفان کے نام سے بالترتیب صدر الافاضل سیّد محمد نعیم الدین مراد آبادی قدس سرہٗ اور حکیم الامت مفتی احمد یار خان نعیمی قدس سرہٗ کے تبحر علمی کا ٹھاٹھیں مارتا وہ سمندر ہے' جس کی نظیر نہیں' اسی طرح غزالی زماں حضرت علامہ سیّد احمد سعید کاظمی قدس سرہٗ العزیز کا ترجمہ قرآن ''البیان'' ہے' امام احمد رضا خان قدس سرہٗ کا ترجمہ اور تحریک آزادی کے عظیم مجاہد صدر الافاضل قدس سرہٗ کے تفسیری حواشی سلف صالحین کی تفاسیر کے عین مطابق ہیں۔ کسی جگہ تفسیر بالرائے سے کام نہیں لیا گیا۔ اپنے اس دعویٰ کے ثبوت میں مروجہ تراجم کا تقابلی جائزہ پیش کرتے ہیں۔ فیصلہ ناظرین کرام پر چھوڑ دیتے ہیں۔

''يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ إِنِ اسْتَطَعْتُمْ أَنْ تَنْفُذُوا مِنْ أَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ فَانْفُذُوا لَا تَنْفُذُونَ إِلَّا بِسُلْطٰنٍ'' (الرحمٰن:۳۳)۔

اشرف علی تھانوی صاحب' اس آیت کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:

''اے گروہ جن اور انسان! اگر تم کو یہ قدرت ہے کہ آسمان اور زمین کی حدود سے کہیں

باہر نکل جاؤ تو (ہم بھی دیکھیں) نکلو' مگر بدوں زور کے نہیں نکل سکتے (اور زور ہے نہیں پس نکلنے کا وقوع بھی محتمل نہیں)''۔

تھانوی صاحب کے اس ترجمہ سے یہ تاثر ملتا ہے کہ انسان کرۂ ارض سے باہر نہیں نکل سکتا۔ حالانکہ اب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ انسان کرۂ ارض سے باہر نکل کر چاند پر جا پہنچا ہے۔ اس قسم کے ترجموں سے نئی نسل کے ذہنوں میں اسلام کے خلاف شکوک وشبہات پیدا ہوتے ہیں۔ کیونکہ اُنہوں نے قرآن مجید کو ترجمہ کی مدد سے سمجھنا ہے اور جب سائنسی مشاہدات کے خلاف ان کو ترجمہ نظر آئے گا تو قرآن پر ان کا ایمان اور ایقان ڈگمگانے لگے گا۔

امام احمد رضا خان نے اس آیت مبارک کا جو ترجمہ کیا ہے' وہ ہر قسم کے شکوک وشبہات سے صاف ہے' اس کو پڑھ کر قرآن کریم پر ایمان تازہ ہوتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ سائنس نے کائنات کے جن سربستہ رازوں سے اب پردہ اُٹھایا ہے' قرآن حکیم نے چودہ سو سال پہلے ان کی طرف اشارہ کر دیا تھا۔ اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ اس آیت کے ترجمہ میں تحریر فرماتے ہیں:

اے جن وانس کے گروہ! اگر تم سے ہو سکے کہ آسمانوں اور زمین کے کناروں سے نکل جاؤ تو نکل جاؤ' جہاں نکل کر جاؤ گے' اُسی کی سلطنت ہے۔

''امام احمد رضا خاں کے ترجمہ کا مفاد یہ ہے کہ انسان زمین کے کناروں سے تو باہر نکل سکتا ہے' لیکن اللہ تعالیٰ کی سلطنت سے باہر نہیں نکل سکتا۔ پس انسان چاند چھوڑ کر مریخ پر بھی جا پہنچے تو اس ترجمہ کی روشنی میں قرآن کا خلاف لازم نہیں آتا۔

ایک اور آیت مبارکہ کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

''قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ'' (الکہف:۱۱۰) (ترجمہ:) ''(اے حبیب! کافروں سے) فرما دیجئے میں (الوہیت کا مدعی نہیں بلکہ معبود نہ ہونے میں) تم جیسا ہی بشر ہوں''۔

حضور ﷺ کی بشریت بھی ان معرکۃ الآراء مسائل میں سے ہے' جن میں اہل سنت و جماعت اور مبتدعین کے درمیان عموماً مباحثہ ہوتا رہتا ہے۔ اہل سنت و جماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ حضور ﷺ اگرچہ صورۃً بشر ہیں' لیکن آپ کی حقیقت عقلِ انسانی سے ماوراء ہے اور ہرچند کہ آپ بشریت میں بہ ظاہر ہماری مثل ہیں' لیکن فضائل ومحاسن میں کوئی بھی آپ کا ہمسر نہیں' اس سبب سے اہل سنت کے نزدیک آپ کو محض بشر کہنا بے ادبی ہے۔ چنانچہ آپ کو

سید البشر یا افضل البشر کہنا چاہیے۔ اس کے برعکس مبتدعین آپ کی ذات پر محض بشریت کا اطلاق کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے۔ اس تمہید کے بعد آیئے مذکورہ بالا آیت مبارکہ کے تراجم پر ایک نظر ڈالیں۔

مولوی اشرف علی تھانوی صاحب: اور آپ یوں بھی کہہ دیجئے کہ میں تو تم ہی جیسا بشر ہوں۔

مولوی محمود حسن دیوبندی: تو کہہ میں بھی ایک آدمی ہوں جیسے تم۔

مولوی وحید الزمان (غیر مقلد وہابی): کہہ دے میں اور کچھ بھی نہیں تمہاری طرح ایک آدمی ہوں۔

امام احمد رضا خان بریلوی: تم فرماؤ ظاہری صورتِ بشری میں تو میں تم جیسا ہی ہوں۔

تمام مشہور اُردو تراجم میں حضور ﷺ کے لیے مطلقاً بشریت اور مماثلت بیان کی گئی ہے۔ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے دو قیدیں لگائی ہیں' ایک صورت کی اور دوسری ظاہری کی۔ صورت کی قید لگا کر یہ ظاہر فرمایا کہ حضور (ﷺ) صرف صورۃً بشر ہیں اور حقیقتاً کیا ہیں؟ یہ آپ کا رب ہی جانتا ہے' جیسا کہ مشہور حدیث میں ہے:

''یا ابا بکر لم یعرفنی حقیقةً غیر ربی'' اے ابوبکر! میری حقیقت کو ماسوا میرے رب کے اور کوئی نہیں جانتا۔

اور ظاہری کی قید لگا کر یہ ظاہر فرمایا کہ صورت میں بھی میری بشریت کی تمہاری بشریت سے مماثلت محض ظاہری ہے' حقیقتاً نہیں ہے یعنی تمہاری بھی دو آنکھیں ہیں اور میری بھی دو آنکھیں ہیں' لیکن تم ان آنکھوں سے صرف سامنے دیکھتے ہو اور میری آنکھوں سے آگے کی کوئی چیز مخفی ہے نہ پیچھے کی' دائیں کی کوئی چیز پوشیدہ ہے نہ بائیں کی' تم دیوار کے پار نہیں دیکھ سکتے اور میں جب کسی چیز کو دیکھنا چاہوں تو میری نظر کے لیے سات آسمان بھی حجاب نہیں ہو سکتے اور تم نے تو اپنی آنکھوں سے پوری مخلوق کو بھی نہیں دیکھا اور میں نے اپنی آنکھوں سے جمالِ الوہیت کو بھی بے حجاب دیکھا ہے' اسی طرح کان تمہارے بھی دو ہیں اور میرے بھی دو' لیکن تم اپنے کانوں سے صرف قریب کی آواز سنتے ہو اور میں اپنے کانوں سے دور ونزدیک کی آوازیں یکساں سنتا ہوں اور تم نے تو اپنے کانوں سے پوری مخلوق کی باتوں کو بھی نہیں سُنا اور

میں نے اپنے کانوں سے رب کائنات کا کلام سنا ہے‘ پھر مماثلت کیسی؟ اسی لیے فرمایا:

میں وہ حقائق دیکھتا ہوں‘ جنہیں تم نہیں دیکھ سکتے اور میں وہ باتیں سنتا ہوں‘ جنہیں تم سن نہیں سکتے۔

اور ایک حدیث میں صاف طور پر فرمایا:

”لَسْتُ كَاَحَدٍ مِنْكُمْ“ تم میں کوئی شخص میرا مماثل نہیں۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان قدس سرہٗ العزیز ان تمام احادیث اور حقائق و معارف پر نظر رکھتے تھے۔ اسی لیے اس آیت کے ترجمہ میں فرمایا:

تم فرماؤ ظاہری صورتِ بشری میں تم جیسا ہی ہوں۔

یعنی جو مماثلت ہے‘ وہ صرف صورت میں ہے اور اس میں بھی یہ ظاہر ہے حقیقتاً نہ کوئی آپ کی ذات میں مماثل ہے نہ صفات میں اور جن مترجمین کی ان چیزوں پر نظر نہ تھی‘ اُنہوں نے ان تمام حقائق سے آنکھیں بند کر کے مطلقاً یہ ترجمہ کر دیا:

میں تم جیسا بشر ہوں۔

”وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ O“ (الانبیاء:۱۰۷) ”اور (اے محبوب!) ہم نے تمہیں نہیں بھیجا مگر تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر O“

جن آیات میں حضور سید عالم ﷺ کی عظمت اور شان نمایاں طور پر بیان کی گئی ہے‘ یہ ان آیاتِ کریمہ میں سے ایک آیت ہے۔ مومن صادق اور سچے امتی کے لیے اس سے بڑھ کر کیا مسرت ہوگی کہ اس کے نبی کی شان اور عظمت بیان کی جائے‘ لیکن غور کیجئے دیوبندی علماء نے اس آیت کا ترجمہ کرتے ہوئے حضور ﷺ کے فضل و کمال کو کس طرح کم کرنے کی کوشش کی ہے۔

علامہ اشرف علی تھانوی صاحب: آپ کو اور کسی بات کے لیے نہیں بھیجا مگر دنیا جہان کے لوگوں (یعنی مکلفین) پر مہربانی کرنے کے لیے۔

علامہ محمود الحسن دیوبندی: اور تجھ کو ہم نے بھیجا سو مہربانی کر جہاں کے لوگوں پر۔

ابوالاعلیٰ مودودی صاحب: اے محمد! ہم نے جو تمہیں بھیجا ہے تو یہ دراصل دنیا والوں کے حق میں ہماری رحمت ہے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں بریلوی قدس سرہٗ العزیز: اور ہم نے تمہیں نہ بھیجا مگر رحمت سارے جہانوں کے لیے۔

حضرت صدر الافاضل سید محمد نعیم الدین مرادآبادی قدس سرہٗ العزیز نے حاشیہ پر اس کی تفسیر میں لکھا:

آیت کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر رحمتِ مطلقہ تامہ کاملہ عامہ شاملہ جامعہ محیط بر جمیع مقیدات رحمت غیبیہ و شہادت علمیہ و عینیہ و وجودیہ و شہودیہ و سابقہ و لاحقہ وغیرہ ذالک۔ تمام جہانوں کے لیے عالم اَرواح ہو یا عالم اجسام ذوی العقول ہوں یا غیر ذوی العقول۔

غور فرمایئے! یہ کیا سبب ہے کہ مودودی صاحب‘ حضور ﷺ کو سرے سے رحمت مانتے ہی نہیں اور تھانوی صاحب اور محمود حسن صاحب دیوبندی‘ حضور ﷺ کی رحمت کا دائرہ تنگ کر کے صرف دنیا کے مکلفوں تک محدود رکھتے ہیں۔ اس کے برخلاف اعلیٰ حضرت اور حضرت صدر الافاضل حضور ﷺ کی رحمت کا عموم‘ شمول اور اطلاق بیان کرتے ہیں۔ جہاں اللہ تعالیٰ حضور نبی کریم وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم کے فضل و کمال کو علی العموم بیان کرتا ہے‘ وہاں یہ دیوبندی حضرات کیوں تقیید کرتے ہیں اور اعلیٰ حضرت اور صدر الافاضل کیوں ایسے مواقع پر حضور سید العالمین ﷺ کے کمالات بڑھ چڑھ کر بیان کرتے ہیں۔ آخر اس فرق کا سبب کیا ہے؟ آپ خود ہی سوچ لیں۔ ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی۔

امام اہل سنت غزالی زمان سید احمد سعید کاظمی شاہ صاحب کے شاہکار ترجمۂ قرآن ”البیان“ سے ایک مثال ملاحظہ فرمایئے‘ لکھتے ہیں:

بعض مترجمین نے آیت کریمہ ”وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا“ (التحریم:۱۲) کا انتہائی شرم ناک الفاظ میں حسب ذیل ترجمہ کیا: اور مریم بیٹی عمران کی جس نے روکے رکھا اپنی شہوت کی جگہ کو‘ پھر ہم نے پھونک دی اس میں اپنی طرف سے جان۔ (ترجمہ مولانا محمود الحسن دیوبندی)

حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں: یہ غلط ہے کہ حضرت مریم کی شہوت کی جگہ میں جان

پھونکی گئی‘ کیونکہ یہ بات نہایت شرم ناک اور حضرت مریم کی عزت وعظمت کے قطعاً خلاف ہے۔ حضرت جبریل نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت مریم کے چاک گریبان میں جان پھونکی۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۳۹۴) ہم نے اپنے ترجمہ میں شرم وحیا اور حضرت مریم کی عزت و عظمت کو ملحوظ رکھتے ہوئے جمہور مفسرین کے مطابق ''صنعتِ استخدام'' سے کام لیا ہے۔

ناظرین کرام سے مخفی نہ رہے کہ صنعتِ استخدام یہ ہے کہ ایک لفظ کے دو معنی ہوں‘ ایک معنی اُس لفظ سے مراد لیے جائیں اور دوسرے معنی اُس ضمیر سے مراد لیے جائیں‘ جو اس کی طرف راجع ہے‘ جس کی مثال جریر کا یہ مشہور شعر ہے۔

اِذَا نَزَلَ السَّمَآءُ بِاَرْضِ قَوْمٍ   رَعَيْنَاهُ وَاِنْ كَانُوْا غِضَابًا

یعنی'' جب کسی قوم کی زمین میں بارش ہو تو ہم اس سے پیدا ہونے والے سبزہ کو چرا لیتے ہیں‘ اگرچہ وہ لوگ غضب ناک ہی کیوں نہ ہوں''

لفظ ''سَمَآءٌ'' کے دو مجازی معنی ہیں‘ ایک بارش‘ دوسرا بارش سے پیدا ہونے والا سبزہ۔ شاعر نے لفظ ''سَمَآءٌ'' سے بارش مراد لی۔ اور ''رعیناہ'' میں اس کی طرف راجع ہونے والی ضمیر منصوب سے بارش سے پیدا ہونے والا سبزہ مراد لیا۔ یہ صنعتِ استخدام ہے۔ اس کے مطابق ہم نے لفظ ''فرج'' سے اس کے مجازی معنی عفت مراد لیے اور ''فیہ'' میں اس کی طرف راجع ہونے والی ضمیر مجرور سے لفظ ''فرج'' کے دوسرے مجازی معنی چاک گریبان مراد لیے اور اجلّہ مفسرین کے مطابق حسبِ ذیل ترجمہ کیا: اور عمران کی بیٹی مریم (کی مثال بھی) جس نے اپنی عفت کی (ہر طرح) حفاظت کی تو ہم نے (بواسطہ جبریل اس کے) چاک گریبان میں اپنی (طرف کی) رُوح پھونک دی۔

(مقدمہ اُردو ترجمہ قرآن حکیم ''البیان'' کاظمی پبلیکیشنز‘ کچہری روڈ ملتان)



اصول ترجمۂ قرآن کریم

حضرت علامہ محمد عبد الحکیم شرف قادری برکاتی دامت برکاتہم العالیہ لکھتے ہیں:

اصل موضوع پر گفتگو کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم‘ تفسیر اور ترجمہ کے معانی اور تعریفات ذکر کر دی جائیں تاکہ اصل مطلب کے سمجھنے اور سمجھانے میں آسانی رہے۔

قرآن کریم

عربی لغت میں قرآن‘ قراءت کا ہم معنی مصدر ہے‘ جس کا معنی پڑھنا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ'' (۷۶/ ۱۷۔۱۸) بے شک اس کا محفوظ کرنا اور پڑھنا ہمارے ذمہ ہے‘ تو جب ہم اسے پڑھ چکیں‘ اس وقت پڑھے ہوئے کی اتباع کرو (کنز الایمان)۔

پھر معنی مصدری سے نقل کر کے اللہ تعالیٰ کے نبی اکرم ﷺ پر نازل کیے ہوئے معجز کلام کا نام قرآن رکھا گیا‘ یہ مصدر کا استعمال ہے‘ مفعول کے معنی میں جیسے خلق بمعنی مخلوق عام طور پر آتا ہے۔ (علامہ محمد عبد العظیم زرقانی‘ مناہل العرفان‘ ج ۱ ص ۷‘ دار احیاء الکتب العربیہ‘ مصر)

تفسیر

عربی زبان میں تفسیر کا معنی ہے: واضح کرنا اور بیان کرنا‘ اسی معنی میں کلمۂ تفسیر سورۂ فرقان کی اس آیت میں آیا ہے:

''وَلَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا'' (الفرقان: ۳۳) اور کوئی کہاوت تمہارے پاس نہ لائیں گے مگر ہم اس سے بہتر بیان لے آئیں گے۔

اصطلاحی طور پر تفسیر وہ علم ہے‘ جس میں انسانی طاقت کے مطابق قرآن پاک سے متعلق بحث کی جاتی ہے کہ وہ کس طرح اللہ تعالیٰ کی مراد پر دلالت کرتا ہے۔

جب یہ کہا گیا کہ تفسیر میں قرآن کریم سے بحث ہوتی ہے‘ لیکن اللہ تعالیٰ کی مراد پر

دلالت کرنے کے اعتبار سے تو اس قید سے درج ذیل علوم خارج ہو گئے' انہیں تفسیر نہیں کہا جائے گا:

علم قراءت: اس علم میں قرآن کریم کے احوال ہی سے بحث ہوتی ہے لیکن قرآن پاک کے کلمات کے ضبط اور ان کی ادائیگی کی کیفیت پیش نظر ہوتی ہے۔

علم رسم عثمانی: اس علم میں قرآن کریم کے کلمات کی کتابت سے بحث کی جاتی ہے۔

علم کلام: اس علم میں بحث کی جاتی ہے کہ قرآن پاک مخلوق ہے یا نہیں۔

علم فقہ: اس علم میں بحث کی جاتی ہے کہ حیض ونفاس اور جنابت کی حالت میں قرآن پاک کا پڑھنا حرام ہے۔

(علامہ محمد عبدالعظیم زرقانی' مناہل العرفان' ج ا ص ۰۷ ۴ـ ۱۷' دار احیاء الکتب العربیہ' مصر)

علم صرف: اس علم میں کلمات کی ساخت سے بحث ہوتی ہے۔

علم نحو: اس میں کلمات کے معرب (اعراب لگانا) ومبنی ہونے اور ترکیب کلمات سے بحث ہوتی ہے۔

علم معانی: اس میں کلام فصیح کے موقع محل کے مطابق ہونے سے بحث کی جاتی ہے۔

علم بیان: اس میں ایک مطلب کو مختلف طریقوں سے بیان کرنے کی بحث ہوتی ہے۔

علم بدیع: اس میں وہ امور زیر بحث آتے ہیں' جن کا تعلق الفاظ کے حسن وخوبی سے ہوتا ہے'

غرض یہ کہ صرف علم تفسیر ہی وہ علم ہے' جس میں طاقت انسانی کے مطابق قرآن پاک کے ان معانی اور مطالب کو بیان کیا جاتا ہے' جو اللہ تعالیٰ کی مراد ہیں۔

طاقتِ انسانی کی قید کا مطلب یہ ہے کہ متشابہات کے مطالب اور اللہ تعالیٰ کی واقعی مراد کا معلوم نہ ہونا علم تفسیر کے خلاف نہیں ہے' اللہ تعالیٰ کی مراد اسی حد تک بیان کی جائے گی' جہاں تک انسانی طاقت اور علم ساتھ دے گا۔

وہ علوم جن کی مُفسّر کو حاجت ہے

علماء اسلام نے مفسر کے لیے درج ذیل علوم میں مہارت لازمی قرار دی ہے:

(۱) لغت (۲) صرف (۳) نحو (۴) بلاغت (۵) اصول فقہ (۶) علم التوحید (۷) قصص (۸) ناسخ ومنسوخ (۹) علم وہبی (۱۰) اسباب نزول کی معرفت (۱۱) قرآن کریم کے مجمل اور

مبہم کو بیان کرنے والی احادیث۔

وہبی علم' عالمِ باعمل کو عطا کیا جاتا ہے' جس شخص کے دل میں بدعت' تکبر' دنیا کی محبت یا گناہوں کی طرف میلان ہو' اسے علم وہبی سے نہیں نوازا جاتا۔

ارشادِ ربانی ہے:

''سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيَاتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ'' (الاعراف:۷:۱۴۶)

اور میں اپنی آیتوں سے انہیں پھیر دوں گا جو زمین میں ناحق بڑائی چاہتے ہیں (کنزالایمان)۔

امام شافعی فرماتے ہیں:

شَكَوْتُ اِلٰى وَكِيْعٍ سُوْءَ حِفْظِيْ فَاَرْشَدَنِيْ اِلٰى تَرْكِ الْمَعَاصِيْ
وَاَخْبَرَنِيْ بِاَنَّ الْعِلْمَ نُوْرٌ وَنُوْرُ اللّٰهِ لَا يَهْدِيْ لِعَاصِيْ

''O میں نے امام وکیع کے پاس حافظے کی خرابی کی شکایت کی تو انہوں نے مجھے گناہوں کے ترک کرنے کی ہدایت فرمائی'

O اور مجھے بتایا کہ علم نور ہے اور اللہ تعالیٰ کا نور گناہگار کو عطا نہیں کیا جاتا''۔

یہ علوم اور ان کے علاوہ دیگر شرائط تفسیر کے اعلیٰ مراتب کے لیے ضروری ہیں۔ عمومی طور پر اتنا علم کافی ہے' جس سے قرآن پاک کے مطالب اجمالی طور پر سمجھے جاسکیں اور انسان اپنے مولائے کریم کی عظمت اور اس کے پیغام سے آگاہ ہوسکے۔

تفسیر کے اعلیٰ مراتب کے لیے چند امور نہایت ضروری ہیں:

(۱) قرآن کریم میں واقع کلمات مفردہ کی تحقیق' لغت عربی کے استعمالات کے مطابق کی جائے' کسی بھی محقق کو چاہیے کہ کلماتِ قرآن کی تفسیر ان معانی سے کرے جن میں وہ کلمات نزولِ قرآن کے زمانے میں استعمال ہوتے تھے۔ بہترین طریقہ یہ ہے کہ دیکھا جائے کہ یہ لفظ قرآن پاک کے مختلف مقامات میں کن معانی میں استعمال ہوا ہے' پھر سیاق وسباق اور موقع محل کے مطابق اس کا معنیٰ بیان کیا جائے' قرآن پاک کی بہترین تفسیر وہ ہے' جو خود قرآن پاک سے کی جائے۔

(۲) بلغاء کے کلام کا وسیع اور گہرا مطالعہ کرکے ان کے کلام کے بلند پایہ اسالیب' نکات اور محاسن کی معرفت حاصل کی جائے اور متکلم کی مراد تک رسائی حاصل کی جائے' اس

طریقے سے ہم اللہ تعالیٰ کی مراد مکمل طور پر سمجھنے کا دعویٰ تو نہیں کر سکتے‘ تاہم کلامِ الٰہی کے مطالب تک اس قدر رسائی حاصل کی جا سکتی ہے‘ جس سے ہم ہدایت حاصل کر سکیں۔ اس سلسلے میں علم نحو‘ معانی اور بیان کی حاجت ہے‘ لیکن صرف ان علوم کے پڑھ لینے سے کام نہیں چلے گا‘ بلکہ ان علوم کی روشنی میں بلغاء کے کلام‘ قرآن کریم اور حدیث شریف کا وسیع مطالعہ بہت ضروری ہے۔

(۳) اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری کتاب میں مخلوق کے بہت سے احوال اور ان کی طبیعتوں کا بیان کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا طریقہ ان کے بارے میں کیا رہا؟ سابقہ امتوں کے بہترین واقعات اور ان کی سیرتیں بیان کیں‘ اس لیے قرآن پاک کا مطالعہ کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ سابقہ قوموں کے ادوار اور اطوار سے واقف ہو اور اسے معلوم ہو کہ طاقتور کون تھا اور کمزور کون؟ اس طرح عزت کس کو ملی اور ذلت کسے نصیب ہوئی؟ علم اور ایمان کس کے حصے میں آیا اور کفر و جہل کس کو ملا؟ نیز عالم کبیر یعنی عناصر (آگ‘ ہوا‘ پانی اور مٹی) اور افلاک کے احوال سے باخبر ہو‘ اس مقصد کے لیے بہت سے فنون درکار ہیں‘ ان میں سے اہم علم تاریخ اپنے تمام شعبوں سمیت ہے۔

قرآن پاک میں امم سابقہ‘ سنن الٰہیہ اور اللہ تعالیٰ کی ان آیات کا اجمالاً ذکر کیا گیا ہے‘ جو آسمانوں اور زمین‘ آفاق اور نفوس میں پائی جاتی ہیں‘ یہ اس ہستی کا بیان کردہ اجمال ہے‘ جس کا علم ہر شے کو احاطہ کیے ہوئے ہے‘ اس نے ہمیں غور و فکر اور زمین میں سیر کرنے کا حکم دیا ہے‘ تاکہ ہم اس کے اجمال کی تفصیل کو سمجھ کر ترقی کے زینے طے کر سکیں‘ اب اگر ہم کائنات پر ایک سرسری نظر ڈالنا ہی کافی جان لیں تو یہ ایسے ہی ہو گا جیسے کہ ایک شخص کسی کتاب کی جلد کی رنگینی اور دلکشی کو دیکھ کر خوش ہو جائے اور اس علم و حکمت سے غرض نہ رکھے‘ جو اس کتاب میں ہے۔

(۴) فرض کفایہ ادا کرنے والے مفسر پر لازم ہے کہ وہ یہ حقیقت معلوم کرے کہ قرآن پاک نے تمام انسانوں کو کس طرح ہدایت دی ہے‘ اسے معلوم ہونا چاہیے کہ نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں تمام انسان خواہ وہ عربی ہوں یا عجمی‘ کس حال میں تھے؟ کیونکہ قرآن پاک کا اعلان ہے کہ سب لوگ گمراہی اور بدبختی میں مبتلا تھے اور نبی اکرم ﷺ ان

سب کی ہدایت و سعادت کے لیے مبعوث ہوئے تھے‘ اگر مفسر اس دور کے انسانوں کے حالات (عقائد و معمولات) سے کماحقہٗ آگاہ نہیں ہو گا تو قرآن حمید نے ان کی جن عادتوں کو قبیح قرار دیا ہے‘ انہیں مکمل طور پر کیسے جان سکے گا؟

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جو شخص احوالِ جاہلیت سے جس قدر زیادہ جاہل ہے‘ اس کے بارے میں اتنا ہی زیادہ خوف ہے کہ وہ اسلام کی رسی کو تار تار کر دے‘ مطلب یہ ہے کہ جو شخص اسلام کی آغوش میں پیدا ہوا‘ پلا بڑھا اور اسے پہلے لوگوں کے حالات معلوم نہیں ہیں تو اسے پتا نہیں چلے گا کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت و عنایت نے کس طرح انقلاب برپا کیا اور کس طرح انسانوں کو گمراہی کے اندھیروں سے نکال کر ہدایت کے جگ مگ راستے پر کھڑا کر دیا؟

(۵) نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ طیبہ کا وسیع مطالعہ ہونا چاہیے‘ نیز صحابہ کرام کی سیرتوں سے بہ خوبی آگاہ ہونا چاہیے اور پتا ہونا چاہیے کہ صحابۂ کرام علم و عمل کے کس مرتبے پر فائز تھے اور دنیاوی و اخروی معاملات کس طرح انجام دیتے تھے؟

(علامہ محمد عبد العظیم زرقانی‘ مناہل العرفان ج ۱ ص ۵۲۲۔۵۱۹‘ دار احیاء الکتاب العربیہ‘ مصر)

ترجمہ‘ عربی لغت کی روشنی میں

عربی زبان میں لفظ ”ترجمہ“ چار معنوں کے لیے استعمال ہوتا ہے:

(۱) کلام کا اس شخص تک پہنچانا‘ جس تک کلام نہیں پہنچا۔

ایک شاعر نے لفظ ترجمہ اسی معنی میں استعمال کیا ہے:

اِنَّ الثَّمَانِیْنَ...... وَبَلَغْتُهَا قَدْ اَحْوَجَتْ سَمْعِیْ اِلٰی تَرْجُمَانٖ

”بے شک میں اسی سال کی عمر کو پہنچ چکا ہوں‘ اس عمر نے مجھے ترجمان کا محتاج بنا دیا ہے“

(یعنی مجھے مخاطب کی بات سنائی نہیں دیتی‘ اس لیے میں ایسے شخص کا محتاج ہوں‘ جو خاص طور پر مجھے وہ بات سمجھائے)

(۲) کلام جس زبان میں ہے‘ اسی زبان میں اس کی تفسیر کرنا۔

اس معنی کے اعتبار سے ابن عباس رضی اللہ عنہما کو ”ترجمان القرآن“ کہا جاتا ہے۔

(۳) کسی دوسری زبان میں کلام کی تفسیر کرنا۔

لسان العرب اور قاموس میں ہے کہ ترجمان' کلام کے مفسر کو کہتے ہیں۔شارح قاموس نے جوہری کے حوالے سے بیان کیا کہ ''تَرْجَمَہٗ وَتَرْجَمَ عَنْہُ'' کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص کسی کے کلام کا مطلب دوسری زبان میں بیان کرے۔

البتہ تفسیر ابن کثیر اور تفسیر بغوی سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ ترجمہ' عربی زبان میں مطلقاً بیان کرنے کو کہتے ہیں' خواہ اسی زبان میں ہو' جس میں اصل کلام ہے یا دوسری زبان میں۔

(۴) کلام کو ایک زبان سے دوسری زبان کی طرف نقل کرنا۔

لسان العرب میں ترجمان' پہلے حرف پر پیش یا زبر' وہ شخص ہے جو کلام کو ایک زبان سے دوسری زبان کی طرف نقل کرے۔

قاموس سے معلوم ہوتا ہے کہ ترجمان کا تلفظ تین طرح کیا جاسکتا ہے۔

☆ تاء اور جیم دونوں پر پیش ''تُرجُمان''

☆ دونوں پر زبر ''تَرجَمان''

☆ تاء پر زبر اور جیم پر پیش ''تَرجُمان''

چونکہ ان چاروں معنوں میں بیان پایا جاتا ہے' اس لیے وسعت دیتے ہوئے ان چار معنوں کے علاوہ ہر اس چیز پر ترجمہ کا اطلاق کر دیا جاتا ہے' جس میں بیان ہو' مثلاً کہا جاتا ہے:

☆ ''تَرْجَمَ لِھٰذَا الْبَابَ بِکَذَا'' مصنف نے اس باب کا یہ عنوان مقرر کیا

☆ ''تَرْجَمَ لِفُلَانٍ'' فلاں شخص کا تذکرہ لکھا

☆ ''تَرْجَمَۃُ ھٰذَا الْبَابِ کَذَا'' اس باب کا مقصد اور خلاصہ یہ ہے۔

(علامہ محمد عبدالعظیم زرقانی' مناہل العرفان ج ۲ ص ۶-۵' دار احیاء الکتاب العربیہ' مصر)

یاد رہے کہ ''تَرجَمَۃ'' رباعی مجرد کے باب ''فَعْلَلَۃٌ'' سے ہے' اس لیے ترجمہ کرنے والے کو ''مُتَرْجِم'' اور قرآن پاک کو ''مُتَرْجَم'' کہا جائے گا'' مُتَرْجِم'' اور ''مُتَرْجَم'' میں جیم کو مشدد پڑھنا غلط ہے۔

ترجمہ کا عرفی معنی

لغوی اعتبار سے لفظ ترجمہ چار معنوں میں استعمال ہوتا ہے' جن کا ذکر ابھی کیا گیا ہے۔عرف عام میں لفظ ترجمہ سے چوتھا معنی مراد لیا جاتا ہے یعنی ایک کلام کا معنی کسی دوسری زبان میں بیان کرنا۔

علامہ محمد عبدالعظیم زرقانی کہتے ہیں کہ ترجمہ کا عرفی معنی یہ ہے کہ کلام ایک زبان میں ہو' اور اُس کا مطلب دوسری زبان میں اس طرح بیان کیا جائے کہ اس کلام کے تمام معانی اور مقاصد بھی ادا کر دیئے جائیں۔ (علامہ: محمد عبدالعظیم زرقانی' مناہل العرفان ج ۲ ص ۷)

اور ظاہر ہے کہ کسی بھی کلام کا اور خاص طور پر قرآن مجید کا ایسا ترجمہ نہیں کیا جاسکتا' جس میں اصل کلام کے تمام معانی اور مقاصد ادا کر دیئے جائیں۔اسی لیے علامہ محمد عبدالعظیم زرقانی قرآن پاک کے ترجمہ کو ناجائز قرار دیتے ہیں' اور کہتے ہیں کہ تفسیر میں اصل کلام کے تمام معانی کا ادا کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ بعض مقاصد کا ادا کرنا کافی ہے' اس لیے قرآن پاک کی تفسیر تو کی جاسکتی ہے' ترجمہ نہیں کیا جاسکتا۔

دنیا بھر کی مختلف زبانوں میں قرآن پاک کا ترجمہ کیا گیا ہے اور کوئی بھی ترجمہ کرنے والا یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میں نے قرآن مجید کے تمام معانی اور مقاصد کو اپنی زبان میں منتقل کر دیا ہے' اور یہ ہو بھی نہیں سکتا' تو اس بحث کی حاجت ہی نہیں رہتی کہ ایسا ترجمہ جائز ہے یا نہیں؟

اس سے پہلے لسان العرب اور شرح قاموس کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے کہ ترجمہ کا مطلب ایک کلام کے معنی کو دوسری زبان میں بیان کرنا ہے' یہ قید علامہ زرقانی نے اپنی طرف سے لگائی ہے کہ اصل کلام کے تمام معانی اور مقاصد بھی ادا کیے جائیں' ظاہر ہے کہ اس قید کے اضافے میں ان سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا' جو شخص بھی قرآن مجید کا ترجمہ کرے گا' وہ بعض معانی اور مقاصد ہی کو بیان کرے گا' اگر ایسے ترجمہ کو تفسیری ترجمہ کہا جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

اَقسامِ ترجمہ

عرفی معنی کے لحاظ سے ترجمہ کی دو قسمیں ہیں:

(۱) لفظی (۲) تفسیری

لفظی ترجمہ میں اصل کلام کے کلمات کی ترتیب کو ملحوظ رکھا جاتا ہے اور ایک ایک کلمہ کی جگہ اس کا ہم معنی لفظ رکھ دیا جاتا ہے' جیسے کہ شاہ رفیع الدین محدث دہلوی اور "تفسیر نعیمی" میں مفتی احمد یار خاں نعیمی اور "تفسیر الحسنات" میں علامہ ابوالحسنات سید محمد احمد قادری نے کیا ہے' اس ترجمہ کو حرفی ترجمہ بھی کہا جاتا ہے۔

تفسیری ترجمہ میں تحت اللفظ ایک ایک کلمہ کا ترجمہ نہیں کیا جاتا بلکہ مطالب و معانی کو بہتر اور مؤثر انداز میں پیش کیا جاتا ہے' اسے معنوی ترجمہ اور تفسیری ترجمہ کہا جاتا ہے' یہ ترجمہ تفسیر تو نہیں ہے جیسے کہ آئندہ سطور میں بیان کیا جائے گا' لیکن مقاصد کو بہتر انداز میں پیش کرنے کے اعتبار سے تفسیر کے مُشابہ ضرور ہے۔

ترجمہ اور تفسیر میں فرق

ترجمہ لفظی ہو یا تفسیری' وہ تفسیر سے الگ چیز ہے' ترجمہ اور تفسیر میں متعدد وجوہ سے فرق ہے:

(۱) ترجمہ کے کلمات مستقل حیثیت رکھتے ہیں' یہاں تک کہ ان کلمات کو اصل کی جگہ رکھا جا سکتا ہے' جب کہ تفسیر ہمیشہ اپنے اصل سے متعلق ہوتی ہے' مثلاً ایک مفرد یا مرکب لایا جاتا ہے' پھر اس کی شرح کی جاتی ہے اور شرح کا تعلق اصل کے ساتھ ایسے ہوتا ہے جیسے خبر کا مبتدا کے ساتھ' پھر دوسری جز کی اسی طرح شرح کی جاتی ہے' ابتدا سے انتہا تک یہی سلسلہ جاری رہتا ہے' تفسیر اپنے اصل سے اس طرح متعلق ہوتی ہے کہ اگر تفسیر کو اصل سے جدا کر دیا جائے تو وہ بے معنی ہو کر رہ جائے گی' اسے اصل کی جگہ نہیں رکھا جا سکتا۔

(۲) ترجمہ میں اضافہ نہیں کیا جا سکتا' کیونکہ ترجمہ تو ہو بہو اصل کی نقل ہے' اس لیے دیانت داری کا تقاضا ہے کہ نقل کسی کمی بیشی کے بغیر اصل کے مطابق ہو' برخلاف تفسیر کے کہ اس میں اصل کی وضاحت ہوتی ہے' مثلاً بعض اوقات مفسر کو الفاظ لغویہ کی شرح کی ضرورت پیش آئے گی' خصوصاً اس وقت جب کہ ان کے وضعی معانی مراد نہ ہوں' اسی طرح کہیں دلائل پیش کیے جائیں گے اور کہیں حکمت بیان کی جائے گی۔

یہی وجہ ہے کہ اکثر تفسیروں میں لغوی' اعتقادی' فقہی اور اصولی مباحث بیان کی جاتی

ہیں' کائناتی اور اجتماعی مسائل زیر بحث لائے جاتے ہیں' اسباب نزول اور ناسخ و منسوخ کا ذکر کیا جاتا ہے' جب کہ ترجمہ میں ان مباحث و مسائل کی گنجائش نہیں ہوتی۔

(۳) عرفی ترجمہ میں یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اصل کلام کے تمام معانی اور مقاصد بیان کر دیئے گئے ہیں (یہ علامہ محمد عبدالعظیم زرقانی کی ذاتی رائے ہے)' لیکن تفسیر میں صرف وضاحت مقصود ہوتی ہے'

☆ خواہ اجمالاً ہو یا تفصیلاً

☆ تمام معانی اور مقاصد پر مشتمل ہو یا بعض پر'

اس کا دارومدار ان حالات پر ہے جن میں مفسر گزر رہا ہے اور ان لوگوں کی ذہنی سطح پر ہے جن کے لیے تفسیر لکھی گئی ہے۔

(۴) عرف عام کے مطابق ترجمہ میں اس اطمینان کا دعویٰ کیا جاتا ہے کہ مترجم کے نقل کردہ تمام معانی اور مقاصد' اصل کلام کے مدلول ہیں اور قائل کی مراد ہیں۔ تفسیر میں یہ دعویٰ نہیں کیا جاتا' بعض اوقات مفسر دلائل کے پیش نظر اطمینان اور وثوق کا دعویٰ کرتا ہے' اور جب اسے قوی دلائل میسر نہیں ہوتے تو وہ اطمینان کا دعویٰ نہیں کرتا' کبھی وہ بعض احتمالات کا ذکر کرتا ہے' کبھی چند احتمالات ذکر کر دیتا ہے' جن میں سے بعض کو ترجیح حاصل ہوتی ہے' بعض اوقات وہ تصریح یا ترجیح سے گریز کرتا ہے اور کبھی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ کسی کلمے یا جملے کے بارے میں کہہ دیتا ہے کہ اس کا قائل ہی بہتر جانتا ہے کہ اس سے مراد کیا ہے؟ جیسے کہ بہت سے مفسرین حروف مقطعات اور قرآنی متشابہات کے بارے میں کہہ دیتے ہیں۔ (علامہ محمد عبدالعظیم زرقانی' مناہل العرفان ج ۲ ص ۱۲۔۱۰)

اس جگہ اس موقف کا اعادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قرآن پاک کا مختلف زبانوں میں ترجمہ کرنے والے علماء کا یہ موقف ہرگز نہیں ہوتا کہ ہم قرآن پاک کے تمام معانی اور مطالب کو دوسری زبان میں منتقل کر رہے ہیں' کیونکہ ایسا ترجمہ کرنا ممکن ہی نہیں ہے اور انسانی طاقت سے باہر ہے۔

وہ چند امور جن کے بغیر ترجمہ نہیں کیا جا سکتا

اس سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ مفسر کے لیے کن علوم میں دسترس ضروری ہے؟

قرآن مجید کے ترجمہ کے لیے بھی ان علوم میں مہارت لازمی ہے' ان کے علاوہ مترجم کے لیے جو اُمور ضروری ہیں' ان میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

(۱) مترجم کے لیے ضروری ہے کہ وہ جس زبان میں ترجمہ کر رہا ہے' اس زبان اور عربی لغت کے معانی وضعیہ سے آگاہ ہو' اسے معلوم ہو کہ کون سا لفظ کس معنی کے لیے وضع کیا گیا ہے؟

(۲) اسے دونوں زبانوں کے اُسالیب اور خصوصیات کا بھی پتا ہو۔

(۳) کسی آیت کے متعدد مطالب ہوں تو ان میں سے راجح مطلب کو اختیار کرے۔

(۴) اللہ تعالیٰ کی عظمت وجلالت کو پیش نظر رکھے اور ترجمہ میں کوئی ایسا لفظ نہ لائے' جو بارگاہِ الٰہی کے شایانِ شان نہ ہو' مثلاً اس آیت کا ترجمہ کیا جاتا ہے:

''اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ'' (النساء:۱۴۲) البتہ منافق دغابازی کرتے ہیں اللہ سے اور وہی ان کو دغا دے گا۔

اللہ تعالیٰ کی طرف دغا کی نسبت کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے' اس لیے اس آیت کا ترجمہ یہ ہے:

بے شک منافق لوگ اپنے گمان میں اللہ کو فریب دینا چاہتے ہیں اور وہی انہیں غافل کر کے مارے گا۔ (کنز الایمان)

منافقین اللہ تعالیٰ کو دغا نہیں دے سکتے کیونکہ وہ تو ''عالم الغیب والشهادة'' ہے' وہ ہر ظاہر اور مخفی امر کو جانتا ہے' اسے کون دھوکا دے سکتا ہے؟ ہاں! منافقین دھوکا دینے کی اپنی سی کوشش کرتے ہیں' اگرچہ انہیں اس میں کامیابی نہیں ہو سکتی' ''وَهُوَ خَادِعُهُمْ'' کا کتنا عمدہ اور صحیح ترجمہ ہے؟ کہ ''وہی انہیں غافل کر کے مارے گا'' یہ معنی نہیں کہ وہی ان کو دغا دے گا۔

(۵) مقام انبیاء علیہم السلام کی عظمت اور تقدس کو ملحوظ رکھا جائے' ارشادِ ربانی ہے: ''حَتّٰی اِذَا اسْتَیْئَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا'' (یوسف:۱۱۰) اس آیت کا ترجمہ بعض لوگوں نے یہ کیا: یہاں تک کہ جب ناامید ہو گئے رسول اور خیال کرنے لگے کہ ان سے جھوٹ کہا گیا تھا۔

اس ترجمہ میں دو باتیں قابل غور ہیں:

(۱) رسولانِ گرامی کی طرف مایوسی کی نسبت کی گئی ہے' حالانکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''اِنَّهٗ لَا یَایْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ'' (یوسف:۸۷) بے شک اللہ کی رحمت سے ناامید نہیں ہوتے مگر کافر لوگ۔

(۲) اللہ تعالیٰ کے رسولوں کی نسبت کہا گیا: اور خیال کرنے لگے کہ ان سے جھوٹ کہا گیا تھا۔

معاذ اللہ! انبیاء کرام معصوم ہیں' ان کے گوشۂ خیال میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کہا گیا تھا' وہ جھوٹ تھا۔

حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے اپنی خالہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا: ''وَظَنُّوْا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا'' (یوسف:۱۱۰) کیا رسولوں نے یہ گمان کیا کہ انہیں جھوٹ کہا گیا تھا؟ انہوں نے فرمایا:

مَعَاذَ اللّٰهِ لَمْ تَكُنِ الرُّسُلُ تَظُنُّ ذٰلِكَ بِرَبِّهَا، وَظَنَّتِ الرُّسُلُ اَنَّ اَتْبَاعَهُمْ قَدْ كَذَّبُوْهُمْ. (امام محمد بن اسماعیل بخاری' بخاری شریف ج۲ ص۶۸۰' مطبع رشیدیہ' ہند)

اللہ کی پناہ! رسولانِ گرامی اپنے رب کے بارے میں یہ گمان نہیں کر سکتے تھے' رسولوں نے گمان کیا کہ اُن کے پیروکاروں نے انہیں جھٹلا دیا ہے۔

حضرت ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کی قراءت ''قَدْ كُذِّبُوْا'' ہے' ذال مشدد مکسور کے ساتھ' اس صورت میں معنی یہ ہے کہ رسولوں نے گمان کیا کہ انہیں ان کی قوم کی طرف سے جھٹلا دیا گیا ہے۔ دوسری قراءت میں ''قَدْ كُذِبُوْا'' ہے' اب اگر ''ظَنُّوْا'' کی ضمیر رسولوں کی طرف راجع کریں تو معنی یہ ہو گا کہ رسولوں نے گمان کیا کہ انہیں جھوٹ کہا گیا' اس صورت میں مطلب یہ ہو گا کہ رسولوں کے خیال میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں جو کچھ کہا گیا تھا' وہ جھوٹ تھا' اسی مطلب کو سامنے رکھتے ہوئے حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: معاذ اللہ! اللہ تعالیٰ کے رسول اپنے رب کی نسبت یہ گمان نہیں کر سکتے۔

ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کا انکار اسی صورت سے متعلق ہے' جب کہ ''ظَنُّوْا'' کی ضمیر

رسولوں کی طرف راجع کی جائے' ورنہ امام حفص کی قراءت میں ''قَدْ کُذِبُوْا'' ذال کی تخفیف کے ساتھ ہے' اس قراءت کے مطابق ''ظَنُّوْا'' کی ضمیر رسولوں کی طرف نہیں بلکہ ان کی قوم کے افراد کی طرف راجع ہے' اب ترجمہ یہ ہوگا کہ لوگوں نے گمان کیا کہ انہیں (رسولوں کی طرف سے) جھوٹ کہا گیا تھا' اور اس ترجمہ میں کوئی حرج نہیں ہے۔

امام احمد رضا بریلوی قدس سرہٗ العزیز نے اس آیت کا جو ترجمہ کیا ہے' اہل علم اسے پڑھ کر داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے' ملاحظہ ہو:

یہاں تک کہ جب رسولوں کو ظاہری اسباب کی امید نہ رہی اور لوگ سمجھے کہ رسولوں نے ان سے غلط کہا تھا۔ (کنز الایمان)

یعنی رسولوں کی مایوسی ظاہری اسباب سے تھی نہ کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے' اور لوگوں نے گمان کیا کہ انہیں عذاب وغیرہ کے بارے میں جھوٹ کہا گیا تھا' انبیاء کرام کا دامنِ عصمت اس خیال سے ہرگز داغ دار نہ تھا۔

(۶) اسلام کے قطعی اور یقینی عقائد کو ملحوظ رکھا جائے اور انہیں ذرا سی ٹھیس بھی نہ لگنے دی جائے۔ ارشاد ربانی ہے: ''فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَیْهِ'' (الانبیاء: ۸۷) اس کا ترجمہ یہ کیا گیا: پھر سمجھا نہ پکڑ سکیں گے اس کو۔

اس آیت میں سیدنا یونس علیہ السلام کا ذکر ہے' ترجمہ میں ان کی طرف اس امر کی نسبت کی گئی ہے کہ انہوں نے سمجھا کہ اللہ تعالیٰ انہیں نہ پکڑ سکے گا' اور یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا انکار ہے' جس کی نسبت حضرت یونس علیہ السلام کی طرف کرنا کسی طرح بھی جائز نہیں ہے' مغالطہ اس لیے پیدا ہوا کہ ''قَدَرَ یَقْدِرُ'' کا استعمال دو معنوں میں ہوتا ہے: (۱) قادر ہونا (۲) تنگی کرنا۔

مترجم نے سمجھا کہ اس جگہ پہلا معنی مراد ہے' جو قطعاً غلط ہے' اس موقع اور عصمتِ انبیاء کے مطابق صرف دوسرا معنی ہے۔

علامہ محمد بن مکرم افریقی فرماتے ہیں:

جس شخص نے اس آیت میں ''قَدَرَ'' کو قدرت سے ماخوذ مان کر کہا کہ حضرت یونس علیہ السلام نے یوں گمان کیا کہ اللہ تعالیٰ ان کو نہ پکڑ سکے گا' تو یہ ناجائز ہے اور اس معنی کا گمان کرنا

کفر ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ظن کرنا شک ہے اور اس کی قدرت میں شک کرنا کفر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء علیہم السلام کو اس قسم کے گمان سے محفوظ اور معصوم رکھا ہے' ایسی تاویل وہی کرے گا جو عرب کے کلام اور اُن کی لغات سے جاہل ہوگا۔

(علامہ امام محمد بن مکرم افریقی' لسان العرب ج ۵ ص ۷۷' دار صادر' بیروت)

اس تفصیل کے بعد امام احمد رضا بریلوی کا ترجمہ دیکھئے' ایمان تازہ ہو جائے گا: تو گمان کیا (یونس علیہ السلام نے) کہ ہم اس پر تنگی نہ کریں گے۔

ایک دوسری آیت کریمہ دیکھئے:

''وَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّکُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِیْ مِلَّتِنَا''

(ابراہیم: ۱۳) اس کا ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے: ''ان کفار نے اپنے رسولوں سے کہا کہ ہم تم کو اپنی زمین سے نکال دیں گے یا یہ کہ تم ہمارے مذہب میں لوٹ آؤ''۔

''لوٹ آؤ'' کا واضح مطلب یہ ہے کہ حضرات رسولانِ گرامی علیہم السلام معاذ اللہ! پہلے کافروں کے مذہب میں شامل تھے' حالانکہ انبیاء کرام علیہم السلام کبھی بھی کافروں کے مذہب میں شامل نہیں ہوتے۔ اس جگہ مغالطے کی وجہ یہ ہے کہ ''عَادَ یَعُوْدُ'' کا استعمال دو طرح ہوتا ہے:

☆ فعل تام' اس وقت اس کا معنی لوٹنا ہوگا۔

☆ فعل ناقص' اس وقت یہ ''صَارَ'' کے معنی میں ہوگا اور ہو جانے کے معنی پر دلالت کرے گا۔

ترجمہ کرنے والے کے سامنے نحو کے مسائل و قواعد مستحضر ہوں تو وہ غور کرے گا کہ اس جگہ پہلا معنی مناسب ہے یا دوسرا؟ ظاہر ہے کہ مذکورہ ترجمہ میں پہلا معنی مراد لینے کی بناء پر غلطی ہوئی ہے' جب کہ اس جگہ دوسرا معنی مراد اور موزوں ہے' اسی لیے امام احمد رضا بریلوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کا ترجمہ اس طرح کیا ہے:

''اور کافروں نے اپنے رسولوں سے کہا: ہم ضرور تمہیں اپنی زمین سے نکال دیں گے یا تم ہمارے دین پر آ جاؤ''۔ (کنز الایمان)

(۷) قرآن پاک عربی زبان کا وہ شاہکار ہے' جو مرتبۂ اعجاز پر فائز ہے' کسی بھی مترجم کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ اس کا ترجمہ معجزانہ کلام سے کرے' تاہم علم معانی اور بیان کے مسائل و مباحث سے باخبر ایسا ترجمہ تو کر ہی سکتا ہے جس سے اعجاز قرآنی کی جھلک

دکھائی دے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ'' (البقرہ:۲)۔

عام طور پر اس آیت کا ترجمہ کچھ اس طرح کیا جاتا ہے کہ ''یہ کتاب اس میں کوئی شک نہیں ہے''۔

اس ترجمے پر دو سوال وارد ہوتے ہیں:

☆ ''ذٰلِكَ'' کی وضع بعید کی طرف اشارہ کرنے کے لیے ہے' اس لیے ترجمہ کرتے ہوئے ''وہ کتاب'' کہنا چاہیے تھا نہ کہ ''یہ کتاب''۔

☆ ''اس میں کوئی شک نہیں'' واقع کے خلاف ہے' کیونکہ قرآن کریم میں بہت سے لوگوں نے شک کیا اور آج بھی ایسے لوگوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔

امام احمد رضا بریلوی رحمہ اللہ تعالیٰ کا ترجمہ دیکھئے' جو اعجاز قرآن کو واضح طور پر آشکارا کرتا ہے: ''وہ بلند رتبہ کتاب (قرآن) کوئی شک کی جگہ نہیں'' (کنز الایمان)۔

اس ترجمے پر پہلا سوال تو ظاہر ہے کہ وارد ہی نہیں ہوتا' دوسرے سوال کا جواب بھی دے دیا کہ اگرچہ قرآن پاک کے بارے میں بہت سے لوگوں نے شک کیا ہے' لیکن وہ کوئی شک کی جگہ نہیں ہے' کوئی بھی منصف عاقل' عربی زبان کے اسلوب اور نزاکتوں سے واقف اس کا مطالعہ کرے تو اسے ماننا پڑے گا کہ یہ ربانی کلام ہے' کسی انسان کی فکر کا نتیجہ نہیں ہے۔

(۸) جس زبان میں ترجمہ کیا جائے' اس کے اسلوب اور مزاج کو پیش نظر رکھا جائے' اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا'' (التحریم:۱۲)

اس کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے: ''اور مریم بیٹی عمران کی جس نے روکے رکھا اپنی شہوت کی جگہ کو'' یہ امر محتاج بیان نہیں ہے کہ اس ترجمہ میں اُردو زبان کی شائستگی اور مزاج کو ملحوظ نہیں رکھا گیا' اس کی بجائے یہ ترجمہ کتنا دلکش ہے: ''اور عمران کی بیٹی مریم جس نے اپنی پارسائی کی حفاظت کی''۔

(۹) قرآن پاک میں بیان کردہ کسی بھی واقعے کی واقعی تفصیلات سے آگاہی ضروری ہے' ورنہ ترجمہ کرتے وقت کہیں بھی غلطی واقع ہو سکتی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''فَقَالَ اِنِّيْٓ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّيْ حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ ۝ رُدُّوْهَا عَلَيَّ فَطَفِقَ مَسْحًا بِالسُّوْقِ وَالْاَعْنَاقِ ۝'' (ص:۳۲-۳۳)۔

عام طور پر مترجمین نے ''تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ'' کا ترجمہ یہ کیا ہے:

''سورج چھپ گیا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی نماز عصر قضا ہو گئی' انہوں نے گھوڑوں کو طلب کیا اور ان کی پنڈلیاں اور گردنیں کاٹ دیں''۔

اس ترجمے پر دو سوال وارد ہوتے ہیں:

☆ حضرت سلیمان علیہ السلام گھوڑوں کو ملاحظہ فرما رہے تھے کہ نماز قضا ہو گئی' اس میں گھوڑوں کا کیا قصور تھا؟ کہ انہیں ہلاک کر دیا گیا۔

☆ گھوڑوں کی گردنیں اور ٹانگیں کاٹ کر مال کے ضائع کرنے کا کیا جواز تھا؟ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ تمام گھوڑے خیرات کر دیتے۔

امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا ہے:

''عَنْ ذِكْرِ رَبِّيْ مِنْ ذِكْرِ طَفِقَ مَسْحًا يَمْسَحُ اَعْرَافَ الْخَيْلِ وَعَرَاقِيْبَهَا''

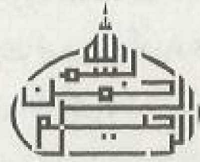
(امام محمد بن اسماعیل بخاری' صحیح بخاری ج ۲ ص ۱۰۷) یعنی ''عَنْ'' بمعنی ''مِنْ'' ہے اور ''طَفِقَ مَسْحًا'' کا معنی یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام گھوڑوں کی ایال (گردن کے بالوں) اور ان کے ٹخنوں پر ہاتھ پھیرنے لگے۔

اس اقتباس سے واضح ہو گیا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے گھوڑوں کو ہلاک نہیں کیا تھا' جب یہ حقیقت ہی نظروں سے اوجھل ہو تو ترجمہ کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟ آیئے صحیح ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

''تو سلیمان علیہ السلام نے کہا: مجھے ان گھوڑوں کی محبت پسند آئی ہے' اپنے رب کی یاد کے لیے پھر انہیں چلانے کا حکم دیا' یہاں تک کہ نگاہ سے پردے میں چھپ گئے' پھر حکم دیا انہیں میرے پاس واپس لاؤ تو ان کی پنڈلیوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیرنے لگے'' (کنز الایمان)۔

غرض یہ کہ قرآن پاک ایسی عظیم الشان اور لافانی کتاب کا ترجمہ کرنا ہر کس و ناکس اور ہر عالم کا کام نہیں ہے' مترجم کے لیے جو امور ضروری ہیں' ان کا مختصر تذکرہ آپ کے سامنے پیش کیا گیا ہے' اللہ تعالیٰ ہم سب کو قرآن پاک کے پڑھنے' اسے سمجھنے اور اس کی تعلیمات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

آمین بحرمة سيد المرسلين ﷺ والحمد لله رب العالمين.



پیش لفظ

تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے اور درود و سلام ہو تمام رسولوں میں افضل ہمارے آقائے نامدار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اور آپ کی آل پاک اور تمام صحابہ پر۔

قرآن کریم وہ بلند رتبہ کتاب ہے' جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے تمام کتب کو منسوخ فرما دیا اور اللہ تعالیٰ نے اس کو ایسے عظیم نبی پر نازل فرمایا جن کے ذریعے نبیوں کی آمد کا سلسلہ مکمل اور ختم ہوا۔ آپ ایک ایسا دین لے کر تشریف لائے' جو خاتم الادیان ٹھہرا۔

قرآن حکیم مخلوق کی اصلاح کے لیے خالق کا دستور ہے۔ زمین والوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے آفاقی قانون ہے' اس کو نازل فرمانے کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے تمام سابقہ شریعتوں کو منسوخ فرما دیا ہے۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے تمام تر ترقی کے راز ودیعت رکھ دیے ہیں اور ہر قسم کی سعادت کا حصول قرآن ہی کے ذریعے ممکن ہے' قرآن پاک رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بہت بڑا معجزہ اور آپ کی رسالت پر زبردست دلیل ہے' جو کہ ایک عالم کی زبانوں پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت پر شاہد آپ کی نبوت پر ناطق اور آپ کی صداقت و امانت پر ایک روشن دلیل ہے۔

قرآن مجید ہی دین اسلام کا وہ بلند قلعہ ہے' جس کے حصار اور فراہم کردہ پناہ گاہ پر اسلام اپنے عقائد و نظریات' عبادات اور ان کی فلاسفی احکام و آداب (قوانین و کلچر)' قصص (اگلوں کی داستانوں سے عبرت پذیری اور ماضی کی تاریخ کے آئینہ میں حال و استقبال کو سلجھانے' سنوارنے کا وافر سامان) مواعظ اور علوم و معارف سب امور میں مکمل اعتماد اور بھروسہ کرتا ہے۔

قرآن مجید

لغت عرب کی بقاء اور سلامتی کے لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ لغت عربی کے لسانی خطوط اور جہتوں کا تعین اور اس کی سمتوں کی استقامت اسی بلند اور روشن مینار کی روشنی میں کی جاتی ہے۔

علوم عربیہ اپنی تمام تر انواع کثرت کے ساتھ قرآن مجید ہی کے مرہون منت ہیں۔ عربی علوم و فنون کو اپنے نفس مضمون اور اسالیب میں قرآن پاک کی ہی بدولت دنیا بھر میں تمام عالمی زبانوں پر تفوق و برتری حاصل ہے۔

یہی کچھ وہ وجوہ و اسباب تھے کہ جن کی بنا پر قرآن مجید' رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم' صحابہ کرام' امت مصطفویہ کے سلف اور خلف کے مطالعہ اور توجہ کا محور و مرکز رہا۔

ہر دور میں ارباب علم و فضل اور اصحاب تحقیق نے مختلف شکلوں میں قرآن پاک کے ہر پہلو پر تحقیقی کام جاری رکھا ہے۔ کبھی قرآن مجید کے الفاظ اور اس کی ادائیگی کے طریقوں پر تحقیق ہوئی تو کبھی قرآن پاک کا اسلوب اور اعجاز مرجع التفات رہا۔

کوئی قرآن پاک کی کتابت اور رسم الخط کے طریقوں کو اپنا موضوع تحقیق بناتا ہے تو کسی کا وظیفہ حیات اور شغل زندگی قرآن مجید کی تفسیر اور اس کی آیات کی شرح کرنے کی سعادت حاصل کرنا رہا ہے' اسی طرح اور بہت سے گوشوں پر تحقیقی کام ہوا۔

علمائے امت نے قرآن مجید کے ہر پہلو پر الگ الگ تحقیق اور ریسرچ کر کے مستقل کتابیں تالیف کی ہیں' ان کے لیے علوم وضع کیے اور کتب مدون فرمائی ہیں اور اس وسیع میدان میں بہت بلیغ کوششیں فرمائی ہیں اور یہ سلف صالحین کی کوششوں ہی کا نتیجہ ہے کہ آج ان بزرگوں کی مساعی جمیلہ اور عظیم کارناموں کی بدولت نہایت قابل قدر سرمایہ علمی سے ہمارے کتب خانے مالا مال ہیں اور اس گراں قدر علمی سرمایہ پر ہمیں بجا طور پر ہمیشہ فخر رہا ہے اور اسلاف کی اس علمی اور تحقیقی دولت و ثروت کے بل پر ہم اقوام عالم کو چیلنج کرنے اور ہر ملک اور ہر ملت کے افراد اغیار کو دندان شکن اور مسکت جواب دے سکنے کی پوزیشن میں ہیں اور اس طرح علماء محققین کی کاوشوں سے آج ہمیں زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق جملہ علوم و فنون پر تصانیف اور گراں بہا شروحات دستیاب ہیں۔

ایک قرآن مجید ہی کو لے لیں' اس کے متعلقہ علوم میں سے مثلاً علم قراءت' علم تجوید' نسخ عثمانی کا علم' علم تفسیر' علم ناسخ ومنسوخ' علم غرائب القرآن' علم اعجاز القرآن' علم اعراب القرآن اور اس طرح دیگر بہت سارے علوم دینیہ اور علوم عربیہ کے جو واقعی لائق اعتبار ہیں اور تاریخ نے اس کو تمام کتب کی اصل یعنی قرآن پاک کی حفاظت کے لیے عمدہ گردانا ہے۔ ایسے ہر علم پر کتابیں لکھی ہیں' ان تمام علوم کی تدوین اور منصۂ شہود پر ان کی جلوہ گری اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک معجزہ کا ظہور ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی "اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ O" (الحجر: ۹) "بے شک ہم نے اتارا ہے یہ قرآن اور بے شک ہم خود ہی اس کے نگہبان ہیں" کی تصدیق کرنے والا ہے۔

پھر ان علوم مذکورہ کی کوکھ سے ایک نہایت عمدہ جدید علم نکلا' جو ان تمام علوم کا بڑا ہی عمدہ آمیزہ مرکب ہے اور بمصداق "الولد سر لابیہ" ان جملہ علوم کے اغراض ومقاصد اور اسرار وخصوصیات کا جامع ہے اور وہ "علوم القرآن" کے نام سے جانا جاتا ہے اور یہی "علم نو" ہماری اس زیر بحث کتاب کا موضوع ہے۔ تاہم ہم علوم القرآن پر صرف انہی امور سے بحث کریں گے' جن کا تعلق براہ راست علم تفسیر سے ہے۔ تاکہ قرآن پاک کی گہرائیوں میں اترنے والوں کے لیے آسانی پیدا ہو اور ہماری یہ کتاب تفسیر کے طالب علموں کے لیے کلیدی کردار ادا کرے' اور کی بورڈ (Keyboard) کا کام دے۔

اس پہلو سے جائزہ لیا جائے تو "علوم القرآن" کی حیثیت تفسیر پڑھنے والوں کے لیے وہی ہے' جو حدیث شریف پڑھنے کا ارادہ رکھنے والوں کے لیے علوم الحدیث کی حیثیت ہوتی ہے۔

علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب "الاتقان فی علوم القرآن" کے خطبہ میں لکھتے ہیں:

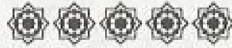
"میں زمانہ طالب علمی سے متقدمین کے اس وطیرے پر بڑا تعجب کرتا تھا کہ انہوں نے علوم قرآن پر کوئی کتاب تالیف نہیں کی' جس طرح سے کہ انہوں نے علوم حدیث کے متعلق کتابیں تصنیف فرمائی ہیں"۔

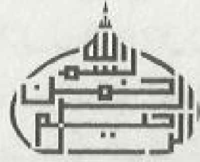
پس یہ چند فصلیں علوم القرآن سے متعلق ہیں اور یہ دراصل ہم نے امام جلال الدین

سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "الاتقان فی علوم القرآن" کی تلخیص پیش کی ہے اور کچھ اضافی اور تحقیقی باتیں ہم نے اپنی طرف سے بھی اس میں شامل کر دی ہیں اور اس کا نام "زبدۃ الاتقان فی علوم القرآن" رکھا ہے' اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ اس کو بھی اصل کی طرح نافع بنائے اور ہمارا نیک عمل اللہ تعالیٰ کی جناب میں خالص لوجہ اللہ قرار پا جائے۔ آمین (مولا کریم تو ایسا ہی کر دے!)

سید محمد بن سید علوی بن سید عباس مالکی حسنی

۸ ربیع الاول ۱۴۰۱ھ





اصطلاحاتِ تفسیر (از مترجم)

قرآن مجید کی تفسیر کا مطالعہ کرنے سے پہلے علم تفسیر کی اصطلاحات کا جاننا ضروری ہے' قرآن مجید کی آیات کے معانی کا سمجھنا تفسیر کی اصطلاحات کے جاننے پر موقوف ہے' لہٰذا قرآن مجید کی تفسیر پوری بصیرت کے ساتھ اور کما حقہ سمجھنے کے لیے اوّلاً مکی اور مدنی سورتوں کی معرفت اور ناسخ ومنسوخ اور اسباب نزول کا علم ضروری ہے۔ کیونکہ جو شخص ان امور کی معرفت حاصل کیے بغیر تفسیر قرآن میں غور وخوض شروع کر دیتا ہے' وہ ورطہ حیرت میں مبتلا ہو جاتا ہے اور قرآن مجید کے معانی اور مطالب اس پر نہیں کھلتے ہیں' نتیجۃً تفسیر کے ساتھ اس کی دلچسپی ہی ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔

بعض متقدمین کا بیان ہے کہ قرآن کا نزول تین قسموں پر ہوا ہے' ان میں سے ہر ایک قسم دوسری قسم سے بالکل جداگانہ ہے' پس جو شخص ان باتوں کی وجوہات سے واقف ہو کر پھر دین میں کلام کرے گا' وہی بات ٹھیک کرے گا اور اصول دین کے موافق زبان کھولے گا اور اگر بغیر ان امور کی معرفت حاصل کیے دین میں کچھ زبان سے نکالے گا تو معلوم رہنا چاہیے کہ غلطی اس کے گرد وپیش منڈلاتی رہے گی اور وہ چیزیں حسب ذیل ہیں' جن کا جاننا مطالعہ تفسیر سے پہلے ضروری ہے' مثلاً مکی' مدنی' ناسخ' منسوخ' محکم' متشابہ' تقدیم' تاخیر' مقطوع' موصول' سبب نزول' اضمار' خاص' عام' نہی' وعد' وعید' حدود' احکام' خبر استفہام' اعذار' انذار حجت' احتجاج' مواعظ' امثال اور قسم جن کی تفصیل آگے آ رہی ہے' مقدمہ میں مندرجہ ذیل امور پر روشنی ڈالی گئی ہے' تفسیر کا لغوی اور اصطلاحی معنی' علم تفسیر کی تعریف' موضوع اور غرض وغایت' فائدہ وثمرہ' واضع تفسیر نسبت' استمداد' فضیلت وحی کی حقیقت' قرآن مجید کی تعریف' قرآن مجید کا اعجاز تفسیر اور تاویل کی تعریف' تفسیر کی ضرورت' تفسیر بالرائے کی تحقیق' جمع وتدوین' قرآن کی تاریخ'

مضامین قرآن کا خاکہ ایک نظر میں۔

تفسیر اور تاویل کا لغوی معنی

علامہ زبیدی لکھتے ہیں کہ ابن الاعرابی نے کہا: "فسر" کا معنی ظاہر کرنا اور بند چیز کو کھولنا ہے' بصائر میں ہے معنی معقول کو منکشف کرنا "فسر" ہے' نیز فسر کا معنی طبیب کا پیشاب کا معائنہ کرنا ہے۔ "تفسرۃ" اس پیشاب کو کہتے ہیں' جس سے مریض کے مرض پر استدلال کیا جاتا ہے' اس کا طبیب معائنہ کرتے ہیں اور اس کے رنگ سے مریض کے مرض پر استدلال کرتے ہیں' تفسیر اور تاویل دونوں کا ایک معنی ہے۔ یا تفسیر مشکل لفظ کی مراد کے بیان کرنے کو کہتے ہیں اور تاویل دو احتمالوں میں سے کسی ایک احتمال کے ترجیح دینے کو کہتے ہیں۔ جو بظاہر عبارت کے مطابق ہو' لسان العرب میں اسی طرح مذکور ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ قرآن مجید میں جو مجمل قصے ہیں' ان کی شرح کرنا اور مشکل الفاظ کے معانی بیان کرنا اور آیات کا شان نزول بیان کرنا تفسیر ہے اور معانی متشابہ کو بیان کرنا تاویل ہے اور جن الفاظ کا غور وفکر کیے بغیر قطعیت کے ساتھ معنی معلوم نہ ہو سکے وہ متشابہ ہیں۔

(تاج العروس ج ۳ ص ۴۷۰' مطبعہ خیریہ مصر ۱۳۰۶ھ' بحوالہ تبیان القرآن)

علامہ میر سید شریف لکھتے ہیں:

تفسیر کا لغوی معنی ہے: کشف اور ظاہر کرنا۔

اصطلاحی معنی ہے: واضح لفظوں کے ساتھ آیت کے معنی کو بیان کرنا' اس سے مسائل مستنبط کرنا' اس کے متعلق احادیث وآثار بیان کرنا اور اس کا شانِ نزول بیان کرنا۔ (کتاب التعریفات ص ۳۸' بحوالہ تبیان القرآن)

تاویل کا لغوی معنی ہے: لوٹانا اور اصطلاح شرع میں ایک لفظ کو اس کے ظاہری معنی سے ہٹا کر ایک ایسے معنی پر محمول کرنا جس کا وہ احتمال رکھتا ہو اور وہ احتمال کتاب اور سنت کے موافق ہو' مثلاً اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ" (الروم: ۱۹) وہ مردے سے زندہ کو نکالتا ہے۔ اگر اس آیت میں انڈے سے پرندے کو نکالنا مراد ہو تو تفسیر ہے اور اگر کافر سے مومن کو پیدا کرنا یا جاہل سے عالم کو پیدا کرنا مراد ہو تو یہ تاویل ہے۔

(کتاب التعریفات ص ۲۲' مطبعہ خیریہ مصر ۱۳۰۶ھ)

تفسیر کا اصطلاحی معنی علامہ ابوالحیان اندلسی لکھتے ہیں:

تفسیر وہ علم ہے جس میں الفاظ قرآن کی کیفیت نطق، ان کے مدلولات، ان کے مفرد اور مرکب ہونے کے احکام، حالت ترکیب میں ان کے معانی اور ان کے تتمات سے بحث کی جاتی ہے۔ (البحر المحیط ج ۱ ص ۲۶، دارالفکر، بیروت، ۱۴۱۲ھ)

الفاظ قرآن کی کیفیت نطق سے مراد علم قراءت ہے، الفاظ قرآن کے مدلولات سے مراد ان الفاظ کے معانی ہیں اور اس کا تعلق علم لغت سے ہے، مفرد اور مرکب کے احکام، اس سے مراد علم صرف، علم نحو (عربی گرائمر) اور علم بیان اور علم بدیع (فصاحت و بلاغت) ہے اور حالت ترکیب میں الفاظ قرآن کے معانی سے مراد یہ ہے کہ کبھی لفظ کا ظاہری معنی مراد نہیں ہوتا اور اس کو مجاز پر محمول کیا جاتا ہے، اس کا تعلق علم معانی اور بیان سے ہے اور تتمات سے مراد ناسخ اور منسوخ کی معرفت آیات کا شان نزول اور مبہمات قرآن کا بیان ہے۔

علامہ ابن الجوزی لکھتے ہیں:

کسی چیز کو (جہالت کی) تاریکی سے نکال کر (علم کی) روشنی میں لانا تفسیر ہے، اور کسی لفظ کو اس کے اصل معنی سے نقل کر کے دوسرے معنی پر محمول کرنا تاویل ہے۔ جس کی وجہ ایسی دلیل ہو کہ اگر وہ دلیل نہ ہوتی تو اس لفظ کو اس کے ظاہر سے نہ ہٹایا جاتا۔

(زاد المسیر ج ۱ ص ۴، مطبوعہ مکتب اسلامی، بیروت، ۱۴۰۷ھ، بحوالہ تبیان القرآن)

تفسیر اور تاویل کا فرق

جس لفظ کا صرف ایک معنی ہو، اس کو بیان کرنا تفسیر ہے اور جس لفظ کے کئی معنی ہوں تو دلیل سے کسی ایک معنی کو بیان کرنا تاویل ہے۔ امام ماتریدی نے کہا ہے کہ قطعیت سے بیان کرنا کہ اس لفظ کا یہ معنی ہے، اور اس بات کی شہادت دینا کہ اللہ تعالیٰ نے اس لفظ سے یہ معنی مراد لیا ہے، یہ تفسیر ہے، سو اگر کسی دلیل قطعی کی بنا پر یہ شہادت دی گئی ہے تو یہ تفسیر صحیح ہے ورنہ تفسیر بالرائے ہے، اور یہ منع ہے، اور لفظ کے کئی محتملات میں سے کسی ایک احتمال کو بغیر قطعیت اور شہادت کے متعین کرنا تاویل ہے اور ابوطالب ثعلبی نے بیان کیا ہے کہ لفظ کی حقیقت اور مجاز کو بیان کرنا تفسیر ہے، جیسے "صراط" کی تفسیر راستہ ہے اور "صیب" کی تفسیر بارش ہے اور تاویل لفظ کے باطن کو بیان کرنا ہے، مثلاً "اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ" (الفجر: ۱۴) اس کا لفظی

معنی ہے: بے شک آپ کا رب ضرور گھات میں ہے اور اس کی تاویل یہ ہے کہ وہ نافرمانوں کو دیکھ رہا ہے اور اس سے ان کو نافرمانی کرنے سے ڈرایا گیا ہے۔

تاویل میں دلیل قطعی سے یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ یہاں لفظ کا حقیقی معنی مراد نہیں ہے، علامہ اصبہانی تفسیر اور تاویل کا فرق بیان کرتے ہوئے اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ تفسیر کا معنی ہے: قرآن کے معانی کو بیان کرنا، کبھی اس میں مشکل الفاظ کے معانی بیان کیے جاتے ہیں مثلاً بحیرہ، سائبہ اور وصیلہ کے معانی اور کبھی کسی قصہ کو متضمن ہوتا ہے اور اس قصہ کے بیان کے بغیر اس کلام کی معرفت نہیں ہوتی۔ مثلاً "اِنَّمَا النَّسِیْٓءُ زِیَادَةٌ فِی الْكُفْرِ" (التوبہ: ۳۷) تقدیم و تاخیر کفر میں زیادتی کے سوا کچھ نہیں۔ یہ آیت اس قصہ کو متضمن ہے کہ کفار اپنی ہوائے نفس کی بناء پر مہینوں کو آگے پیچھے کر دیتے تھے۔

اور تاویل میں کبھی لفظ کو عموم پر محمول کیا جاتا ہے اور کبھی خصوص پر، مثلاً ایمان کا لفظ مطلقاً تصدیق کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے اور تصدیق شرعی کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے اور کبھی ایک لفظ جو کئی معنی میں مشترک ہوتا ہے، اس کے کسی ایک معنی کی تعیین کی جاتی ہے، جیسے "قروء" یہ حیض اور طہر دونوں میں مشترک ہے۔

بعض علماء نے کہا: تفسیر کا تعلق روایت کے ساتھ ہے اور تاویل کا تعلق درایت کے ساتھ ہے اور ابونصر قشیری نے کہا: تفسیر اتباع اور سماع میں منحصر ہے اور تاویل کا تعلق استنباط کے ساتھ ہے۔

مجدد گولڑوی قدس سرہ لکھتے ہیں:

"بداں کہ تفسیر بالرائے جائز نیست بخلاف تاویل کہ آں درست است تفسیر آں رامے گویند کہ بغیر از نقل دانستہ نشود مثل اسباب نزول وغیرہ و تاویل آنست کہ ممکن باشد ادراک او بقواعد عربیہ"۔ (اعلاء کلمۃ اللہ فی بیان وما اہل بہ لغیر اللہ، سید مہر علی شاہ قدس سرہ)

ترجمہ: "معلوم ہونا چاہیے کہ تفسیر بالرائے جائز نہیں اور تاویل بالرائے جائز ہے، تفسیر اسے کہتے ہیں جو نقل یعنی روایت کے بغیر معلوم نہ ہو سکے، جیسے شانِ نزول وغیرہ اور تاویل وہ ہے، جو قواعد عربیہ کے ذریعے معلوم کی جا سکے"۔

نیز لکھتے ہیں:

(ترجمہ:) علامہ سلیمان الجمل نے جلالین شریف کے حاشیہ میں تحریر فرمایا ہے کہ ''تفسیر کا معنی کشف اور اظہار ہے اور تاویل کا معنی رجوع یعنی لوٹانا ہے اور علم تفسیر وہ ہے' جس میں قرآن مجید کے احوال سے انسانی طاقت کے مطابق بحث کی جائے' اس حیثیت سے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی مراد پر دلالت کرتی ہے' پھر یہ دو قسم پر ہے' اوّل تفسیر جو بغیر نقل اور روایت کے معلوم نہ ہو سکے' جیسے اسباب نزول' دوم تاویل جو عربی قواعد سے معلوم ہو سکے اور اس بات کا راز کہ تاویل بالرائے درست ہے اور تفسیر بالرائے درست نہیں ہے' یہ ہے کہ تفسیر میں انسان اللہ تعالیٰ پر گواہی دیتا ہے کہ اس لفظ سے اللہ تعالیٰ جل مجدہ کی قطعی طور پر یہی مراد ہے اور یہ چیز بغیر توقیف (نقل وسماع) کے ناممکن اور ناروا ہے' اس لیے حاکم نے یقینی طور پر کہا ہے کہ حضرات صحابہ کرام علیہم الرضوان کی تفسیر مطلقاً حدیث مرفوع کا درجہ رکھتی ہے اور تاویل بالرائے میں دو احتمالوں میں سے ایک کو غیر یقینی (ظنی) طور پر ترجیح دے دینا ہے''۔

فائدہ اور غرض وغایت

علم تفسیر کا فائدہ قرآن مجید کے معانی کی معرفت ہے اور اس کی غرض وغایت سعادت دارین ہے۔

موضوع: اور اس کا موضوع کلام اللہ لفظی ہے' کیونکہ موضوع وہ ہوتا ہے' جس کے عوارض ذاتیہ سے اس علم میں بحث کی جاتی ہے اور علم تفسیر میں کلام لفظی کے عوارض ذاتیہ سے بحث کی جاتی ہے۔

تفسیر قرآن کی فضیلت پر عقلی دلائل

امام راغب اصفہانی نے اپنی تفسیر کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ تمام فنون میں سب سے افضل فن قرآن مجید کی تفسیر اور تاویل ہے' کیونکہ فن کی فضیلت یا تو اس کے موضوع کے اعتبار سے ہوتی ہے' جیسے کہا جاتا ہے کہ سنار کا فن دباغ (رنگریز) کے فن سے افضل ہے' کیونکہ سنار کا موضوع سونا اور چاندی ہے اور دباغ (کھال رنگنے والے) کا موضوع مردار کی کھال ہے یا فن کی فضیلت اس کی غرض کے اعتبار سے ہوتی ہے' جیسے طب کا فن' جمعدار کے فن سے افضل ہے' کیونکہ طب کی غرض صحت کا افادہ کرنا ہے اور جمعدار کی غرض بیت الخلاء کی صفائی ہے'

نیز فن کی فضیلت صورت کے اعتبار سے ہوتی ہے' تلوار کا فن بیڑیاں بنانے کے فن سے افضل ہے۔

اور فن تفسیر ان تینوں جہات کے اعتبار سے تمام فنون سے افضل ہے' کیونکہ اس کا موضوع اللہ تعالیٰ کا کلام ہے' جو ہر حکمت کا منبع وسرچشمہ اور ہر صورت کا معدن ہے اور اس کی صورت اللہ تعالیٰ کے مخفی اسرار کا اظہار ہے اور تدوین شریعت ہے اور یہ ہر صورت سے افضل ہے اور اس کی غرض سعادت حقیقیہ تک پہنچنا اور خیر کثیر کا حصول ہے' جو ہر غرض سے افضل ہے' قرآن مجید میں ہے: ''وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا'' (البقرہ:۲۶۹) اور جسے حکمت دی گئی تو بے شک اسے خیر کثیر دی گئی' ایک قول یہ ہے کہ خیر کثیر سے مراد قرآن کریم کی تفسیر ہے۔

تفسیر قرآن کی فضیلت کے متعلق احادیث وآثار

علامہ ابن عطیہ لکھتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا کہ قرآن کا کون سا علم افضل ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اس کی عربیت' سو تم اس کو شعر میں تلاش کرو' نیز نبی ﷺ نے فرمایا: قرآن مجید کے معانی کی فہم حاصل کرو اور اس کے مشکل الفاظ کے معانی تلاش کرو' کیونکہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم کے معانی کی معرفت حاصل کرنے کو پسند کرتا ہے۔

قاضی ابومحمد عبدالحق رضی اللہ عنہ نے کہا: قرآن مجید کے اعراب شریعت میں اصل ہیں' کیونکہ اسی کے ذریعے وہ معانی حاصل ہوتے ہیں' جو شرع میں مطلوب ہیں۔

حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ الکریم نے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کے علم کی تعریف کی' ان سے ایک شخص نے کہا: آپ پر قربان جاؤں' آپ کا خود اتنا عظیم مقام ہے اور آپ حضرت جابر کی تعریف کر رہے ہیں؟ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا: حضرت جابر کو قرآن مجید کی اس آیت کی تفسیر کا علم ہے: ''اِنَّ الَّذِيْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ'' (القصص:۸۵) بے شک جس نے آپ پر قرآن فرض کیا وہ آپ کو لوٹنے کی جگہ (مکہ مکرمہ) ضرور واپس لائے گا۔

انسان نے بنایا تو وہ اس قانون میں اپنے تحفظات اور اپنے مفادات شامل کرے گا‘ اس لیے یہ قانون مافوق الانسان کا بنایا ہوا ہونا چاہیے‘ تاکہ اس میں کسی جانب داری کا شائبہ اور وہم وگمان نہ ہو‘ اور ایسا قانون صرف اللہ کا بنایا ہوا قانون ہو سکتا ہے۔ جس کا علم اللہ کے بتلانے اور اس کے خبر دینے سے ہی ہو سکتا ہے اور اسی کا نام وحی ہے۔

☆ انسان عقل سے خدا کے وجود کو معلوم کر سکتا ہے‘ عقل سے خدا کی وحدانیت کو بھی جان سکتا ہے‘ قیامت کے قائم ہونے‘ حشر ونشر اور جزاء اور سزا کو بھی عقل سے معلوم کر سکتا ہے‘ لیکن وہ عقل سے اللہ تعالیٰ کے مفصل احکام کو معلوم نہیں کر سکتا‘ وہ عقل سے یہ بات جان سکتا ہے کہ اللہ کا شکر ادا کرنا اچھی بات ہے اور ناشکری بُری بات ہے‘ لیکن وہ عقل سے یہ نہیں جان سکتا کہ اس کا شکر کس طرح ادا کیا جائے‘ اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کے خبر دینے سے ہی ہو گا اور اسی کا نام وحی ہے۔

☆ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دنیا میں عبث اور بے مقصد نہیں بھیجا بلکہ اس لیے بھیجا ہے کہ وہ اپنی دنیاوی ذمہ داریوں کو پورا کرنے اور حقوق اور فرائض ادا کرنے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے اور اس کی دی ہوئی نعمتوں پر اس کا شکر ادا کرے‘ بُرے کاموں اور بُری خصلتوں سے بچے اور اچھے کام اور نیک خصلتیں اپنائے‘ اور اللہ تعالیٰ کی عبادات کیا کیا ہیں؟ اور وہ کس طرح ادا کی جائیں۔ وہ کون سے کام ہیں‘ جن سے بچا جائے اور وہ کون سے کام ہیں‘ جن کو کیا جائے‘ اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کے بتلانے اور خبر دینے سے ہی ہو سکتا ہے اور اسی کا نام وحی ہے۔

☆ بعض چیزوں کو ہم حواس کے ذریعے جان لیتے ہیں‘ جیسے رنگ‘ آواز اور ذائقہ کو‘ اور بعض چیزوں کو عقل سے جان لیتے ہیں‘ جیسے دو اور دو کا مجموعہ چار یا مصنوع کے وجود سے صانع کے وجود کو جان لیتے ہیں‘ لیکن کچھ ایسی چیزیں ہیں‘ جن کو حواس سے جانا جا سکتا ہے نہ عقل سے‘ مثلاً نماز کا کیا طریقہ ہے؟ کن ایام کے روزے فرض ہیں؟ زکوٰۃ کی کیا مقدار ہے؟ اور کس چیز کا کھانا حلال ہے اور کس چیز کا کھانا حرام ہے؟ غرض عبادات اور معاملات کے کسی شعبہ کو ہم حواس خمسہ اور عقل کے ذریعے نہیں جان سکتے‘ اس کو جاننے کا صرف ایک ذریعہ ہے اور وہ ہے وحی!

☆ بعض اوقات حواس غلطی کرتے ہیں‘ مثلاً ریل میں بیٹھے ہوئے شخص کو درخت دوڑتے ہوئے نظر آتے ہیں اور بخار زدہ شخص کو میٹھی چیز کڑوی معلوم ہوتی ہے اور حواس کی غلطیوں پر عقل متنبہ کرتی ہے‘ اس طرح بعض اوقات عقل بھی غلطی کرتی ہے‘ مثلاً عقل یہ کہتی ہے کہ کسی ضرورت مند کو مال نہ دیا جائے‘ مال کو صرف اپنے مستقبل کے لیے بچا کر رکھا جائے اور جس طرح حواس کی غلطیوں پر متنبہ کرنے کے لیے عقل کی ضرورت ہے‘ اسی طرح عقل کی غلطیوں پر متنبہ کرنے کے لیے وحی کی ضرورت ہے۔

وحی کی تعریف میں ہم نے یہ ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نبی کو جو چیز بتلاتا ہے‘ وہ وحی ہے اور نبوت کا ثبوت معجزات سے ہوتا ہے‘ اب یہ بات بحث طلب ہے کہ وحی کے ثبوت کے لیے نبوت کیوں ضروری ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر نبوت کے بغیر وحی کا ثبوت ممکن ہوتا تو اس دنیا کا نظام فاسد ہو جاتا‘ مثلاً ایک شخص کسی کو قتل کر دیتا ہے اور کہتا ہے: مجھ پر وحی اتری تھی کہ اس شخص کو قتل کر دو۔ ایک شخص بزور کسی کا مال اپنے قبضہ میں کر لیتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھ پر وحی نازل ہوئی تھی کہ اس کے مال پر قبضہ کر لو‘ اس لیے ہر کس وناکس کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ وحی کا دعویٰ کرے‘ وحی کا دعویٰ صرف وہی شخص کر سکتا ہے‘ جس کو اللہ تعالیٰ نے منصب نبوت پر فائز کیا ہو۔ لہٰذا وحی کا دعویٰ صرف نبی ہی کر سکتا ہے اور نبوت کا دعویٰ تب ثابت ہو گا‘ جب وہ اس کے ثبوت میں معجزات پیش کرے گا۔

ایک سوال یہ ہے کہ جب نبی کے پاس فرشتہ وحی لے کر آتا ہے تو نبی کو کیسے یقین ہوتا ہے کہ یہ فرشتہ ہے اور یہ اللہ کا کلام لے کر آیا ہے‘ امام رازی نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ فرشتہ نبی کے سامنے اپنے فرشتہ ہونے اور حامل وحی الٰہی ہونے پر معجزہ پیش کرتا ہے اور امام غزالی کی بعض عبارات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نبی کو ایسی صفت عطا فرماتا ہے‘ جس سے وہ جن‘ فرشتہ اور شیطان کو الگ الگ پہچانتا ہے۔

جیسے ہم انسانوں‘ جانوروں اور نباتات اور جمادات کو الگ الگ پہچانتے ہیں کیونکہ ہماری رسائی صرف عالم شہادت تک ہے اور نبی کی پہنچ عالم شہادت میں بھی ہے اور عالم غیب میں بھی ہے۔

وحی کی اقسام

بنیادی طور پر وحی کی دو قسمیں ہیں: وحی متلو اور وحی غیر متلو۔ اگر نبی ﷺ پر الفاظ اور معانی کا نزول ہو تو یہ وحی متلو ہے اور یہی قرآن مجید ہے' اور اگر آپ ﷺ پر صرف معانی نازل کیے جائیں اور آپ ﷺ ان معانی کو اپنے الفاظ سے تعبیر کریں تو یہی وحی غیر متلو ہے اور اس کو حدیث نبی کہتے ہیں۔ نبی ﷺ پر نزول وحی کی متعدد صورتیں ہیں' جن کا احادیث صحیحہ میں بیان کیا گیا ہے۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت عائشہ ام المومنین رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ حضرت حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا اور کہا: یارسول اللہ ﷺ! آپ کے پاس وحی کس طرح آتی ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کبھی وحی گھنٹی کی آواز کی طرح (مسلسل) آتی ہے اور یہ مجھ پر بہت شدید ہوتی ہے' یہ وحی (جب) منقطع ہوتی ہے تو میں اس کو یاد کر چکا ہوتا ہوں اور کبھی میرے پاس فرشتہ انسانی شکل میں آتا ہے' وہ مجھ سے کلام کرتا ہے اور جو کچھ وہ کہتا جاتا ہے' میں اس کو یاد کرتا جاتا ہوں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: میں نے دیکھا ہے کہ سخت سردی کے دنوں میں آپ پر وحی نازل ہوتی اور جس وقت وحی ختم ہوتی تھی تو آپ ﷺ کی پیشانی سے پسینہ بہہ رہا ہوتا تھا۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۲)

اس حدیث پر یہ سوال ہوتا ہے کہ نبی ﷺ نے نزول کی دو صورتیں بیان کی ہیں' اس کی کیا وجہ ہے؟

علامہ بدرالدین عینی نے اس کے جواب میں یہ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عادت جاریہ یہ ہے کہ قائل اور سامع میں کوئی مناسبت ہونی چاہیے تاکہ تعلیم اور تعلم اور افادہ اور استفادہ متحقق ہو سکے اور یہ اتصاف یا تو اس طرح ہوگا کہ سامع پر قائل کی صفت کا غلبہ ہو اور وہ قائل کی صفت کے ساتھ متصف ہو جائے اور (صلصلة الجرس) بانگ درا سے یہی پہلی قسم مراد ہے اور یا قائل سامع کی صفت کے ساتھ متصف ہو جائے اور یہ دوسری قسم ہے' جس میں فرشتہ انسانی شکل میں متشکل ہو کر آپ ﷺ سے کلام کرتا تھا۔

نبی ﷺ نے وحی کی پہلی قسم کی تشبیہ گھنٹی کی آواز کے ساتھ دی ہے' جس کی آواز مسلسل سنائی دیتی ہے اور اس کا مفہوم سمجھ میں نہیں آتا' اس میں آپ ﷺ کو متنبہ کیا ہے کہ جس وقت یہ وحی قلب پر نازل ہوتی ہے تو آپ ﷺ کے قلب پر خطاب کی ہیبت طاری ہوتی ہے اور وہ قول آپ ﷺ کو حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن اس قول کے ثقل کی وجہ سے اس وقت آپ کو اس کا پتا نہیں چلتا اور جب اس کے جلال کی ہیبت زائل ہو جاتی ہے تو پھر آپ کو اس کا علم ہوتا ہے اور وحی کی یہ قسم ایسی ہے جیسے ملائکہ پر وحی نازل ہوتی ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ آسمان پر کسی امر کا فیصلہ کرتا ہے تو فرشتے عاجزی سے اپنے پروں کو جھڑجھڑاتے ہیں' جیسے پتھر پر زنجیر ماری جائے اور جب ان کے دلوں سے وہ ہیبت زائل ہوتی ہے تو وہ آپس میں کہتے ہیں کہ تمہارے رب نے کیا کہا؟ وہ کہتے ہیں: حق فرمایا اور وہ عظیم اور کبیر ہے' اور اس حدیث میں ہم پر یہ ظاہر ہوا ہے کہ وحی کی پہلی قسم دوسری سے شدید ہے' اس کی وجہ یہ ہے کہ اس قسم میں نبی ﷺ حالت بشری سے فرشتے کی حالت کی طرف منتقل ہوتے تھے' پھر آپ ﷺ پر اس طرح وحی کی جاتی تھی' جس طرح فرشتوں پر وحی کی جاتی ہے اور یہ آپ ﷺ کے لیے مشکل تھا اور دوسری قسم میں فرشتہ انسانی شکل میں آتا تھا اور یہ قسم آپ ﷺ کے لیے آسان تھی۔ (عمدۃ القاری ج ۱ ص ۴۴' مطبوعہ ادارہ الطباعہ المنیریہ' مصر' ۱۳۴۸ھ' بحوالہ تبیان القرآن)

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ گھنٹی کی آواز میں ہر چند کہ عام لوگوں کے لیے کوئی معنی اور پیغام نہیں ہوتا' لیکن نبی ﷺ کے لیے اس آواز میں کوئی معنی اور پیغام ہوتا تھا' جیسا کہ اس ترقی یافتہ دور میں ہم دیکھتے ہیں' جب ٹیلی گرام دینے کا عمل کیا جاتا ہے تو ایک طرف سے صرف ٹک ٹک کی آواز ہوتی ہے اور دوسری طرف اس سے پورے پورے جملے بنا لیے جاتے ہیں' اسی طرح یہ ہو سکتا ہے کہ وحی کی یہ آواز بہ ظاہر صرف گھنٹی کی مسلسل ٹن ٹن کی طرح ہو اور نبی ﷺ کے لیے اس میں پورے پورے فصیح و بلیغ جملے موجود ہوں۔

علامہ بدرالدین عینی نے نزول وحی کی حسب ذیل اقسام بیان کی ہیں:

(۱) کلام قدیم کو سننا جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کا کلام سنا' جس کا ذکر قرآن مجید میں ہے اور ہمارے نبی ﷺ نے اللہ تعالیٰ کا کلام سنا' جس کا ذکر آثار صحیحہ میں

ہے۔

(۲) فرشتہ کی رسالت کے واسطہ سے وحی کا موصول ہونا۔

(۳) وحی کو دل میں القاء کیا جائے، جیسا کہ نبی ﷺ کا ارشاد ہے: روح القدس نے میرے دل میں القاء کیا۔ ایک قول یہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف اسی طرح وحی کی جاتی تھی اور انبیاء علیہم السلام کے غیر کے لیے جو وحی کا لفظ بولا جاتا ہے۔ وہ الہام یا تسخیر کے معنی میں ہوتا ہے۔

علامہ سہیلی نے الروض الانف (ج ۱ ص ۱۵۴، مطبوعہ ملتان) میں نزول وحی کی یہ سات صورتیں بیان کی ہیں:

(۱) نبی ﷺ کو نیند میں کوئی واقعہ دکھایا جائے۔

(۲) گھنٹی کی آواز کی شکل میں آپ ﷺ کے پاس وحی آئے۔

(۳) نبی ﷺ کے قلب میں کوئی معنی القاء کیا جائے۔

(۴) نبی ﷺ کے پاس فرشتہ انسانی شکل میں آئے اور حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کی شکل میں آئے، حضرت دحیہ کی شکل میں آنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ حسین ترین شخص تھے، حتیٰ کہ وہ اپنے چہرے پر نقاب ڈال کر چلا کرتے تھے، مبادا عورتیں ان کو دیکھ کر فتنہ میں مبتلا نہ ہوں۔

(۵) حضرت جبرائیل آپ کے پاس اپنی اصلی صورت میں آئے، اس صورت میں ان کے چھ سو پر تھے، جن سے موتی اور یاقوت جھڑتے تھے۔

(۶) اللہ تعالیٰ آپ ﷺ سے یا تو بیداری میں پردہ کی اوٹ سے ہم کلام ہو، جیسا کہ معراج کی شب ہوا، یا نیند میں ہم کلام ہو، جیسے جامع ترمذی میں ہے: اللہ تعالیٰ میرے پاس حسین صورت میں آیا اور فرمایا: ملاء اعلیٰ کس چیز میں بحث کر رہے ہیں۔

(۷) اسرافیل علیہ السلام کی وحی، کیونکہ شعبی سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کو حضرت اسرافیل علیہ السلام کے سپرد کر دیا گیا تھا اور وہ تین سال تک نبی ﷺ کو دیکھتے رہے، اور وہ آپ ﷺ کے پاس وحی لاتے تھے، پھر آپ کو حضرت جبرائیل علیہ السلام کے سپرد کر دیا گیا، اور مسند احمد میں سند صحیح کے ساتھ شعبی سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کو چالیس سال کی عمر میں

مبعوث کیا گیا اور تین سال تک آپ ﷺ کی نبوت کے ساتھ حضرت اسرافیل رہے اور وہ آپ ﷺ کو بعض کلمات اور بعض چیزوں کی خبر دیتے تھے، اس وقت آپ ﷺ پر قرآن مجید نازل نہیں ہوا تھا، اور جب تین سال گزر گئے تو پھر حضرت جبرائیل علیہ السلام آپ ﷺ کے پاس رہے، پھر بیس سال آپ ﷺ پر آپ ﷺ کی زبان میں قرآن مجید نازل ہوا، دس سال مکہ میں اور دس سال مدینہ میں اور تریسٹھ سال کی عمر میں آپ ﷺ کا وصال ہوا۔ البتہ واقدی وغیرہ نے اس کا انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کے علاوہ آپ ﷺ کو اور کسی فرشتہ کے سپرد نہیں کیا گیا۔

(عمدۃ القاری ج ۱ ص ۴۰، مطبوعہ مصر، بحوالہ تبیان القرآن علامہ غلام رسول سعیدی دامت برکاتہم العالیہ)

قرآن مجید کی تعریف اور قرآن مجید کے اسماء

اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہ تھا کہ سابقہ آسمانی کتابوں کے مختلط محرف اور محو ہو جانے کے بعد دنیا میں قیامت تک وحی الٰہی صرف قرآن مجید کی صورت میں باقی اور محفوظ رہے، گزشتہ شریعتیں، شریعت مصطفوی ﷺ کے بعد منسوخ ہو گئیں اور اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کے لیے صرف شریعت محمدی اور دین اسلام کے واجب القبول ہونے کا اعلان فرما دیا۔ اور دین اسلام اور شریعت محمدی کی اساس اور برہان قرآن مجید ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات پر دلائل ہیں، انبیاء سابقین اور سیدنا حضرت محمد ﷺ کی نبوت، رسالت اور ان کی عظمتوں کا بیان ہے، حلال اور حرام، عبادات اور معاملات، آداب اور اخلاق کے جملہ احکام کا بیان ہے، معاد جسمانی، حشر و نشر اور جنت و دوزخ کا تفصیل سے ذکر ہے۔ اور انسان کی ہدایت کے لیے جس قدر امور کی ضرورت ہو سکتی ہے۔ اس سب کا قرآن مجید میں بیان ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ. (النحل: ۸۹)

ہم نے آپ پر اس کتاب کو نازل کیا ہے جو ہر چیز کا روشن بیان ہے اور ہدایت اور رحمت ہے اور مسلمانوں کے لیے بشارت ہے۔

علماء اصول فقہ نے قرآن مجید کی یہ تعریف کی ہے:

قرآن مجید اللہ تعالٰی کا معجز کلام ہے‘ جو ہمارے نبی سیدنا حضرت محمد ﷺ پر عربی زبان میں نازل ہوا‘ یہ مصاحف میں لکھا ہوا ہے اور ہم تک تواتر سے پہنچا ہے‘ اس کی ابتداء سورت فاتحہ سے ہے اور اس کا اختتام سورۃ الناس پر ہے۔

قرآن مجید کے ترجمہ پر قرآن مجید کا اطلاق نہیں ہوگا کیونکہ قرآن مجید الفاظ عربیہ میں ہے‘ اللہ تعالٰی کا ارشاد ہے: ”اِنَّـآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا“ (یوسف:۲) ہم نے اس کتاب کو بہ طور عربی قرآن نازل کیا۔

اسی طرح قراءت شاذہ جو تواتر سے منقول نہیں ہیں‘ ان پر بھی قرآن مجید کا اطلاق نہیں ہوگا۔

قرآن مجید کے نام

تفسیر کبیر اور تفسیر عزیزی وغیرہ میں ہے کہ قرآن پاک کے ۳۲ نام ہیں‘ جو کہ قرآن پاک میں مذکور ہیں: (۱) قرآن (۲) فرقان (۳) کتاب (۴) ذکر وتذکرہ (۵) تنزیل (۶) الحدیث (۷) موعظ (۸) حکم‘ حکمت‘ حکیم‘ محکم (۹) شفاء (۱۰) ہدی (۱۱) صراط مستقیم (۱۲) حبل (۱۳) رحمت (۱۴) روح (۱۵) قصص (۱۶) بیان تبیان (۱۷) بصائر (۱۸) فصل (۱۹) نجوم (۲۰) مثانی (۲۱) نعمت (۲۲) برہان (۲۳) بشیر ونذیر (۲۴) قیم (۲۵) مہیمن (۲۶) ہادی (۲۷) نور (۲۸) حق (۲۹) عزیز (۳۰) کریم (۳۱) عظیم (۳۲) مبارک‘ یہ تمام نام قرآن کی مختلف آیتوں میں مذکور ہیں‘ وہ آیتیں یا تو کسی حافظ سے معلوم کرلی جائیں یا تفسیر کبیر وعزیزی میں اسی مقام پر دیکھ لی جائیں۔

نوٹ: حضرت علامہ قاری ظہور احمد فیضی صاحب نے اپنی کتاب (انوار العرفان فی اسماء القرآن) میں قرآن مجید کے ایک سو پچیس (۱۲۵) اسماء مبارکہ ثابت کیے ہیں جن میں سے ایک سو (۱۰۰) اسماء مبارکہ قرآن کریم سے اور پچیس (۲۵) اسماء مبارکہ حدیث پاک سے ثابت کیے گئے ہیں۔

ان ناموں کی وجہ

حضرت حکیم الامت تفسیر نعیمی کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

لفظ قرآن یا تو قرء سے بنا ہے یا قراءۃ سے یا قرن سے۔ (تفسیر کبیر پارہ:۲) قرء کے معنی

جمع ہونے کے ہیں۔ اب قرآن کو قرآن اس لیے کہتے ہیں کہ یہ بھی سارے اولین وآخرین کے علموں کا مجموعہ ہے۔ (تفسیر کبیر روح البیان پارہ:۲) دین و دنیا کا کوئی ایسا علم نہیں‘ جو قرآن میں نہ ہو‘ اسی لیے حق تعالٰی نے فرمایا کہ ”نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ“ (النحل:۸۹) نیز یہ سورتوں اور آیتوں کا مجموعہ ہے‘ نیز یہ تمام بکھروں کو جمع کرنے والا ہے۔ دیکھو ہندی‘ سندھی‘ عربی‘ عجمی لوگ‘ ان کے لباس‘ طعام‘ زبان‘ طریق زندگی سب الگ الگ‘ کوئی صورت نہ تھی کہ یہ اللہ تعالٰی کے بکھرے ہوئے بندے جمع ہوتے‘ لیکن قرآن مجید نے ان سب کو جمع فرمایا اور ان کا نام رکھا مسلمان‘ خود فرمایا: ”سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ“ (الحج:۷۸) ”اللہ نے تمہارا نام مسلمان رکھا ہے“۔

جیسے کہ شہد مختلف باغوں کے رنگ برنگے پھولوں کا رس ہے‘ مگر اب ان سب رسوں کے مجموعہ کا نام شہد ہے‘ اسی طرح ”مسلمان“ مختلف ملکوں‘ مختلف زبانوں کے لوگ ہیں‘ مگر ان کا نام ہے مسلمان‘ تو گویا یہ کتاب اللہ کے بندوں کو جمع فرمانے والی ہے۔ اسی طرح زندوں اور مردوں میں بہ ظاہر کوئی علاقہ باقی نہ رہا تھا۔ لیکن اس قرآن عظیم نے ان کو بھی خوب جمع فرمایا۔ مردے مسلمان زندوں سے فیض لینے لگے کہ اسی قرآن سے ان پر ایصال ثواب وغیرہ کیا جاتا ہے اور زندے فوت شدگان سے کہ وہ حضرات اسی قرآن کی برکت سے ولی‘ قطب‘ غوث بنے اور ان کا فیض بعد وفات جاری ہوا۔

(۲) اور اگر یہ قراءۃ سے بنا ہے تو اس کے معنی ہیں: پڑھی ہوئی چیز‘ تو اب اس کو قرآن اس لیے کہتے ہیں کہ اور انبیاء کرام کو کتابیں یا صحیفے حق تعالٰی کی طرف سے لکھے ہوئے عطا فرمائے گئے۔ لیکن قرآن کریم پڑھا ہوا اترا‘ اس طرح کہ جبرائیل امین حاضر ہوتے اور پڑھ کر سنا جاتے اور یقیناً پڑھا ہوا نازل ہونا‘ لکھے ہوئے نازل ہونے سے افضل ہے (جس کی بحث نزول کے باب میں آرہی ہے) نیز جس قدر قرآن کریم پڑھا گیا اور پڑھا جاتا ہے‘ اس قدر کوئی دینی دنیوی کتاب دنیا میں نہ پڑھی گئی۔ کیونکہ جو آدمی کوئی کتاب بناتا ہے‘ وہ تھوڑے سے لوگوں کے پاس پہنچتی ہے اور وہ بھی ایک آدھ دفعہ پڑھتے ہیں۔ اور پھر کچھ زمانہ بعد ختم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح پہلی آسمانی کتابیں بھی خاص خاص جماعتوں کے پاس آئیں اور کچھ دن رہ کر پہلے تو بگڑیں پھر ختم ہوگئیں‘

لیکن قرآن کریم کی شان یہ ہے کہ سارے عالم کی طرف آیا اور ساری خدائی میں پہنچا۔ سب نے پڑھا' بار بار پڑھا اور دل نہ بھرا' اکیلے پڑھا' جماعتوں کے ساتھ پڑھا' اگر کبھی تراویح کی جماعت یا شبینہ دیکھنے کا اتفاق ہوا ہو تو معلوم ہوگا کہ اس عظمت کے ساتھ کوئی کتاب پڑھی ہی نہیں گئی' پر لطف بات یہ ہے کہ اس کو مسلمان نے بھی پڑھا اور کافر نے بھی پڑھا۔

لطیفہ: ایک بار رام چندر آریہ نے حضرت صدر الافاضل سید نعیم الدین مراد آبادی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے عرض کیا کہ مجھے قرآن کریم کے چودہ پارے یاد ہیں۔ بتایئے آپ کو میرا وید (ہندوؤں کی کتاب کا نام) کتنا یاد ہے؟ حضرت موصوف نے فرمایا: یہ تو میرے قرآن کا کمال ہے کہ دوست تو دوست' دشمنوں کے سینوں میں بھی پہنچ گیا' تو تیرے ''وید'' کی یہ کمزوری ہے کہ دوستوں کے دل میں بھی گھر نہ کر سکا اور بقول تمہارے ''وید'' کو دنیا میں آئے ہوئے کروڑوں برس ہو چکے' لیکن ہندوستان سے آگے نہ نکل سکا۔ مگر قرآن کریم چند صدیوں میں تمام عالم میں پہنچ گیا۔

(۳) اور اگر یہ ''قرن'' سے بنا ہے تو قرن کے معنی ہیں: ملنا اور ساتھ رہنا' اب اس کو قرآن اس لیے کہتے ہیں کہ حق اور ہدایت اس کے ساتھ ہے' نیز اس کی سورتیں اور آیتیں' ہر ایک بعض بعض کے ساتھ ہیں' کوئی کسی کے مخالف نہیں' نیز اس میں عقائد اور اعمال اور اعمال میں اخلاق' سیاسیات' عبادات' معاملات تمام ایک ساتھ جمع ہیں نیز یہ مسلمان کے ہر وقت ساتھ رہتا ہے' دل کے ساتھ' ظاہری اعضاء کے ساتھ اور باطنی عضوؤں کے ساتھ' دل میں پہنچا' اس کو مسلمان بنایا' ہاتھ پاؤں ناک کان وغیرہ کو حرام کاموں سے روک کر حلال میں مشغول کر دیا۔ غرضیکہ سر سے لے کر پاؤں تک کے ہر عضو پر اپنا رنگ جما دیا۔ پھر زندگی میں ہر حالت میں ساتھ' بچپن میں ساتھ' جوانی میں ساتھ' بڑھاپے میں ساتھ' پھر ہر جگہ ساتھ رہا' تخت پر ساتھ تختے پر ساتھ' گھر میں ساتھ' مسجد میں ساتھ' آبادی میں ساتھ' جنگل میں ساتھ' سوتے میں ساتھ' جاگتے میں ساتھ' مصیبت میں ساتھ' آرام میں ساتھ' سفر میں ساتھ اور حضر میں ساتھ' غرضیکہ ہر حال میں ساتھ' پھر مرتے وقت ساتھ کہ پڑھتے اور سنتے ہوئے مرے۔ قبر میں ساتھ کہ بعض صحابہ کرام کو ان کی وفات کے بعد قبر میں قرآن پاک پڑھتے سنا گیا۔ اور حشر میں ساتھ

کہ گنہگار کو خدا سے بخشوائے۔ پل صراط پر نور بن کر مسلمان کے آگے چلے اور راستہ دکھائے اور بتائے اور جب مسلمان جنت میں پہنچے گا تو فرمایا جائے گا کہ پڑھتا جا اور بڑھتا جا۔ غرضیکہ یہ مبارک چیز کبھی بھی ساتھ نہیں چھوڑتی۔

الفرقان: اس کا دوسرا نام فرقان ہے' یہ لفظ فرق سے بنا ہے' اس کے معنی ہے: فرق کرنے والی چیز' قرآن کو فرقان اس لیے کہتے ہیں کہ حق و باطل جھوٹ اور سچ مومن اور کافر میں فرق فرمانے والا ہے۔ قرآن بارش کی مثل ہے' دیکھو کسان زمین کے مختلف حصوں میں مختلف بیج بو کر چھپا دیتا ہے' کسی کو پتا نہیں لگتا کہ کہاں کون سا بیج بویا ہوا ہے' مگر بارش ہوتے ہی جہاں جو بیج دفن تھا' وہاں وہی پودا نکل آتا ہے' تو بارش زمین کے اندرونی تخم کو ظاہر کرتی ہے۔ اسی طرح رب تعالیٰ نے اپنے بندوں کے سینوں میں ہدایت' گمراہی' سعادت' شقاوت' کفر و ایمان کے مختلف تخم' امانت رکھے۔ نزول قرآن سے پہلے سب یکساں معلوم ہوتے تھے۔

صدیق و ابوجہل' فاروق و ابولہب میں فرق نظر نہیں آتا تھا' قرآن نے نازل ہو کر کھرا اور کھوٹا علیحدہ کر دیا' صدیق کا ایمان' زندیق کا کفر ظاہر فرما دیا' لہٰذا اس کا نام فرقان ہوا' یعنی ان میں فرق ظاہر کرنے والا۔

الکتاب کی وجہ تسمیہ: یہ ''کَتْبٌ'' سے بنا ہے' اس کے چند معانی ہیں' جمع کرنا' اسی لیے لشکر کو کتیبہ کہتے ہیں' کیونکہ اس میں بہت سے انسان جمع ہوتے ہیں اور اس میں مختلف قصص احکام اور آیات کو جمع کیا گیا ہے' اس لیے اس کا نام کتاب ہے۔ فرض اور تقدیر کے معنی میں کتاب کا لفظ مستعمل ہے' قرآن مجید میں ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ. (البقرہ: ۱۸۳)

اے ایمان والو! تم پر روزہ رکھنا فرض کیا گیا' جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا۔

قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا. (توبہ: ۵۱)

آپ کے لیے ہمیں صرف وہی چیز پہنچے گی جو ہمارے لیے اللہ نے مقدر کر دی ہے۔

کتاب کا لفظ بنانے اور شمار کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے' قرآن مجید میں ہے:

"فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ" (آل عمران: ۵۳) سو گواہی دینے والوں کے ساتھ ہمارا شمار کرلے اللہ کی طرف سے حجت ثابتہ کے معنی میں بھی کتاب کا لفظ مستعمل ہے' قرآن کریم میں ہے: "اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا مِّنْ قَبْلِهٖ" (الزخرف: ۲۱) کیا ہم نے اس (قرآن) سے پہلے انہیں کوئی حجت ثابتہ دی ہے؟

فَأْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ. (الصافات: ۱۵۷) — تم اپنی حجت ثابتہ لے آؤ' اگر تم سچے ہو۔

کتاب کا لفظ حکم کے معنی میں بھی وارد ہے' قرآن مجید میں ہے:

لَوْ لَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ. (الانفال: ۶۸) — اگر پہلے سے (معاف کر دینے کا) حکم' اللہ کی طرف سے نہ ہوتا تو (کافروں سے) جو (فدیہ کا مال) تم نے لیا تھا' تمہیں اس میں ضرور بڑا عذاب پہنچتا۔

میعاد یا مدت "ولها كتاب معلوم"

علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں: کتب کا معنی ہے: چمڑے کے دو ٹکڑوں کو سی کر ایک کو دوسرے کے ساتھ ملا دینا' اور عرف میں اس کا معنی بعض حروف کو لکھ کر بعض دوسرے حروف کے ساتھ ملانا (کمپوز (Compos) کرنا) اور کبھی صرف ان ملائے ہوئے حروف پر بھی کتاب کا اطلاق ہوتا ہے' اسی اعتبار سے اللہ کے کلام کو کتاب کہا جاتا ہے۔ اگرچہ وہ لکھے ہوئے نہیں ہیں۔

(۴) ذکر و تذکرہ کے معنی ہیں: یاد دلانا' چونکہ یہ قرآن کریم اللہ اور اس کی نعمتوں کو اور میثاق کے عہد کو یاد دلاتا ہے' اس لیے اس کو ذکر و تذکرہ کہتے ہیں۔

(۵) تنزیل کے معنی ہیں: اتاری ہوئی کتاب' چونکہ یہ بھی رب کی طرف سے اتاری گئی ہے' اس لیے اسے تنزیل کہتے ہیں (۶) حدیث کے معنی ہیں: نئی چیز یا کلام اور بات چونکہ بمقابلہ تورات وانجیل کے یہ دنیا میں زمین پر بعد میں آیا' اس لیے یہ نیا ہے۔ نیز یہ پڑھا ہوا اترا نہ کہ لکھا ہوا' اس لیے یہ بات ہے (۷) موعظہ کے معنی نصیحت کے ہیں اور یہ کتاب سب کو نصیحت کرنے والی ہے' اس لیے اس کا نام موعظہ ہے (۸) حکمت' حکم محکم یا حکم سے

بنے ہیں' اس کے معنی ہیں: مضبوط کرنا' لازم کرنا اور روکنا' چونکہ یہ قرآن پاک مضبوط بھی ہے' کوئی اس میں تحریف نہ کر سکا اور لازم بھی ہے کہ کسی کتاب نے اس کو منسوخ نہ کیا اور بُری باتوں سے روکنے والا بھی ہے' اس لیے اس کے یہ نام ہوئے (۹) شفاء' اس لیے کہتے ہیں کہ یہ ظاہری اور باطنی بیماریوں سے سب کو شفا دینے والی کتاب ہے (۱۰) ہدی ہادی' اس لیے کہتے ہیں کہ یہ لوگوں کو ہدایت کرتی ہے (۱۱) صراط مستقیم' اس لیے کہتے ہیں کہ اس پر عمل کرنے والا اپنی منزل مقصود پر آسانی سے پہنچ سکتا ہے (۱۲) حبل' اس لیے کہتے ہیں کہ حبل کے معنی ہیں: رسی' اور رسی سے تین کام لیے جاتے ہیں' اس سے چند بکھری ہوئی چیزوں کو باندھ لیتے ہیں' رسی کو پکڑ کر نیچے سے اوپر پہنچ جاتے ہیں' رسی ہی کے ذریعے کشتی پار لگ جاتی ہے۔ چونکہ قرآن کے ذریعے مختلف لوگ ایک ہو گئے' اسی طرح اس کی برکت سے کفر کے دریا میں ڈوبنے سے بچ جاتے ہیں اور رسی کے ذریعے سے حق تعالیٰ تک پہنچتے ہیں' اسی لیے رسی کو "حبل" کہتے ہیں (۱۳) رحمت' اس لیے کہتے ہیں کہ یہ علم ہے اور جہالتوں اور گمراہیوں سے نکالنے والا ہے اور علم حق تعالیٰ کی رحمت ہے (۱۴) روح' حضرت جبرائیل علیہ السلام کے معرفت آئی اور یہ جانوں کی زندگی ہے' اس لیے اس کو روح کہتے ہیں' نیز روح کے چند کام ہیں' جسم کو باقی رکھنا' بے جان جسم جلد سڑ گل جاتا ہے' جسم کی حفاظت کرنا کہ بے جان جسم کو جانور کھا جاتے ہیں' جسم پر روح کرنا کہ جسم کی ہر جنبش روح کے ارادہ سے ہوتی ہے۔ قرآن شریف میں بھی مسلم قوم کی بقا کا ذریعہ ہے۔ مسلمان کو شیاطین اور کفار سے بچاتا ہے' قوم مسلم پر روح کرتا ہے کہ مسلمان کی ہر حرکت قرآن کے ماتحت ہے' لہٰذا یہ روح ہے۔

(۱۵) قصص' قصے کے دو معنی ہیں: حکایت اور کسی کے پیچھے چلنا' چونکہ قرآن پاک نے انبیاء کرام اور دوسری قوموں کے سچے قصے بیان کیے اور لوگوں کا یہ امام ہے کہ سب لوگ اس کے پیچھے چلتے ہیں' اس لیے اس کا نام قصص ہے (۱۶) بیان' تبیان' مبین' ان سب کے معنی ہیں: ظاہر کرنے والا' چونکہ یہ قرآن سارے شرعی احکام کو اور سارے علوم' غیبیہ کو نبی ﷺ پر ظاہر فرمانے والا ہے' اس لیے اس کے یہ نام ہیں (۱۷) بصائر جمع بصیرت کی ہے' بصیرت کہتے ہیں دل کی روشنی جو جیسے بصارت آنکھ کے نور کو کہا جاتا ہے' چونکہ اس کتاب سے دلوں میں صدہا نور پیدا ہوتے ہیں' اس لیے اسے بصائر بھی کہا جاتا ہے (۱۸) فصل کے معنی ہیں:

فیصلہ کرنے والی یا جدا کرنے والی' چونکہ یہ آپس کے جھگڑوں کی فیصلہ کرنے والی بھی ہے اور مسلمانوں اور کفار میں فیصلہ فرمانے والی' اس لیے اس کا نام فصل ہے۔

(۱۹) نجوم' نجم سے بنا ہے' اس کے معنی تارے کے بھی ہیں اور حصہ کے بھی۔ چونکہ قرآن پاک کی آیتیں تاروں کی طرح لوگوں کو ہدایت کرتی ہیں اور علیحدہ علیحدہ آئیں' اس لیے ان کا نام نجوم ہوا (۲۰) مثانی' جمع ہے ثنی کی' ثنی کے معنی ہیں: بار بار' کیونکہ اس میں احکام اور قصے بار بار آئے ہیں اور یہ کتاب خود بھی بار بار اتری ہے' اس لیے اس کو مثانی کہتے ہیں (۲۱) نعمت کے معنی ظاہر ہیں (۲۲) برہان کے معنی ہیں: دلیل اور یہ بھی رب کی اور نبی ﷺ کے اور تمام سابقہ انبیاء کرام کے صدق کی دلیل ہے' اس لیے اسے برہان کہتے ہیں۔

(۲۳) بشیر ونذیر ہونا ظاہر ہے کیونکہ یہ کتاب خوشخبری بھی دیتی ہے اور ڈراتی بھی ہے (۲۴) قیم کے معنی قائم رہنے والی یا قائم رکھنے والی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کو قیوم کہتے ہیں' قرآن پاک کو اس لیے قیم کہتے ہیں کہ وہ خود بھی قیامت تک قائم رہے گا اور اس کے ذریعے سے دین بھی قائم رہے گا۔

(۲۵) مھیمن کے معنی ہیں: امانت دار یا محافظ' چونکہ یہ کتاب مسلمانوں کی دنیا وآخرت میں محافظ ہے اور رب تعالیٰ کے احکام کی امانت دار بنی' امین پر اتری اور ان صحابہ کرام کے ہاتھوں میں رہی جو کہ اللہ کے امین تھے' اس لیے اس کو مھیمن کہا گیا ہے۔

(۲۶) ہادی کے معنی بالکل ظاہر ہیں۔

(۲۷) نور' اسے کہتے ہیں جو خود بھی ظاہر ہو اور دوسروں کو ظاہر کرے' جس کا ترجمہ ہے: چمک یا روشنی' چونکہ یہ قرآن پاک خود بھی ظاہر ہے اور اللہ کے احکام کو' انبیاء کرام کو' توریت وانجیل وغیرہ سب کو ظاہر فرمانے والا ہے' اس لیے اس کو نور کہا' جن پیغمبروں کے نام قرآن نے بتا دیئے' وہ سب میں ظاہر اور مشہور ہو گئے اور جن کا قرآن کریم نے ذکر نہ فرمایا وہ بالکل چھپ گئے۔ نیز یہ قرآن کریم پل صراط پر نور بن کر مسلمانوں کے آگے آگے چلے گا (۲۸) حق' اس کے معنی ہیں: سچی بات' بمقابل باطل یعنی جھوٹی بات قرآن پاک سچی بات بتاتا ہے' سچے کی طرف سے آیا ہے' سچا اس کو لایا' سچے محمد ﷺ پر اترا' اس لیے اسے حق کہتے ہیں۔

(۲۹) عزیز کے معنی ہیں: غالب اور بے مثل' قرآن پاک بھی سب پر غالب رہا اور اب بھی سب پر غالب ہے اور بے مثل بھی' اس لیے اس کو عزیز کہا جاتا ہے۔

(۳۰) کریم' اس کے معنی ہیں: سخی۔ چونکہ قرآن کریم علم' خدا کی رحمت اور ایمان اور بے حساب ثواب دیتا ہے' اس لیے اس سے بڑھ کر سخی کون ہو سکتا ہے (۳۱) عظیم کے معنی ہیں: بڑا' چونکہ سب سے بڑی کتاب یہی ہے' اس لیے اس کو عظیم فرمایا گیا ہے (۳۲) مبارک کے معنی ہیں: برکت والا۔ چونکہ اس کے پڑھنے اور اس پر عمل کرنے سے ایمان میں برکت' نیک عملوں' عزت چہرے کے نور میں برکت ہے' اس لیے اس کو مبارک کہتے ہیں۔

نزول قرآن کریم

نزول کے معنی ہیں: اوپر سے نیچے اترنا' کلام میں نقل وحرکت نہیں ہو سکتی' لہٰذا اس کے اترنے اور نقل وحرکت کی تین صورتیں ہو سکتیں ہیں یا تو کسی چیز پر لکھا جائے اور اس چیز کو منتقل کیا جائے' جیسے کہ ہم کوئی بات خط میں لکھ کر بھیج دیں تو وہ بذریعہ اس کاغذ کے منتقل ہوئی' اسی طرح پہلی کتابوں کا نزول ہوا تھا یا کسی آدمی سے کوئی بات کہلا کے بھیج دی جائے۔ اس صورت میں حرکت کرنے والا وہ آدمی ہوگا اور وہ کلام اس کے ذریعے سے حرکت کرے گا اور یا بغیر کسی واسطے کے سننے والے سے گفتگو کر لی جائے' قرآن کریم کا نزول ان پچھلے دو طریقوں سے ہوا یعنی جبرائیل امین آتے تھے اور آکر سناتے تھے' یہ نزول بذریعہ قاصد ہوا اور قرآن کریم کی بعض آیتیں معراج میں بھی بغیر واسطہ جبرائیل امین عطا فرمائی گئیں۔ جیسا کہ مشکوٰۃ شریف' باب المعراج میں ہے کہ سورۂ بقرہ کی آخری آیتیں حضور علیہ السلام کو معراج میں عطا فرمائی گئیں' لہٰذا قرآن پاک کا نزول دوسری آسمانی کتابوں کے نزول سے زیادہ شاندار ہے کہ وہ لکھی ہوئی آئیں۔ یہ بولا ہوا آیا اور لکھنے اور بولنے میں بڑا فرق ہے' کیونکہ بولنے کی صورت میں بولنے کے طریقے سے اتنے معنی بن جاتے ہیں کہ جو لکھنے سے حاصل نہیں ہوتے' مثلاً ایک شخص نے ہم کو لکھ کر دیا کہ "تم دہلی جاؤ گے"' ہم لکھی ہوئی عبارت سے ایک ہی مطلب حاصل کر سکتے ہیں' لیکن اس جملے کو اگر وہ بولے تو پانچ چھ طریقے سے بول کر اس میں وہ پانچ چھ معنی پیدا کر سکتا ہے' ایسے لہجوں سے بول سکتا ہے کہ جس سے سوال' حکم' تعجب' تمسخر وغیرہ کے معنی پیدا ہو جائیں۔

قرآن مجید کے غیر تحریف شدہ ہونے کے متعلق علماء شیعہ کی تصریحات

شیخ ابو علی فضل بن حسن طبرسی لکھتے ہیں:

اگر تم یہ سنو کہ روایات شاذہ میں ہے کہ قرآن مجید میں تحریف ہوئی اور اس کا بعض حصہ ضائع ہو گیا' تو ان روایات کا کوئی وزن نہیں ہے۔ یہ روایات مضطرب اور ضعیف ہیں اور یہ روایات مسلمانوں کے مخالف ہیں۔

(مجمع البیان ج ۱ ص ۱۹' مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران' ۱۴۱۱ھ' بحوالہ تبیان القرآن)

نیز شیخ طبرسی لکھتے ہیں:

شیخ المحدثین نے کتاب الاعتقاد میں لکھا ہے کہ ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس قرآن کو اپنے نبی ﷺ پر نازل کیا' یہ وہ قرآن ہے جو مسلمانوں کے درمیان موجود ہے اور وہ اس سے زیادہ نہیں ہے اور جو ہماری طرف یہ منسوب کرتا ہے کہ ہم اس سے زیادہ قرآن کو مانتے ہیں' وہ جھوٹا ہے اور جن روایات میں ہے کہ قرآن مجید کو کم کر دیا گیا ہے۔ ان کے کئی محمل ہیں' شیخ مفید نے فصل الخطاب کے اواخر میں لکھا ہے کہ قرآن مجید میں سے کوئی کلمہ' کوئی آیت اور کوئی سورت کم نہیں ہوئی' البتہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے مصحف میں آیات قرآن کے معانی کی جو تفسیر اور تاویل لکھی ہوئی تھی' اس کو حذف کر دیا گیا' سید مرتضیٰ نے کہا کہ قرآن مجید میں کوئی کمی نہیں ہے' بعض امامیہ اور حشویہ نے بعض ضعیف روایات کی بنا پر یہ کہا کہ قرآن مجید میں کمی کی گئی ہے' لیکن ان کا اختلاف غیر معتبر ہے اور شیخ طوسی نے تفسیر تبیان کے اول میں لکھا ہے کہ قرآن مجید میں زیادتی اور کمی کے موضوع پر بحث کرنا مناسب نہیں ہے' کیونکہ قرآن مجید میں زیادتی کے باطل ہونے پر اجماع ہے اور کمی کا قول کرنا بھی مسلمانوں کے مذاہب کے خلاف ہے اور ہمارا صحیح مذہب یہی ہے اور یہی ظاہر الروایات ہے' البتہ بہت سی روایات میں قرآن مجید میں کمی کرنے کا ذکر ہے' لیکن یہ روایات اخبار آحاد ہیں' جو علم اور عمل کے لیے مفید نہیں ہیں اور ان سے اعراض کرنا بہتر ہے۔ (ایضاً)

شیخ کاشانی لکھتے ہیں:

قرآن مجید جس طرح نازل ہوا تھا' اسی طرح باقی ہے اور زیادتی اور کمی سے محفوظ ہے' تمام علماء اسلام عام ہوں یا خاص' اس پر متفق ہیں کہ قرآن مجید میں کوئی چیز زیادہ نہیں ہوئی'

البتہ کمی کے متعلق ایک جماعت کا عقیدہ ہے کہ قرآن مجید میں کمی ہوئی ہے اور منافقین نے چند آیات کو حذف کر دیا ہے اور شیعہ فرقے کے اکثر علماء اور سنی علماء اس پر متفق ہیں کہ قرآن مجید میں کوئی تغیر' تبدل' کمی اور زیادتی نہیں ہوئی۔ (الی ان قال) جن روایات سے یہ وہم پیدا ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں تحریف' تبدیل' حذف یا تغیر ہوا ہے۔ ان روایات کی تاویل اور توجیہ کرنی چاہیے اور اگر ان روایات کی توجیہ نہ ہو سکے تو ان کو مسترد کر دینا چاہیے۔

(منہج الصادقین ج ۱ ص ۴۸۔ ۴۷' خیابان ناصر خسرو ایران)

جمع قرآن کے متعلق علماء شیعہ کا نظریہ

آیت اللہ مکارم شیرازی لکھتے ہیں:

اسی جگہ ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ ایک گروہ کے درمیان یہ مشہور ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں قرآن متفرق صورت میں تھا۔ اس کے بعد (حضرت) ابوبکر یا (حضرت) عمر یا (حضرت) عثمان رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں اس کو جمع کیا گیا' اس کے برعکس واقعہ یہ ہے کہ پیغمبر ﷺ کے زمانہ میں قرآن اسی طرح جمع کیا ہوا تھا' جس طرح آج جمع کیا ہوا ہے' اور اس کی ابتداء میں یہی سورت فاتحہ تھی' اور اس کی یہ وجہ نہیں ہے کہ یہ سورت سب سے پہلے نازل ہوئی تھی۔ اس پر متعدد دلائل ہیں کہ جس صورت میں آج قرآن ہمارے سامنے ہے' رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں آپ ﷺ کے حکم سے اس کو اسی طرح جمع کیا گیا تھا۔

پہلی دلیل یہ ہے کہ علی ابن ابراہیم نے امام صادق رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول خدا ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: قرآن مجید ریشم اور کاغذ وغیرہ کے ٹکڑوں میں متفرق ہے' اس کو جمع کرو۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ اس مجلس سے اٹھے اور زرد رنگ کے ایک کپڑے میں قرآن مجید کو جمع کر کے اس پر مہر لگا دی۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ مشہور سنی عالم خوارزمی نے کتاب المناقب میں علی بن ریاح سے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت علی ابن ابی طالب اور حضرت ابی ابن کعب نے رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں قرآن مجید کو جمع کیا تھا۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ اہل سنت کے مشہور امام حاکم نیشاپوری نے مستدرک میں حضرت زید ابن ثابت سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں قرآن کو

متفرق ٹکڑوں سے جمع کر کے پیش کرتے تھے اور رسول اللہ ﷺ کے نزدیک جس آیت کا جو مقام تھا' وہاں اس آیت کو رکھنے کا حکم دیتے تھے' البتہ اس وقت یہ نوشتہ متفرق تھا (یکجا نہ تھا)' پیغمبر ﷺ نے حضرت علی سے کہا کہ اس کو ایک جگہ جمع کریں' اور ہم کو اس سے خبردار کرتے تھے کہ کہیں قرآن ضائع نہ ہو جائے۔

علماء شیعہ کے بہت بڑے عالم سید مرتضیٰ کہتے ہیں کہ جس صورت میں آج ہمارے پاس قرآن ہے' رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں اس صورت میں موجود تھا۔

طبرانی اور ابن عساکر نے شعبی سے روایت کیا ہے کہ چھ انصاری صحابہ نے رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں قرآن مجید کو جمع کیا اور قتادہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت انس سے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں کس نے قرآن کو جمع کیا تھا' انہوں نے کہا: چار صحابہ کرام نے اور وہ سب انصار سے تھے: حضرت ابی ابن کعب' حضرت زید ابن ثابت' حضرت معاذ اور حضرت ابوزید۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں حضرت علی نے قرآن جمع کیا تھا یا دوسروں نے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت علی نے صرف قرآن کو جمع نہیں کیا تھا بلکہ اس مجموعہ میں قرآن بھی تھا' تفسیر بھی تھی' آیات کا شانِ نزول بھی تھا اور اس کی مثل دیگر امور تھے اور ہمارے ہاتھوں میں جو قرآن ہے' یہ حضرت عثمان کا جمع کیا ہوا ہے' جس میں انہوں نے اختلاف قراءت کو ختم کر کے ایک قراءت پر قرآن کو جمع کیا اور حروف پر نقطے لگائے' کیونکہ اس سے پہلے نقطے لگانے کا رواج نہ تھا۔ البتہ اس پر اصرار کرنا کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں قرآن جمع کیا ہوا نہ تھا' حضرت عثمان یا خلیفہ اوّل یا دوم کا حصہ ہے' محض ان کی فضیلت سازی ہے۔ (تفسیر نمونہ ج ۱ ص ۱۱۔۸' مطبوعہ دار الکتب الاسلامیہ' ایران' ۱۳۶۹ھ) تفسیر نمونہ کے اس اقتباس میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں قرآن کو جمع کر لیا گیا تھا' یہ ہمارے مخالف نہیں ہے' جب کہ اس میں اعتراف کر لیا ہے کہ جمع کا مطلب یہ ہے کہ آیات اور ولیوں کے محل اور مقامات بتا دیئے گئے تھے اور اس کو لکھ کر جمع کر لیا گیا تھا' لیکن ایک جگہ جمع نہیں کیا گیا' ایک جگہ جمع پہلی بار حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں حضرت عمر کے مشورہ سے کیا گیا اور حضرت عثمان نے مختلف لغات یا قراءت کو ختم کر کے ایک قراءت پر

قرآن مجید کو جمع کیا اور یہ بہت بڑی فضیلت ہے' کوئی معمولی بات نہیں ہے۔

قرآن مجید کے بوسیدہ اوراق کو کیا کریں؟

علامہ شامی لکھتے ہیں: مجتبیٰ میں لکھا ہے کہ جب مصحف پرانا اور بوسیدہ ہو جائے تو اس کو دفن کرنا احسن ہے' جیسے نبیوں اور رسولوں کو دفن کیا جاتا ہے اور باقی دینی کتابیں جب بوسیدہ ہو جائیں تو ان کا بھی یہی حکم ہے اور دفن کرنا تعظیم کے خلاف نہیں ہے' کیونکہ انبیاء علیہم السلام کو بھی دفن کیا جاتا ہے اور ذخیرہ میں ہے کہ جب مصحف پرانا ہو جائے اور اس سے پڑھنا دشوار ہو جائے تو اس کو آگ میں نہیں جلایا جائے گا' امام محمد نے اسی طرح اشارہ کیا ہے اور ہم اسی پر عمل کرتے ہیں اور مناسب یہ ہے کہ ایک کپڑے میں لپیٹ کر اس کی لحد بنائی جائے' کیونکہ اگر اس کی قبر بہ طریق شق بنائی گئی تو اس پر مٹی گرے گی اور اس میں ایک قسم کی تحقیر ہے' ہاں! اگر چھت بنا کر پھر مٹی ڈالی جائے تو کوئی حرج نہیں ہے' اسی طرح اگر کسی پاک جگہ قرآن مجید کو رکھ دیا جائے' جہاں نہ کسی بے وضو کا ہاتھ لگے' نہ گرد و غبار پڑے اور نہ اس کی تعظیم میں فرق آئے تو یہ بھی جائز ہے۔ (ردالمحتار ج ۵ ص ۲۷۳' مطبعہ عثمانیہ' استنبول' ۱۳۲۷ھ)

قرآن مجید پر نقطے اور اعراب لگانے کی تاریخ اور تحقیق

شروع میں جب قرآن مجید کو لکھا جاتا تھا تو قرآن مجید کے حروف پر نقطے نہیں لگائے جاتے تھے اور نہ حرکات' سکنات اور اعراب لگائے جاتے تھے اور نہ رموز و اوقاف تھے' کیونکہ اہل عرب اپنی زبان اور محاورہ کی مدد سے نقطوں اور حرکات' سکنات اور اعراب کے بغیر بالکل صحیح قرآن پڑھ لیتے تھے' اور نہ انہیں کسی فقرہ کو ملانے یا اس پر وقف کرنے کے لیے رموزِ اوقاف کی ضرورت تھی' وہ اہل زبان تھے اور ان تمام چیزوں سے مستغنی تھے' حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے جو مصحف تیار کرایا تھا' وہ بھی ان تمام چیزوں سے معرّی تھا' پھر جیسے جیسے اسلام پھیلتا گیا اور غیر عرب لوگ مسلمان ہوتے گئے اور وہ اہل زبان نہ ہونے کی وجہ سے قراءت میں غلطیاں کرنے لگے تو پھر قرآن مجید کی کتابت میں ان تمام چیزوں کا اہتمام اور التزام کیا گیا۔ سب سے پہلے قرآن مجید کے حروف پر نقطے لگائے گئے' پھر حرکات' سکنات اور اعراب لگائے گئے' پھر قرآن مجید کو صحیح پڑھنے کے لیے قراءت اور تجوید کے قواعد مقرر کیے گئے اور عام لوگوں کی سہولت کے لیے قرآن مجید کی آیتوں پر رموزِ اوقاف کو لکھا گیا۔

علامہ قرطبی لکھتے ہیں:

عبدالملک بن مروان نے مصحف کے حروف کو متشکل کرنے اور ان پر نقطے لگانے کا حکم دیا' اس نے اس کام کے لیے حجاج بن یوسف کو شہر واسط میں فارغ کر دیا' اس نے بہت کوشش سے اس کام کو انجام دیا اور اس میں احزاب کا اضافہ کیا' اس وقت حجاج عراق کا گورنر تھا۔ اس نے حسن اور یحییٰ ابن یعمر کے ذمہ یہ کام لگایا' اس کے بعد واسط میں ایک کتاب لکھی' جس میں قراءت کے متعلق مختلف روایات کو جمع کیا' بڑے عرصہ تک لوگ اس کتاب پر عمل کرتے رہے' حتیٰ کہ ابن مجاہد نے قراءت میں ایک کتاب لکھی۔

زبیدی نے کتاب الطبقات میں مبرد کے حوالے سے یہ لکھا ہے کہ جس شخص نے سب سے پہلے مصحف کے حروف پر نقطے لگائے' وہ ابوالاسود الدولی (متوفی ۶۹ ھ) ہیں اور یہ بھی ذکر کیا ہے کہ ابن سیرین کے پاس ایک مصحف تھا' جس پر یحییٰ ابن یعمر نے نقطے لگائے تھے۔

(تبیان القرآن) (الجامع لاحکام القرآن ج ۱ ص ۶۳ 'مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو' ایران' ۱۳۸۷ ھ)

علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں:

ابوالاسود الدولی وہ پہلے شخص ہیں' جنہوں نے سب سے پہلے علم نحو کو وضع کیا' حضرت علی رضی اللہ نے ان کو بتایا کہ کلام کی کل تین قسمیں ہیں: اسم' فعل اور حرف' اور فرمایا: اس پر تم قواعد تحریر کرو' ایک قول یہ ہے کہ ابوالاسود عراق کے گورنر' زیاد کے بچوں کو پڑھاتا تھا۔ ایک دن وہ زیاد کے پاس گیا اور کہا: اللہ امیر کی خیر کرے' میں دیکھتا ہوں کہ عربوں کے ساتھ بہ کثرت عجم مخلوط ہو گئے ہیں اور ان کی زبان متغیر ہو گئی ہے' کیا آپ مجھے اجازت دیتے ہیں کہ میں ان کے لیے ایسے قواعد تحریر کر دوں' جس کی بناء پر وہ درست طریقہ سے عربی بولیں؟ زیاد نے کہا: نہیں' پھر ایک دن ایک شخص نے کہا: ''توفی ابونا وترك بنين'' ہمارا باپ فوت ہو گیا اور اس نے بیٹے چھوڑے ہیں' گویا اس نے عربی زبان میں گرائمر کی غلطی کی۔ تب زیاد نے کہا: ابو الاسود کو بلاؤ' جب وہ آیا تو اس نے کہا: لوگوں کے لیے وہ قواعد تحریر کرو کہ جن سے میں نے پہلے منع کیا تھا۔

ایک قول یہ ہے کہ زیاد نے از خود ابوالاسود سے اس علم کی فرمائش کی' لیکن اس نے زیاد سے معذرت کر لی' پھر ایک دن ابوالاسود نے ایک شخص سے سنا' وہ سورۂ توبہ کی آیت غلط پڑھ

رہا ہے:

اَنَّ اللّٰهَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ وَرَسُوْلُهٗ. (التوبہ: ۳) اللہ اور اس کا رسول مشرکوں سے بیزار ہیں۔

اس آیت میں ''رسوله'' میں رسول پر پیش ہے' وہ شخص زیر پڑھ رہا تھا اور اس سے یہ معنی ہو جاتا ہے: اللہ مشرکوں اور اپنے رسول سے بیزار ہے۔ العیاذ باللہ! تب ابوالاسود زیاد کے پاس گیا اور کہا: میں اب عربی قواعد لکھنے پر تیار ہوں' اس وقت ابوالاسود نے زبر کی علامت حرف کے اوپر ایک نقطہ قرار دی اور پیش کی علامت حرف کے سامنے ایک نقطہ قرار دیا اور زیر کی علامت حرف کے نیچے ایک نقطہ قرار دی۔ ابوالاسود ۶۹ ھ میں بصرہ میں طاعون کی بیماری میں فوت ہوا' اس کی عمر ۸۵ سال تھی۔ (وفیات الاعیان ج ۲ ص ۵۳۹۔۵۳۵)

علامہ زرقانی لکھتے ہیں:

ایک عرصہ تک حرکات اور اعراب کے لیے یہ علامات رائج رہیں' لیکن چونکہ ان علامات کا نقطوں کے ساتھ اشتباہ تھا' اس لیے پھر زبر زیر اور پیش کے لیے' اس طرح کی علامات مقرر کر دی گئیں۔ (مناہل العرفان ج ۱ ص ۴۰۱' بیروت)

عبدالملک بن مروان ۶۶ ھ میں سریر آرائے سلطنت ہوا اور ۸۶ ھ میں فوت ہوا' اور ابو الاسود ۶۹ ھ میں فوت ہوا' اس کا مطلب یہ ہے کہ ۶۶ ھ اور ۶۹ ھ کے درمیان قرآن مجید پر نقطے اور اعراب لگائے گئے۔

قرآن مجید پر رموز اور اوقاف لگانے کی تاریخ کی تحقیق

قرآن مجید کو صحیح پڑھنے کے لیے ضروری ہے کہ وقف اور وصل کا صحیح علم حاصل کیا جائے' یعنی کس جملہ کو دوسرے جملہ یا کس لفظ کو دوسرے لفظ کے ساتھ ملا کر پڑھنا ہے یا کس جملہ اور لفظ کو دوسرے جملہ اور لفظ سے جدا کر کے پڑھنا ہے' اردو میں اس کی مثال ہے (روکو' مت جانے دو) اگر روکو پر وقف کر لیا جائے تو اس کا معنی روکنا ہے اور روکو مت پر وقف کر کے جانے دو پڑھا جائے تو اس کا معنی نہ روکنا ہے' قرآن مجید سے اس کی حسب ذیل دو واضح مثالیں ہم پیش کر رہے ہیں:

وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ اور اس کی (آیات متشابہات کی)

وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ. (آل عمران: ۷) تاویل کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور جو لوگ علم میں پختہ ہیں' وہ کہتے ہیں: ہم اس پر ایمان لاتے ہیں۔

اس آیت میں اگر ''اِلَّا اللّٰہ'' پر وقف کیا جائے تو یہی معنی ہوگا' جو ہم نے لکھا ہے اور اگر ''وَالرَّاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ'' پر وقف کیا جائے تو معنی بدل جائے گا اور اب یوں معنی ہوگا: آیات متشابہات کی تاویل کو اللہ اور علماء راسخین کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ O اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ. (التوبہ: ۲۰-۱۹) اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا' جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔

اس آیت میں اگر ''القوم الظالمین'' پر وقف کیا جائے تو یہی معنی ہوگا' جو ہم نے لکھا ہے اور اگر اس پر وقف نہ کیا اور اس کو دوسری آیت کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو پھر یہ معنی ہو گا: اللہ ان ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا جو ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کیا اور ایسے لوگوں کو ظالم کہنا' قرآن مجید کی بہت ساری آیتوں کی تکذیب ہے اور قرآن مجید میں صحیح جگہ پر وقف نہ کرنا' قرآن مجید کے معنی اور منشا کو بدل دیتا ہے اور بعض اوقات کفر تک پہنچا دیتا ہے۔

اہل عرب اپنی زبان دانی کی وجہ سے جس طرح بغیر اعراب کے قرآن مجید کو صحیح پڑھنے پر قادر تھے۔ اسی طرح وہ قرآن مجید کو پڑھتے وقت صحیح جگہ پر وقف کرتے تھے اور ان سے معنی میں کوئی غلطی واقع نہیں ہوتی تھی' لیکن جب اسلام کا پیغام عرب کے باہر پہنچا اور عربی زبان سے ناواقف لوگوں نے قرآن مجید کو پڑھنا شروع کیا تو معانی سے لاعلمی کی وجہ سے وہ غلط جگہ پر وقف کرنے لگے' اس لیے اس وقت کے علماء نے قرآن مجید کی آیات پر رموز اوقاف لگانے کی ضرورت محسوس کی۔ سب سے پہلے اس موضوع پر امام احمد بن یحییٰ الثعلب النحوی المتوفی ۲۹۱ھ نے کتاب الوقف والابتداء کے نام سے کتاب لکھی۔ اس طرح تیسری صدی ہجری میں قرآن مجید کی آیات پر رموز اوقاف لگائے گئے۔

قرآن مجید کی آیات پر وقف کرنے کی اصل یہ حدیث ہے:

امام طحاوی رحمہ اللہ تعالیٰ روایت کرتے ہیں:

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ایک بڑے عرصہ تک ہمارا یہ معمول رہا کہ ہم میں سے کوئی شخص قرآن پڑھنے سے پہلے ایمان لے آتا تھا' سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کوئی سورت نازل ہوتی' ہم اس سورت کے حلال اور حرام کا علم حاصل کرتے اور اس چیز کا علم حاصل کرتے کہ اس سورت میں کہاں کہاں وقف کرنا چاہیے' جس طرح تم آج کل قرآن کا علم حاصل کرتے ہو اور اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ لوگ ایمان لانے سے پہلے قرآن کو پڑھ لیتے ہیں' سورۂ فاتحہ سے لے کر آخر تک قرآن پڑھتے ہیں اور ان میں سے کسی کو یہ پتا نہیں ہوتا کہ قرآن نے کس چیز کا حکم دیا ہے اور کس چیز سے منع کیا ہے اور نہ اس کو یہ پتا ہوتا ہے کہ قرآن کی آیتوں میں کس کس جگہ وقف کرنا چاہیے۔

(شرح مشکل الآثار ج ۴ ص ۸۵' مطبوعہ بیروت' ۱۴۱۵ھ)

وقف کی پانچ مشہور اقسام ہیں

وقف لازم' وقف مطلق' وقف جائز' المرخص بوجہ اور المرخص ضرورۃ' ان کی تعریفات اور مثالیں حسب ذیل ہیں:

وقف لازم: اس کو کہتے ہیں کہ اگر اس جگہ وقف نہ کیا جائے اور ملا کر پڑھا جائے تو ایسا بھی لازم آئے گا' جو اللہ کی مراد نہیں ہے۔ اس کی مثال یہ ہے:

وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ O یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ. (البقرہ: ۹-۸) (وہ منافق) مومن نہیں ہیں O وہ اللہ کو دھوکا دیتے ہیں۔

اگر اس جگہ ''بمومنین'' پر وقف نہ کیا جائے اور اس کو ''یخدعون اللہ'' کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو یہ معنی ہوگا: وہ منافق ایسے مومن نہیں ہیں جو اللہ کو دھوکا دیں' حالانکہ مراد یہ ہے کہ وہ مطلقاً مومن نہیں ہیں۔

وقف مطلق: وہ ہے جس کو ملائے بغیر ابتداءً پڑھنا مستحسن ہو اس کی مثال یہ ہے:

وَلَیُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا. یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِکُوْنَ بِیْ شَیْئًا. (النور: ۵۵) اللہ ان کے خوف کے بعد ان کی حالت کو ضرور امن سے بدل دے گا وہ میری عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی کو

شریک نہیں قرار دیں گے۔

پہلے جملہ میں اللہ تعالیٰ کے فعل کا بیان ہے اور دوسرے جملہ میں بندوں کے فعل کا بیان ہے' اس لیے ان دونوں جملوں کو ملائے بغیر الگ الگ پڑھنا مستحسن ہے۔

وقف جائز: وہ ہے جس میں ایک جملہ کو دوسرے جملہ سے ملا کر پڑھنا اور پہلے جملہ پر وقف کر کے دوسرے کو ابتداءً پڑھنا دونوں طرح جائز ہو' اس کی مثال یہ آیت ہے:

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْ لَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ. (یوسف:۲۴)

اور بے شک عورت نے اس کا ارادہ کیا اور وہ بھی اس کا ارادہ کرتا اگر اپنے رب کی دلیل نہ دیکھ لیتا۔

اگر "ھم بھا" پر وقف کیا جائے تو معنی اس طرح ہوگا: عزیز مصر کی عورت نے یوسف کے ساتھ برے فعل کا قصد کیا اور یوسف نے اس عورت سے اجتناب کا قصد کیا' اگر یوسف نے زنا کی برائی پر اپنے رب کی برہان کا مشاہدہ نہ کیا ہوتا تو وہ اس برائی میں مبتلا ہو جاتے اور اگر "ھم بھا" کے بعد والے جملہ سے ملا کر پڑھا جائے تو معنی اس طرح ہوگا:

عزیز مصر کی عورت نے یوسف کے ساتھ برے فعل کا قصد کیا' اگر یوسف نے اس فعل کی برائی پر اللہ کی برہان کا مشاہدہ نہ کیا ہوتا تو وہ بھی اس عورت کے ساتھ بُرے فعل کا قصد کر لیتے۔

واضح رہے کہ "هَمّ" کا درجہ عزم سے کم ہوتا ہے' "هَمّ" کا معنی ہے: کسی فعل کا قصد کیا جائے اور اس میں اس فعل کو نہ کرنے کا بھی پہلو ہو' اور عزم کا معنی ہے: کسی فعل کو کرنے کا پختہ قصد ہو اور اس میں اس فعل کو نہ کرنے کا پہلو بالکل نہ ہو (اس کی وضاحت "لَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ" (البقرہ:۲۳۵) کے تحت تفسیر التبیان ج ا ص ۱۰۷۵ میں ملاحظہ فرمائیے)۔

المرخص بوجہ: جس میں ایک وجہ سے وقف کرنا اور دوسری وجہ سے ملا کر پڑھنا جائز ہو' اس کی مثال یہ آیت ہے:

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ. (البقرہ:۸۶)

یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی خریدی تھی' سو ان کے عذاب میں تخفیف نہیں کی جائے گی۔

"فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ" پہلے جملے کے لیے بہ منزلہ سبب اور جزاء ہے اور اس کا تقاضا ملا کر پڑھنا ہے اور لفظ فاء ابتداء کو چاہتا ہے' اس لیے پہلے جملہ پر وقف کر کے "فلا یخفف" سے ابتداءً پڑھنا بھی جائز ہے۔

المرخص ضرورۃ: جو لفظ یا جو جملہ پہلے لفظ یا جملہ سے مستغنی نہ ہو اور اس میں اصل ملا کر پڑھنا' لیکن مسلسل پڑھنے کی وجہ سے انسان کا سانس ٹوٹ جائے اور وہ ملا کر پڑھنے کی بجائے ٹھہر جائے تو اس کی اجازت ہے اور دوبارہ ملا کر پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے' اس کی مثال یہ آیت ہے:

اَلَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً. (البقرہ:۲۲)

جس ذات نے تمہارے لیے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت بنایا اور آسمان سے پانی اتارا۔

"اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ" میں "انزل" کی ضمیر "الذی" کی طرف لوٹ رہی ہے' اس لیے یہ جملہ پہلے جملہ سے مستغنی نہیں ہے اور ان کو ملا کر پڑھنا چاہیے' لیکن اگر طول کلام کی وجہ سے پڑھنے والے کا سانس ٹوٹ جائے اور وہ "والسماء بناء" پر وقف کرے تو اس کو اجازت ہے' کیونکہ "والسماء بناء" کو الگ پڑھنے سے بھی اس کا معنی سمجھ میں آ جاتا ہے۔

جس جگہ ملا کر پڑھنا ضروری ہے اور وقف کرنا جائز نہیں ہے' یہ وہ کلام ہے جو شرط اور جزاء پر مشتمل ہو' شرط اور جزاء کو ملا کر پڑھنا ضروری ہے اور شرط پر وقف کرنا جائز نہیں ہے یا کلام مبتداء اور خبر پر مشتمل ہو تو مبتداء پر وقف کرنا صحیح نہیں ہے' اسی طرح موصوف اور صفت کو ملا کر پڑھنا چاہیے اور موصوف پر وقف نہ کیا جائے' اس کی مثال یہ ہے:

وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ○ اَلَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ. (البقرہ:۲۷-۲۶)

اور اللہ صرف فاسقوں کو گمراہ کرتا ہے ○ جو اللہ کے عہد کو پکا کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں۔

اس آیت میں "اَلَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ" "الْفٰسِقِيْنَ" کی صفت ہے۔ اس لیے ان کو ملا کر پڑھا جائے۔

رموز اوقاف کی تفصیل حسب ذیل ہے:

م: وقف لازم

ط: وقف مطلق

سکتہ: اس طرح ٹھہرا جائے کہ سانس نہ ٹوٹے' پورے قرآن مجید میں صرف سات جگہ یہ علامت ہے' مذکورۃ الصدر علامات پر وقف کرنا ضروری ہے۔

لا: جب ۵ اور O کے بغیر ''لا'' ہو تو ملا کر پڑھنا ضروری ہے۔ اس کی مثال یہ آیت ہے:

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا. (البقرہ:۸۹)

اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے کتاب آ گئی' جو اس کی تصدیق کرنے والی ہے جو ان کے پاس (اصلی آسمانی کتاب) ہے حالانکہ وہ (یہود) اس سے پہلے (اس کتاب اور صاحب کتاب کے وسیلہ سے) کفار کے خلاف فتح کی دعا کرتے تھے۔

''وکانوا من قبل'' کا جملہ' سابقہ جملہ کی ''ھم'' ضمیر سے حال واقع ہو رہا ہے اور حال اور ذوالحال میں فصل نہیں ہوتا' اس لیے یہاں ملا کر پڑھنا ضروری ہے۔

حسب ذیل مقامات پر وصل کر کے پڑھنا اولیٰ ہے:

ز: وقف مجوز

ج: وقف جائز و مجوز

ق: وقف کا قول ضعیف ہے

صلی: وصل کر کے پڑھنا اولیٰ ہے اور جہاں وقف لکھا ہو' اس کا معنی ہے: وقف کرنا اولیٰ ہے

صل: ملاؤ

۵: اس کا مطلب ہے اس کے وقف یا وصل میں اختلاف ہے

O: وقف اور وصل دونوں جائز ہیں

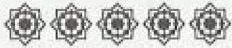
ج: وقف کرنا جائز ہے

ص: وقف کی رخصت ہے۔

قرآن مجید میں جب ایک مضمون ختم ہو جاتا ہے تو وہاں رکوع کی علامت ''ع'' لکھی

ہوتی ہے' قرآن مجید میں کل ۵۵۸ رکوع ہیں' یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس کی ابتداء کب اور کیسے ہوئی۔ قرآن مجید میں سورتوں کے اسماء اور آیتوں کی تعداد لکھنے کا بھی رواج نہیں تھا۔ حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ ہمارے زمانہ میں اس کا بہ کثرت رواج ہے اور علماء سلف کی اتباع کرنا اولیٰ ہے۔ (تفسیر القرآن ج ۷ ص ۴۵۱' مطبوعہ ادارہ اندلس' بیروت' ۱۳۸۵ھ)

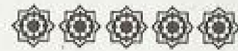
فتاویٰ عالم گیری میں مذکور ہے: قرآن مجید میں سورتوں کے اسماء اور آیتوں کی تعداد لکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ہر چند کہ یہ ایک نیا کام ہے' لیکن یہ بدعت حسنہ ہے اور کتنے ہی کام نئے ہیں اور بدعت حسنہ ہیں اور کتنی چیزوں کا حکم زمان اور مکان کے اختلاف سے مختلف ہو جاتا ہے۔ (فتاویٰ عالمگیری ج ۵ ص ۳۲۳' مطبوعہ بولاق' مصر' ۱۳۱۰ھ)

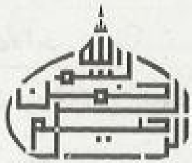


مضامین قرآن کا خاکہ ایک نظر میں

نمبر	مضمون	تعداد
۱	قرآن مجید کے پارے	۳۰
۲	قرآن مجید کی سورتیں	۱۱۴
۳	قرآن مجید کی آیتیں ابن عباس کی روایت کے مطابق	۶۶۱۶
۴	امر	۱۰۰۰
۵	نہی	۱۰۰۰
۶	وعد	۱۰۰۰
۷	وعید	۱۰۰۰
۸	قصص واخبار	۱۰۰۰
۹	عبر وامثال	۱۰۰۰
۱۰	حرام وحلال	۵۰۰
۱۱	دعا	۱۰۰
۱۲	منسوخ الحکم آیات (باعتبار شہرت)	۱۲

(تبیان القرآن ج ۱' مطبوعہ فرید بک سٹال' لاہور)





مکی اور مدنی سورتوں کی شناخت

مکی اور مدنی آیات اور سورتوں کے بارے میں (اہل علم) لوگوں کی تین اصطلاحیں ہیں۔ جن میں سے زیادہ مشہور اصطلاح یہ ہے کہ قرآن مجید کا جو حصہ ہجرت نبوی سے پہلے نازل ہوا' وہ مکی ہے اور ہجرت کے بعد جس قدر قرآن نازل ہوا (وہ مدنی ہے) خواہ مکہ میں ہوا ہو یا مدینہ منورہ میں' فتح مکہ کے موقع پر ہو یا حجۃ الوداع کے موقع پر یا کسی سفر کے دوران میں اس کا نزول ہوا' وہ تمام سورتوں میں مدنی کہلائے گا۔

دوسری اصطلاح یہ ہے کہ مکی اس کو کہتے ہیں' جو مکہ میں نازل ہوئی خواہ ہجرت کے بعد ہی اس کا نزول کیوں نہ ہوا ہو۔

اور مدنی وہ ہے جس کا نزول مدینہ طیبہ میں ہوا۔ اس اصطلاح کے اعتبار سے ایک واسطہ ثابت ہوگیا کہ سفر کی حالتوں میں نازل ہونے والے حصہ پر مکی کا اطلاق ہوگا اور نہ مدنی کا۔

اور تیسری اصطلاح یہ ہے کہ مکی وہ سورت یا آیت ہے' جس میں اہل مکہ سے خطاب ہے اور مدنی وہ ہے' جس کے مخاطب اہل مدینہ ٹھہرے۔

قاضی ابوبکر اپنی کتاب ''انتصار'' میں لکھتے ہیں: مکی اور مدنی کی معرفت میں صرف صحابہ کرام اور تابعین (رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین) کے بیان کو ہی مدار بنایا جا سکتا ہے۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس کے بارے میں کوئی قول وارد نہیں ہوا۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم من جانب اللہ اس پر مامور نہ تھے اور نہ اللہ تعالیٰ نے اس چیز کا علم امت کے فرائض سے قرار دیا ہے۔

اور اگر قرآن مجید کے بعض حصوں کے متعلق علماء پر یہ معلوم کرنا واجب ہے کہ ان میں سے ناسخ کون ہے اور منسوخ کون؟ تو یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صریح ارشاد کے علاوہ اور

ذرائع سے معلوم کی جاسکتی ہے۔

مکی اور مدنی کی شناخت کے فوائد

مکی اور مدنی کی معرفت کے بہت فوائد ہیں' ان میں سے ایک فائدہ یہ ہے کہ اس سے ناسخ اور منسوخ کا علم حاصل ہوجاتا ہے۔

اور دوسرا فائدہ یہ ہے کہ نزول کے اعتبار سے قرآن کی ترتیب اور آیات کے متاخر و متقدم ہونے کا علم حاصل ہوجاتا ہے اور بعض صحابہ جن میں سے حضرت علی' عبداللہ بن مسعود اور ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین سرفہرست ہیں' اس چیز (مکی اور مدنی کی شناخت) کو بہت اہمیت دیتے تھے۔

مکی اور مدنی کی علامات

علماء کرام نے مکی اور مدنی سورتوں کی پہچان کے سلسلے میں کچھ علامات ذکر کی ہیں' ان میں سے بعض درج ذیل ہیں:

ایک علامت یہ ہے کہ جس سورت میں ''یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ'' کے الفاظ کے ساتھ خطاب ہوا اور ''یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا'' کے ساتھ نہ ہو' وہ مکی ہے (البتہ سورت حج میں اختلاف ہے)۔

دوسری علامت یہ ہے کہ جس سورت میں ''کَلَّا'' وارد ہوا ہے' وہ مکی ہے۔

اور تیسری علامت یہ ہے کہ جس سورت میں حضرت آدم علیہ السلام اور ابلیس کا ذکر ہو' وہ مکی ہے سوائے سورت بقرہ کے۔

اور چوتھی علامت یہ ہے کہ جس سورت میں منافقین کا ذکر ہو' وہ مدنی ہے۔ البتہ سورت عنکبوت اس سے مستثنیٰ ہے۔

اور ہشام بن عروہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں' انہوں نے بیان کیا ہے کہ جس سورت میں حدود اور فرائض کا ذکر ہے وہ مدنی ہے اور جن سورتوں میں قرون سابقہ کا ذکر ہے' وہ مکی ہیں۔

فائدہ: قرآن مجید کی کل ایک سو چودہ سورتیں ہیں' جن میں سے انتیس سورتیں مدینہ منورہ میں نازل ہوئی ہیں اور باقی پچاسی سورتیں مکہ میں نازل ہوئی ہیں۔

مدینہ منورہ میں نازل ہونے والی سورتیں یہ ہیں

سورت بقرہ' آل عمران' سورت النساء' سورت المائدہ' الانفال' التوبہ' الرعد' الحج' النور' الاحزاب' سورہ محمد' سورہ فتح' سورہ حجرات' سورہ حدید' سورہ مجادلہ' سورہ حشر' سورہ ممتحنہ' سورہ صف' سورہ جمعہ' سورہ منافقون' سورہ تغابن' سورہ طلاق' سورہ تحریم' سورہ قیامہ' سورۃ زلزال' سورہ قدر' سورہ نصر' سورہ فلق' سورہ ناس۔

ان مدنی سورتوں کے علاوہ باقی تمام سورتیں مکی ہیں۔

حضری اور سفری آیات اور سورتوں کا بیان

حضری: وہ آیات جن کا نزول شہر میں ہوا۔

سفری: وہ آیات جو سفر میں اتریں۔

مثالیں: حضری آیات یعنی وہ آیتیں جو رسول اللہ ﷺ کے مکہ یا مدینہ قیام کی حالت میں اتریں' ان کی مثالیں چونکہ اصل ہونے کے اعتبار سے بہ کثرت موجود ہیں' لہٰذا توضیح کے لیے ان کی مثال پیش کرنے کی حاجت نہیں ہے' البتہ سفری آیات کی مثالیں ذکر کی جاتی ہیں' جو حسب ذیل ہیں۔

سفری آیات اور سورتیں یعنی وہ جو مکہ اور مدینہ کے علاوہ رسول کریم ﷺ پر کسی سفر کے دوران نازل ہوئیں' ان میں سے ایک سورت المائدہ میں واقع آیت تیمم ہے' جس کی ابتداء ''یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ'' (الایۃ) سے ہوتی ہے' سورہ المائدہ:٦: ''اے ایمان والو! جب نماز کے لیے (کھڑے) ہونے کا (تمہارا ارادہ) ہو' یہ آیت ذوالحلیفہ کے مضافات میں ''ذات الجیش'' کے مقام پر نازل ہوئی اور ایک قول کے مطابق البیداء جو ذوالحلیفہ ہی کا نام ہے' کے مقام پر اتری اور یہ مقام مدینہ کے قریب مکہ سے آتے ہوئے راستہ میں پڑتا ہے۔ بہرصورت اس آیت کا نزول غزوہ ''المریسیع'' سے واپسی پر اس وقت ہوا' جب لوگ مدینہ منورہ میں داخل ہورہے تھے۔ صحیح روایت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اسی طرح مروی ہے۔

دوسری مثال سورہ الفتح ہے' حاکم نے روایت کیا ہے کہ سورہ الفتح کا نزول مقام ''کراع الغمیم'' میں ہوا تھا' یہ ایک وادی کا نام ہے' اس وادی اور مدینہ کے درمیان ایک سو ستر میل کا

فاصلہ ہے' جب کہ مکہ سے تقریباً تیس میل اور عسفان سے تین میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔

تنبیہ تقسیم نزول قرآن

مکان کے اعتبار سے قسمیں: مکان کے اعتبار سے نزول قرآن کی حسب ذیل قسمیں ہیں: مکی' مدنی' حضری اور سفری

زمان کے اعتبار سے قسمیں: زمانہ کے اعتبار سے آیات اور سورتوں کی قسمیں درج ذیل ہیں: لیلی' نہاری' صیفی' شتائی۔

لیلی : جو رات میں نازل ہوئیں۔

نہاری : جو دن میں اتریں۔

صیفی : جو موسم گرما میں اتریں۔

شتائی : جن کا نزول سردیوں میں ہوا۔

مثالیں : نہاری کے امثلہ اصل ہونے کے ناطے بے شمار ہیں' جو محتاج بیان نہیں۔ لیلی کی مثالیں ذکر کی جاتی ہیں۔ چنانچہ ان میں ایک آیت تحویل قبلہ ہے۔

صیفی کی مثال: آیت کلالہ ہے: ''یَسْتَفْتُوْنَكَ قُلِ اللّٰهُ یُفْتِیْكُمْ فِی الْكَلٰلَةِ (الخ)'' (سورہ النساء:۱۷۶) ''اے محبوب! تم سے فتویٰ پوچھتے ہیں تم فرمادو کہ اللہ تمہیں کلالہ میں فتویٰ دیتا ہے''۔ اس آیت کے بارے میں صحیح مسلم میں ہے: حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے اس کا نام آیت صیف رکھا ہے۔

شتائی کی مثال: سورہ النور میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ''اِنَّ الَّذِیْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ'' (النور:۱۱) ''بے شک وہ کہ یہ بڑا بہتان لائے ہیں''۔ اللہ تعالیٰ کے قول ''وَّرِزْقٌ كَرِیْمٌ'' (النور:۲۶) ''عزت کی روزی'' تک۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے' انہوں نے بیان کیا ہے کہ یہ موسم سرما میں نازل ہوئی۔

(۱) النساء:۱۷۶: آپ سے حکم پوچھتے ہیں' فرمادیجئے اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کلالہ (کی میراث میں)۔

(۲) سورہ النور:۱۱: بے شک جو لوگ (ام المومنین صدیقہ پر) کھلا بہتان لائے۔

سب سے پہلے قرآن مجید کا کون سا حصہ نازل ہوا

قرآن مجید کے سب سے پہلے نازل ہونے والے حصہ کے بارے میں مختلف اقوال ہیں' ان میں سے پہلا قول اور یہی صحیح ہے کہ سب سے پہلے ''اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ'' (العلق:۱) نازل ہوئی۔ امام بخاری' مسلم اور دیگر محدثین نے ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا' آپ بیان فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ پر وحی کی ابتداء سچے خوابوں سے ہوئی' حضور ﷺ جو خواب دیکھتے' اس کی تعبیر روشن صبح کی طرح ظاہر ہو جاتی۔

پھر حضور ﷺ کے دل میں تنہائی کی محبت پیدا کی گئی اور حضور ﷺ غار حراء میں جا کر تنہائی میں عبادت کرنے لگے' کئی کئی دن غار میں رہتے اور جتنے دن وہاں رہنے کا ارادہ ہوتا' اتنے دنوں کا سامان خورد و نوش ساتھ لے جاتے (جب کھانے پینے کی چیزیں ختم ہو جاتیں) تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس آ کر اور چیزیں لے جاتے' اسی دوران غار حرا میں' اچانک آپ ﷺ پر وحی نازل ہوئی' فرشتے نے آ کر آپ ﷺ سے کہا: ''اقراء'' (پڑھئے)' آپ نے فرمایا: ''میں پڑھنے والا نہیں ہوں''' حضور ﷺ نے بتلایا کہ پھر فرشتہ نے زور سے گلے لگا کر مجھے تھکا دیا' پھر مجھے چھوڑ کر کہا: پڑھئے' میں نے کہا: میں پڑھنے والا نہیں ہوں' حضور فرماتے ہیں کہ فرشتہ دوبارہ مجھے پکڑ کر بغل گیر ہوا' حتیٰ کہ مجھے تھکا دیا' پھر مجھے چھوڑ کر کہا: پڑھئے' میں نے کہا: میں پڑھنے والا نہیں ہوں' حضور فرماتے ہیں: فرشتہ تیسری بار مجھے پکڑ کر بغل گیر ہوا' حتیٰ کہ مجھے تھکا دیا' پھر مجھے چھوڑ کر کہا:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ O خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ O اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ O الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ O عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ O (العلق:۱ تا ۵)

اپنے رب کے نام سے پڑھئے جو خالق ہے O جس نے انسان کو گوشت کے لوتھڑے سے پیدا کیا O پڑھئے' آپ کا رب سب سے زیادہ کریم ہے O جس نے قلم سے لکھنا سکھایا O اور انسان کو وہ باتیں بتائیں جو وہ نہیں جانتا تھا O

دوسرا قول یہ ہے کہ سب سے پہلے سورہ "یٰٓاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ" (المدثر:۱) نازل ہوئی۔ شیخین نے ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن سے روایت کی ہے ابوسلمہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت جابر بن عبداللہ (رضی اللہ عنہ) سے پوچھا کہ قرآن کا کون سا حصہ پہلے نازل ہوا؟ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "یٰٓاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ"، میں نے کہا: یا "اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ" یہ سن کر حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں تم سے وہ بات بیان کرتا ہوں جو رسول اللہ ﷺ نے ہم سے بیان فرمائی تھی حضور ﷺ نے فرمایا: میں غار حراء میں عبادت کے لیے خلوت نشین ہوا تھا جب میں نے یہ مدت پوری کر لی تو میں وادی کے دامن میں چلا گیا (اچانک کسی نے مجھے آواز دی) میں نے آگے پیچھے دائیں بائیں دیکھا (مجھے کوئی نظر نہ آیا) پھر میں نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی تو اچانک مجھے جبرائیل علیہ السلام نظر آئے جس سے مجھ پر کپکپی طاری ہوگئی اور میں خدیجہ (رضی اللہ عنہا) کے پاس آیا اور میں نے کہا: مجھے کپڑے اوڑھاؤ اہل خانہ نے مجھے کپڑے اوڑھائے اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

یٰٓاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ○ قُمْ فَاَنْذِرْ○ اے کپڑا اوڑھنے والے○ اٹھو! اور لوگوں کو ڈراؤ○ (المدثر: ۲-۱)

علماء نے اس تعارض کے کئی جواب دیے ہیں۔

زیادہ مشہور جواب یہ ہے کہ (حدیث جابر میں) یہاں اولیت سے حکم انذار (عذاب خداوندی سے ڈرانے) کی خاص اولیت مراد ہے بعض لوگوں نے اس کی تعبیر اس طرح بھی کی ہے کہ "نبوت" کے بارے میں سب سے پہلے "اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ" نازل ہوئی ہے اور "رسالت" کے لیے سب سے پہلے "یٰٓاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ" نازل ہوئی ہے اور یہ قوی اور عمدہ جواب ہے۔

بعض حضرات نے اس تعارض کا یہ جواب دیا ہے کہ سائل کا سوال کامل سورت کے نازل ہونے کے بارے میں تھا۔ لہٰذا حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ پہلے پہل جو سورہ مکمل نازل ہوئی وہ سورہ المدثر تھی اور اس وقت تک سورہ "اقراء" مکمل نازل نہیں ہوئی تھی کیونکہ سورہ "اقراء" میں سب سے پہلے اس کا ابتدائی حصہ نازل ہوا ہے (لہٰذا سورہ مدثر کی اولیت مطلقاً اقراء کی اولیت کے معارض نہ ہوئی) اس قول کی تائید خود حضرت جابر کی ایک

اور روایت سے ہوتی ہے۔ جس کو امام بخاری اور مسلم نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ وحی رک جانے کے زمانہ کا تذکرہ فرمارہے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میں جارہا تھا اچانک میں نے ایک آواز سنی میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو وہی فرشتہ جو میرے پاس غار حراء میں آیا تھا وہ آسمان اور زمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ میں خوف زدہ ہوگیا اور گھر واپس پہنچا اور میں نے اہل خانہ سے کہا: مجھے کپڑا اوڑھاؤ مجھے کپڑا اوڑھاؤ انہوں نے مجھے کپڑے اوڑھائے اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: "یٰٓاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ"، "اے بالاپوش اوڑھنے والے!"۔

اس لیے رسول اکرم ﷺ کا قول کہ "وہ فرشتہ جو غار حراء میں میرے پاس آیا تھا" اس بات پر صریح دلالت کرتا ہے کہ یہ قصہ بعد میں واقع ہوا اور غار حراء کا واقعہ جس میں "اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ"، "پڑھو اپنے رب کے نام سے" کا نزول ہوا ہے پہلے کا واقعہ ہے۔ مصنف کہتا ہے کہ یہ جواب اس باب میں دلیل کے حوالہ سے زیادہ درست ہے۔

اور بعض نے یہ جواب دیا ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے یہ بات قیاس سے کہی ہے رسول کریم ﷺ سے روایت نہیں ہے اس لیے ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی بات پر مقدم ہے اور یہ تمام جوابات میں خوبصورت جواب ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ سب سے پہلے "سورہ الفاتحہ" نازل ہوئی اس کی دلیل وہ حدیث ہے جس کو امام بیہقی نے کتاب الدلائل میں روایت کیا ہے لیکن علماء نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ حدیث مرسل ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس میں "سورہ الفاتحہ" کے "اقراء" کی سورت کے نزول کے بعد نازل ہونے کی خبر دی گئی ہو۔

چوتھا قول یہ ہے کہ سب سے پہلے "بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" نازل ہوئی ہے۔

لیکن علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ اس کو ایک مستقل قول قرار دینا صحیح نہیں اس لیے کہ کسی سورت کے نازل ہونے کے وقت یہ بات بھی ضروری ہے کہ بسم اللہ اس کے ساتھ ہی نازل ہو۔

سب سے پہلے نازل ہونے والی آیات کے بارے اور اقوال بھی ہیں لیکن سند کے اعتبار سے ان میں ثبوت ہم نہیں پہنچتا اور اگر ان کی سند فراہم ہو جاتی ہے تو پھر اس کی تاویل

یوں کی جائے گی کہ اس میں لفظ ''من'' مقدر ہے' تقدیر عبارت اس طرح ہوگی کہ ''من اول ما نزل''۔

اوائل مخصوصہ

(یعنی وہ آیات جو خاص خاص معاملات کے بارے میں سب سے پہلے نازل ہوئی ہیں)

(۱) مکہ معظمہ میں سب سے پہلے جو سورت نازل ہوئی' وہ ''اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ'' (العلق:۱) ''پڑھو اپنے رب کے نام سے'' ہے اور مدینہ طیبہ میں سب سے پہلے نازل ہونے والی سورت ''البقرہ'' ہے اور بعض نے کہا: ''وَیْلٌ لِّلْمُطَفِّفِیْنَ'' (المطففین:۱) ''ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لیے شدید عذاب ہے'' ہے۔

(۲) اور سب سے آخری سورت مکہ میں نازل ہونے والی ''سورہ المومنون'' ہے اور مدینہ میں سب سے آخر میں ''سورہ براۃ'' نازل ہوئی ہے۔

(۳) جنگ کی اجازت میں سب سے پہلے جو آیت کریمہ نازل ہوئی' وہ ''اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا'' (الحج:۳۹) ''پروانگی عطا ہوئی انہیں جن سے کافر لڑتے ہیں ان بناء پر کہ ان پر ظلم ہوا'' ہے۔

(۴) شراب کے بارے میں سب سے پہلے سورہ بقرہ کی آیت (نمبر:۲۱۹) نازل ہوئی' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ'' (البقرہ:۲۱۹) ''لوگ آپ سے شراب اور جوئے کے متعلق پوچھتے ہیں''۔

(۵) امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کی ہے کہ سب سے پہلے جس سورت میں آیت سجدہ نازل ہوئی' وہ ''النجم'' ہے۔

(۶) کھانوں کے بارے میں سب سے پہلے مکہ میں (سورہ الانعام کی آیت:۱۴۵) ''قُلْ لَّا اَجِدُ فِیْ مَا اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا'' نازل ہوئی'' فرمادیجئے میں نہیں پاتا' اس وحی میں جو میری طرف کی گئی کوئی حرام کی گئی چیز جو وہ کھائے'' اور مدینہ منورہ میں پہلے سورہ البقرہ کی آیت (نمبر:۱۷۳) ''اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیْکُمُ الْمَیْتَةَ'' کا نزول ہوا'' اس کے سوا

کچھ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر حرام کیا مردار''۔

سب سے آخر میں کون سا حصہ نازل ہوا؟

(۱) قرآن مجید میں سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیت کون سی ہے؟ اس میں علماء کا اختلاف ہے' زیادہ مشہور قول یہ ہے کہ سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیت ''یَسْتَفْتُوْنَکَ قُلِ اللّٰهُ یُفْتِیْکُمْ فِی الْکَلٰلَةِ'' (النساء:۱۷۶) ہے۔ (صحیح بخاری ومسلم) ''آپ سے حکم پوچھتے ہیں' فرمادیجئے اللہ تمہیں حکم دیتا ہے' کلالہ (کی میراث میں)''

(۲) امام بخاری حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ سب سے آخر میں جس آیت کا نزول ہوا' وہ آیت ''ربوا'' ہے اور آیت ''ربوا'' سے اللہ تعالیٰ کا یہ قول ''یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوا'' مراد ہے (البقرہ:۲۷۸) ''اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور چھوڑ دو جو باقی رہ گیا ہے سود میں سے''۔

(۳) اور ایک قول یہ بھی ہے کہ سب سے آخر میں آیت ''وَاتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْهِ اِلَی اللّٰهِ'' (البقرہ:۲۸۱) نازل ہوئی'' اور اس دن سے ڈرو جس دن تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے''۔

(۴) سعید ابن المسیب بیان کرتے ہیں کہ ''آیت دین'' سب سے آخر میں نازل ہوئی' امام سیوطی نے فرمایا: یہ حدیث مرسل اور صحیح الاسناد ہے۔

قول ثانی اور اس کے بعد والی آیت میں سے کسی ایک آیت کے سب سے آخر میں نازل ہونے کا جو اختلاف پایا جاتا ہے (اس میں کوئی منافات نہیں) ان کو جمع کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ مصحف میں جس ترتیب کے ساتھ یہ آیتیں درج ہیں' ان کو دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا نزول ایک دفعہ میں ہوا ہے' پس ہر ایک پر صادق آئے گا کہ یہ اپنے ماسوا کے اعتبار سے سب سے آخر میں نازل ہوئی' اس وقت قول اوّل کی یہ تاویل کریں گے کہ فرائض اور احکام کے بارے سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیت ''یَسْتَفْتُوْنَکَ قُلِ اللّٰهُ یُفْتِیْکُمْ فِی الْکَلٰلَةِ'' ''اے محبوب! تم سے فتویٰ پوچھتے ہیں تم فرمادو کہ اللہ تمہیں کلالہ کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے'' لیکن اس پر اشکال یہ وارد ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قول ''اَلْیَوْمَ

اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ ''(المائدہ:۳) ''آج کے دن تمہارے لیے تمہارا دین کامل کر دیا'' حجۃ الوداع کے سال عرفہ کے دن نازل ہوا تھا اور اس آیت کا ظاہر مطلب بھی یہ ہے کہ اس کے نزول سے پہلے ہی جمیع فرائض اور احکام کی تکمیل ہو چکی تھی' حالانکہ آیت ''ربوا'' آیت دین اور آیت کلالہ کے بارے میں آیا ہے کہ ان کا نزول اس آیت کے بعد ہوا ہے۔

علماء نے اس اشکال کو رفع کرنے کے لیے اس کی یہ تاویل بیان فرمائی ہے کہ اکمال دین سے مراد یہ ہے کہ مسلمانوں کا دین ان کو بلد الحرام میں برقرار رکھنے اور مشرکین کو وہاں سے جلاوطن کرنے کے ساتھ مکمل ہوا' حتیٰ کہ مسلمانوں نے مشرکین کی شرکت اور خلط ملط کے بغیر فریضہ حج کی ادائیگی کی۔ اس بات کی تائید ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول سے بھی ہوتی ہے' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ پہلے مشرک اور مسلمان سب ایک ساتھ مل کر حج کیا کرتے تھے۔ پھر جس وقت سورہ براءۃ اتری تو اس وقت مشرکوں کو بیت الحرام سے نکال باہر کیا اور مسلمانوں نے اس طرح حج کی ادائیگی کی کہ بیت الحرام میں کوئی مشرک ان کے ساتھ شریک حج نہ تھا اور یہ بات انعام باری تعالیٰ کو مکمل بنانے والی تھی' جیسا کہ اللہ رب العزت نے ''وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ'' (المائدہ:۳) ''اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی'' ارشاد فرما کر اس کا اظہار کیا ہے۔

نزول کے اعتبار سے آخری آیات اور سورتوں کے متعلق دیگر اقوال کا بیان اور ان کا جواب

امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ایسی آیات اور سورتوں کے بارے میں کہ جن میں ہر ایک کے متعلق وارد ہوا کہ یہ سب سے آخر میں نازل ہوئی ہے' بہت سے علماء کے (سابقہ اقوال کے علاوہ مزید) اور اقوال بھی ذکر کیے ہیں' ان اقوال میں سے ایک قول یہ ہے کہ سب سے آخر میں سورہ ''اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ'' (النصر:۱) ''جب اللہ کی مدد اور فتح آئے'' نازل ہوئی ہے' دوسرے قول کے مطابق سورہ المائدہ کا نزول سب سے آخر میں ہوا' تیسرا قول یہ ہے کہ ''لَقَدْ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ'' (التوبہ:۱۲۸) ''بے شک تمہارے

پاس تشریف لائے تم میں سے وہ رسول'' کی آیت سب سے آخر میں نازل ہوئی' چوتھا قول سورہ الفتح کے بارے میں اور پانچواں قول سورہ براءۃ کے سب سے آخر میں نازل ہونے کے متعلق ہے۔

جواب: امام بیہقی فرماتے ہیں کہ اگر یہ اختلاف صحیح ہوں تو ان کو باہم یوں جمع کر سکتے ہیں کہ ہر شخص نے اپنے علم کے موافق جواب دیا ہے۔

قاضی ابوبکر ''الانتصار'' میں لکھتے ہیں:

کہ مذکورہ اقوال میں سے کوئی قول بھی حضور ﷺ تک مرفوع نہیں ہے' ہر شخص نے جو کچھ کہا اپنے قیاس اور غلبہ ظن کی بناء پر کہا ہے۔

پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں میں سے ہر شخص نے حضور ﷺ کے وصال کے دن یا آپ کے ایام علالت سے تھوڑا عرصہ پہلے جو چیز سب سے آخر میں سنی' اس کو بیان کر دیا اور دوسرے شخص نے رسول اللہ ﷺ سے اس کے بعد کچھ اور سنا' جسے پہلے شخص نے شاید نہ سنا ہو۔

سبب نزول کی پہچان

نزول قرآن کی دو قسمیں ہیں' ایک قسم وہ ہے جو ابتداءً (یعنی بغیر کسی سوال اور واقعہ کے) نازل ہوئی ہے اور دوسری قسم وہ ہے جو کسی واقعہ یا سوال کے بعد نازل ہوئی ہے۔

علماء مفسرین نے قسم ثانی میں تتبع کر کے خاص اس موضوع پر کتابیں لکھیں ہیں' جن میں تلاش بسیار اور بڑی محنت و کاوش کے بعد ایسی آیات کہ جن کا نزول کسی سوال یا کسی واقعہ کے بعد ہوا' ان تمام آیات کو ان کے سبب نزول کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ یوں تو آیات کے سبب نزول کے موضوع پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں' لیکن ان میں سے سب سے زیادہ شہرت حافظ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''لباب النقول فی اسباب النزول'' کو حاصل ہوئی۔

سبب نزول کی معرفت کے فوائد

اس فن (معرفت اسباب نزول) کے بہت عظیم فوائد ہیں:

(۱) حکم کے مشروع ہونے کی حکمت کا علم

(۲) معانی قرآن کے سمجھنے کے لیے ایک قوی طریقہ اسباب نزول کا علم ہے' کیونکہ سبب کے علم سے مسبب کا علم حاصل ہونا ضروری ہے۔

سبب نزول کی معرفت کے بغیر قرآن کے معانی سمجھنے میں جو الجھن پیدا ہوتی ہے اور بعض تو سبب نزول سے واقفیت کے بغیر آیت کی تفسیر کرسکنا نہ صرف ناممکن ہوتا ہے' بلکہ آدمی لغزش کا شکار ہو جاتا ہے' لہٰذا اس فن کی اہمیت جاننے کے لیے یہاں دو واقعات ذکر کیے جاتے ہیں۔

مروان بن الحکم نے جب اللہ تعالیٰ کا یہ قول ''لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا'' (آل عمران:۱۸۸) ''ہرگز نہ سمجھنا انہیں جو خوش ہوتے ہیں اپنے کیے پر'' پڑھا تو ان کو اس کا معنی سمجھنے میں مشکل پیش آئی' انہوں نے خیال کیا کہ اس آیت کریمہ کا معنی تو یہ ہوا کہ اگر کوئی شخص اس چیز پر خوش ہو' جو اس کو عطا ہوئی اور اس نے یہ پسند کیا کہ جو کام سزا کے قابل اس نے نہیں کیا ہے' اس پر بھی اس کی تعریف ہو تو ایسے تمام لوگوں کو ہم عذاب دیں گے۔

مروان نے اس آیت کا جو مطلب لیا' وہ آیت کے ظاہر کو دیکھنے سے اگرچہ صحیح معلوم ہوتا ہے' لیکن اس کا حقیقی مفہوم اور ہے' جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اس آیت کا شان نزول بیان کرنے سے واضح ہوتا ہے' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ یہ آیت اہل کتاب کے بارے میں نازل ہوئی تھی' جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے کوئی چیز پوچھی تھی۔ انہوں نے اصل بات چھپالی اور کوئی اور بات بتادی اور آپ پر یہ ظاہر کیا' جو کچھ آپ نے دریافت فرمایا تھا' وہی ٹھیک ٹھیک بتایا ہے اور اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور سرخرو اور قابل ستائش بن گئے تھے' اس روایت کو شیخین نے بیان کیا ہے۔

دوسرا واقعہ حضرت عثمان بن مظعون اور حضرت عمرو بن معدیکرب رضی اللہ عنہم کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ یہ دونوں حضرات شراب کو مباح قرار دیتے تھے اور اپنے اس موقف پر آیت کریمہ ''لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا'' (المائدہ:۹۳) ''جو ایمان لائے اور نیک کام کیے ان پر کچھ گناہ نہیں جو کچھ انہوں نے چکھا'' سے استدلال کرتے تھے۔

اگر ان کو آیت مذکور کا سبب نزول معلوم ہوتا تو ہرگز ایسی بات نہ کہتے۔

اس آیت کا سبب نزول یہ تھا کہ کچھ لوگوں نے شراب کی حرمت کا حکم نازل ہونے کے وقت کہا: ''ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جو شراب کو باوجود اس کے نجس ہونے کے پیتے رہے ہیں اور اب وہ اللہ کے راستے میں جہاد کرتے ہوئے قتل ہو گئے یا طبعی موت سے مر گئے ہیں'' چنانچہ ان لوگوں کی تسکین خاطر کے لیے یہ آیت نازل ہوئی۔ اس روایت کو امام احمد' نسائی اور دیگر ائمہ حدیث نے بھی نقل کیا ہے۔

اور اسی قبیل سے اللہ تعالیٰ کا یہ قول ''فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ'' (البقرہ:۱۱۵) ''تو تم جدھر منہ کرو ادھر وجہ اللہ (خدا کی رحمت تمہاری طرف متوجہ) ہے'' بھی ہے' اس لیے کہ اگر ہم اس کو لفظ کے ظاہر پر محمول کریں تو اس کا مقتضی یہ ہوگا کہ نماز پڑھنے والے پر سفر اور حضر کسی حالت میں قبلہ کی طرف رخ کرنا واجب ہی نہیں اور یہ بات خلاف اجماع ہے' پھر جب اس کا سبب نزول معلوم ہوا تو یہ واضح ہوا کہ یہ حکم باختلاف روایات سفر کے دوران میں نفل نماز کے متعلق ہے یا اس شخص کے بارے میں ہے' جس نے سمت قبلہ نہ معلوم ہونے کے باعث اپنی رائے سے کام لے کر نماز ادا کر لی اور بعد میں معلوم ہوا کہ اس نے غلط سمت میں نماز پڑھی ہے۔ تو ان کے بارے یہ آیت نازل ہوئی کہ ان کی نماز درست ہوگئی۔

نص میں لفظ کے عام ہونے کا اعتبار کرنا چاہیے یا سبب نزول کے خاص ہونے کا؟

سبب نزول کی بحث سے متعلق ایک اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ علماء اصول (فقہ) اس بارے میں اختلاف کرتے ہیں کہ نص میں کس امر کا اعتبار کرنا چاہیے' لفظ کے عموم کا یا سبب کے خاص ہونے کا؟ یعنی جب ہمیں ایک حکم شرعی پر مشتمل آیت کا سبب نزول معلوم ہے تو دریافت طلب امر یہ ہے کہ وہ حکم شرعی اس سبب کے ساتھ جس کے بارے میں اس کا نزول ہوا ہے خاص ہوگا یا کہ اس سبب کے علاوہ کو بھی وہ حکم شامل ہوگا؟ اسی بات کو علماء اصول عموم لفظ اور خصوص سبب کے اسلوب سے تعبیر کرتے ہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ مشہور اور زیادہ

صحیح بات یہی ہے کہ عموم لفظ کا اعتبار ہوتا ہے اور حکم کا شمول سبب خاص کے علاوہ کو بھی معتبر ہو گا۔ کیونکہ ایسی بے شمار آیات ملتی ہیں' جن کا نزول خاص اسباب میں ہوا۔

مگر باتفاق علماء ان کے احکام غیر اسباب کی طرف بھی متعدی ہوتے ہیں' مثلاً ''آیت ظہار'' سلمہ بن صخر کے متعلق نازل ہوئی تھی'' ''آیت لعان'' کا نزول ہلال بن امیہ کے بارے میں ہوا تھا' اور ''حد قذف'' کا شان نزول ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو تہمت لگانے والوں کے بارے میں تھا' مگر بعد میں یہ احکام اوروں کی طرف بھی متعدی ہو گئے اور جو لوگ عموم لفظ کا اعتبار ہی نہیں کرتے' وہ ان آیتوں کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ اور ان جیسی دیگر آیات میں بھی عموم کسی اور دلیل کی وجہ سے آیا ہے۔

حضرت حافظ سیوطی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

عموم لفظ کو معتبر ماننے کی دلیل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مختلف واقعات میں ان آیات کے عموم سے حجت لانا ہے۔ جن کے نزول کے اسباب خاص تھے اور یہ طریقہ استدلال ان کے یہاں شائع اور ذائع تھا۔

تنبیہ

یہ بحث اس لفظ کے بارے میں تھی' جس میں کسی طرح کا عموم پایا جاتا ہے۔ اب رہی وہ آیت جس کا نزول کسی خاص شخص کے بارے میں ہوا اور اس لفظ میں کوئی عموم نہیں ہے تو اس کا انحصار صرف اسی شخص کے حق میں ہوگا' جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ''وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى ○ الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّى'' (الیل: ۱۷۔۱۸) ''اور اس سے (بہت) دور رکھا جائے گا' جس سے بڑا پرہیزگار جو اپنا مال (اللہ کی راہ) میں دیتا ہے''۔

اس آیت کے بارے میں اجماع ہے کہ یہ امیر المومنین خلیفہ اول ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شان میں نازل ہوئی ہے۔

ایک اور وہم اور اس کا ازالہ: اگر کوئی شخص اس آیت کو قاعدہ کے تحت میں لانے کی غرض سے یہ وہم کرے کہ اس کا حکم بھی ہر ایسے شخص کے لیے عام ہوگا۔ جو کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرح اچھے اور نیک کام کرے تو یہ استدلال غلط ہوگا کیونکہ اس آیت میں سرے سے کوئی صیغہ عموم کا ہے ہی نہیں۔ اس لیے ''الف ولام'' مفید عموم اس صورت میں ہوتا

ہے' جب کہ وہ کسی جمع کے صیغہ میں موصولہ یا معرفہ ہو۔ بعض لوگوں نے مفرد میں بھی مانا ہے مگر شرط یہ ہے کہ وہاں کسی قسم کا عہد (ذہنی یا خارجی) نہ پایا جائے۔ اور ''الا تقی'' میں الف لام موصولہ اس لیے نہیں ہو سکتا کہ باجماع اہل لغت افعل التفضیل کا وصل کیا جانا صحیح نہیں۔ پھر ''اتقی'' جمع کا صیغہ بھی نہیں بلکہ وہ مفرد ہے اور عہد بھی اس میں موجود ہے' جس کے ساتھ ہی ''افعل'' کا صیغہ تمیز اور قطع مشارکت کا خاص فائدہ دے رہا ہے' ان وجوہ سے عموم کا ماننا باطل ٹھہرتا اور خصوص کا یقین کامل حاصل ہوتا ہے اور آیت کے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی کے حق میں نازل ہونے کا انحصار کیا جا سکتا ہے۔

اسباب نزول سے متعلق مفید امور کا بیان

اسباب نزول کے مصادر: قرآن حکیم کے اسباب نزول کی بابت سوائے ان لوگوں کی روایت اور سماعی بیان کے' جنہوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے قرآن کو نازل ہوتے دیکھا اور اس کے اسباب نزول کے واقف تھے اور اس علم کی تحقیق کی ہے' کوئی دوسری بات کہنا ہرگز روا نہیں۔

محمد بن سیرین بیان کرتے ہیں: میں نے عبیدہ سے قرآن پاک کی ایک آیت کے بارے میں کچھ پوچھا تو انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور حق بات بیان کرو' وہ لوگ گزر گئے جن کو اس بات کا علم تھا کہ اللہ تعالیٰ نے کس کے متعلق قرآن کی کون سی آیت اتاری ہے۔

صحابہ کرام علیہم الرضوان کی روایت ہی کو اول و آخر اسباب نزول کی شناخت کا دار و مدار قرار دیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ انہیں اسباب نزول کی معرفت ان قرائن کے ذریعے معلوم ہوتی تھی جو کہ ان معاملات کے ساتھ وابستہ تھے' میں کہتا ہوں: اس کے علاوہ صحابہ کرام کو جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ملازمت اور ہمیشہ کے ساتھ رہنے کی سعادت حاصل تھی' اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احوال کی معرفت آیات کریمہ کے نزول کا بچشم خود مشاہدہ کرنا اور ان کی تحقیق اور تتبع' یہ سب باتیں اس امر کی متقاضی ہیں کہ اسباب نزول کی شناخت میں حضرات صحابہ کرام ہی کو مرجع قرار دیا جائے۔

قول صحابی ''نزلت هذه الايه فی كذا'' کی تحقیق' علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ آیا صحابی کا قول ''نزلت هذه الاية فی كذا'' اس حال میں کہ اس نے آیت کا سبب نزول

بیان کیا ہو' مسند کا قائم ہونا مانا جائے گا۔ یا یہ اس کی تفسیر کا قائم مقام ہوگا' جو کہ مسند نہیں ہوتی ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ ایسے قول کو مسند کے زمرہ میں شامل کرتے ہیں اور دیگر محدثین اسے مسند میں داخل نہیں کرتے' اس اصطلاح کے اعتبار سے جس قدر قابل سند اقوال تسلیم ہوں گے' ان میں سے اکثر مسانید کا وہی مرتبہ ہوگا' جو امام احمد وغیرہ محدثین کی مسانید کا ہے۔ بخلاف اس صورت کے کہ جب صحابی نے کسی ایسے سبب کا ذکر کیا ہو' جس کے بعد آیت کا نزول ہوا تھا تو اس کو باتفاق تمام علماء' مسند کا درجہ دیتے ہیں۔

اور دوسرا مسئلہ کہ صحابی کا قول مذکور نزول قرآن کا سبب بنانے کو مفید ہے۔

وعن المسئلہ الثانیہ وھی ھل یفید سببا النزول الایہ

زرکشی اپنی کتاب ''البرہان'' میں لکھتے ہیں:

صحابہ اور تابعین کی عادت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جس وقت ان میں سے کوئی کہتا ہے: ''نزلت ھذہ الایۃ فی کذا'' یہ آیت فلاں معاملہ میں نازل ہوئی ہے تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ آیت فلاں حکم کو شامل ہے نہ یہ کہ اس کی بتائی ہوئی وجہ آیت کا سبب نزول ہے اور صحابہ یا تابعین کا اس طرح کہنا آیت کے ساتھ حکم پر استدلال کرنے کے قبیل سے ہے نہ کہ سبب وقوع کو بیان کرنے کی قسم سے۔

اگر ایک ہی آیت کے کئی اسباب نزول بیان کیے گئے ہوں تو اس کے حکم کا بیان

بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ مفسرین نے ایک ہی آیت کے نزول کے کئی سبب بیان کر دیئے' پس ایسی صورت میں کسی ایک قول پر اعتماد کرنے کا طریق یہ ہے کہ واقعہ کی نوعیت کا جائزہ لیا جائے گا' پھر اگر ایک راوی نے اس کا ایک سبب بیان کیا ہے اور دوسرے نے دوسرا سبب بتایا ہے اور سبب نزول کی تصریح نہیں کی ہے تو اس صورت میں دوسرا قول ہی غالب طور پر آیت کی تفسیر ہے نہ کہ اس کا سبب نزول اور اس صورت میں اگر آیت کے الفاظ دونوں کو

شامل ہوں تو ان دونوں اقوال کے درمیان کوئی منافات نہ پائی جائے گی۔ اگر ایک راوی نے کوئی صریح سبب بیان کر دیا ہے اور دوسرے راوی نے اس کے بالکل برعکس سبب بتایا تو اس حالت میں پہلا قول قابل اعتماد ہوگا اور دوسرا قول استنباط تصور کیا جائے گا' مثلاً امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ ''نِسَآءُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ'' (البقرہ: ۲۲۳) ''تمہاری عورتیں تمہارے لیے کھیتیاں ہیں'' کی آیت غیر فطری طریقے سے بیویوں کے ساتھ صحبت کرنے کے بارے میں نازل ہوئی اور امام مسلم نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے' انہوں نے بیان کیا ہے کہ یہودی کہا کرتے تھے کہ جو شخص اپنی بیوی کے ساتھ اس کی پشت کی جانب سے آگے کے مقام میں وطی کرے گا تو اس کا بچہ بھینگا پیدا ہوگا' ان کی اس بات کی تردید میں اللہ تعالیٰ نے آیت کریمہ ''نِسَآءُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ'' (البقرہ: ۲۲۳) نازل کی۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی یہ تصریح ابن عمر کے اس قول کے بالکل مخالف ہے تو اس موقع پر حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا بیان قابل اعتماد اور ابن عمر کا قول استنباط سمجھا جائے' کیونکہ جابر کا قول نقل ہے اور ابن عمر کا قول استنباط ہے' لہٰذا حدیث کو قیاس پر ترجیح دی جائے گی اور اگر ایک شخص نے کچھ سبب بیان کیا ہے اور دوسرا اس کے علاوہ کوئی اور سبب بتاتا ہے تو دیکھا جائے گا کہ اسناد کس قول کے صحیح ہیں' جس کے اسناد صحیح ہوں' وہی قابل اعتماد ماننا چاہیے۔ اس کی مثال وہ حدیث ہے' جس کو امام بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کچھ بیمار ہو گئے' جس کی وجہ سے آپ ایک یا دو راتیں قیام نہ فرما سکے' اس وقت ایک عورت نے آپ کے پاس آ کر (طنزاً) کہا: محمد (ﷺ) میں دیکھتی ہوں کہ تمہارے شیطان نے تم کو چھوڑ دیا ہے۔

تو اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر ''وَالضُّحٰىO وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰىO مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى'' (الضحیٰ: ۳-۱) نازل فرمائی ''قسم چاشت کی O اور رات کی جب وہ (تاریکی کا) پردہ ڈالے O آپ کے رب نے آپ کو نہیں چھوڑا اور نہ وہ (آپ سے) بیزار ہوا O'' اور طبرانی کی روایت ہے کہ ایک کتے کا پلا نبی پاک ﷺ کے گھر میں گھس آیا اور پلنگ کے نیچے جا بیٹھا اور وہاں مر گیا' اس کے بعد چار دن تک نبی کریم ﷺ پر وحی نازل نہیں ہوئی' حتیٰ کہ جب گھر والوں کو اس پلے کے مرنے کی خبر ہوئی اور اس کو وہاں سے اٹھا کر باہر پھینکوایا تو اس کے بعد جبرائیل علیہ السلام ''والضحی'' لے کر نازل ہوئے' ابن حجر شرح بخاری میں لکھتے

ہیں:

بچہ سگ کی وجہ سے جبرائیل علیہ السلام کے وحی لانے میں دیر کرنے کا قصہ تو عام طور سے مشہور ہے' لیکن اس قصہ کا کسی آیت کا سبب نزول ہونا عجیب و غریب قول ہے اور پھر اس حدیث کے اسناد میں ایک ایسا راوی بھی ہو' جو معروف نہیں۔ اس لیے قابل اعتماد قول وہی ہے' جو صحیحین میں ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ کسی آیت کا نزول دو یا چند اسباب کے بعد ہو تو ایسی صورت میں آیت کا نزول ہر ایک سبب پر محمول کیا جائے گا' کیونکہ تعدد اسباب سے مانع کوئی چیز نہیں ہے' ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جب کئی اسباب کے لیے ایک آیت کا نزول تسلیم کرنا ممکن نہ ہو تو جس آیت کے اسباب میں تعدد پایا جائے' اس کا نزول کئی بار اور مکرر بھی مان لیا جائے گا۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ' حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے شہید ہونے کے بعد ان کی لاش پر کھڑے ہوئے اور ان کی لاش مثلہ کر دی گئی تھی۔

حضور ﷺ نے لاش سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: بے شک میں کفار کے ستر آدمی تمہارے عوض مثلہ کر دوں گا۔ ابھی حضور ﷺ وہیں کھڑے تھے کہ جبرائیل علیہ السلام سورہ ''النحل'' کی آخری آیات لے کر آئے اور ان میں ایک آیت یہ بھی تھی:

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ. (النحل:۱۲۶)
اور اگر تم انہیں سزا دو تو ایسی ہی سزا دو جیسی تمہیں تکلیف پہنچائی گئی۔

اس حدیث کو بیہقی اور بزار نے روایت کیا ہے۔

امام ترمذی اور حاکم نے (ابی بن کعب سے) روایت کیا ہے کہ معرکہ احد میں مسلمانوں میں سے ۶۴' انصاری اور ۶ مہاجر شہید ہوئے تھے' انہی میں سے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ بھی تھے' جن کو مشرکین نے مثلہ کر دیا تھا' انصار یہ منظر دیکھ کر کہنے لگے:

''اگر ہم کفار پر کسی معرکہ میں فتح یاب ہوئے' تو ان کے مقتولین کے ساتھ اس سے بدرجہا بڑھ کر سخت سلوک کریں گے'' چنانچہ فتح مکہ کا دن آیا تو اللہ تعالیٰ نے ''وان عاقبتم'' آیت نازل فرمائی۔ اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان آیتوں کے نزول میں فتح مکہ کے دن تک تاخیر ہوئی ہے اور قبل کی حدیث ان کا نزول معرکہ احد کے موقع پر عیاں کرتی ہے۔

ان حدیثوں کو جمع کرنے کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے یوں کہا جائے کہ آخر سورہ النحل کا نزول قبل از ہجرت مکہ میں ہو چکا تھا' کیونکہ وہ سورہ مکیہ ہے اور اسی کے ساتھ سب آیتیں نازل ہوئی تھیں۔ پھر دوبارہ ان آیات کا نزول معرکہ احد کے موقع پر ہوا اور سہ بار فتح مکہ کے دن جس سے مقصود یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو یہ واقعہ بار بار یاد دلانا چاہتا ہے۔

متفرق آیتوں کے نزول کا ایک ہی سبب ہونے کا بیان

بسا اوقات ایسا بھی ہوا ہے' ایک ہی واقعہ کے بارے میں متعدد آیتوں کا مختلف سورتوں میں نزول ہوا ہے' اس کی مثال وہ روایت ہے' جس کو امام ترمذی اور حاکم نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے' ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں' میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! کیا بات ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کو ہجرت کے معاملہ میں عورتوں کا کچھ بھی ذکر کرتے نہیں سنتی!

تو اسی وقت اللہ تعالیٰ نے ''فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَآ اُضِيْعُ'' (آل عمران:۱۹۵)

''تو ان کی دعا سن لی ان کے رب نے کہ میں محنت اکارت نہیں کرتا'' آخر آیت تک نازل فرمائی اور حاکم نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا ہی سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ مردوں کا ذکر فرماتا ہے مگر عورتوں کا ذکر نہیں فرماتا تو اس وقت سورہ الاحزاب کی آیت: ۳۵' ''اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ'' ''بے شک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں' اور آیت کریمہ ''اَنِّیْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى'' (آل عمران:۱۹۵) ''میں تم میں کام کرنے والے کی محنت اکارت نہیں کرتا مرد ہو یا عورت'' دونوں آیتیں نازل ہوئیں۔

قرآن مجید کے ان حصوں کا بیان' جن کا نزول بعض صحابہ کی زبان پر جاری ہونے والے الفاظ کے مطابق ہوا ہے

یہ در حقیقت اسباب نزول ہی کی ایک نوع ہے اور اسی باب میں دراصل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے موافقات کا بیان ہے یعنی وہ باتیں جو انہوں نے کہیں اور پھر انہی کے موافق قرآن

مجید کی آیات کا نزول ہوا اور یہ موافقات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مشہور مناقب میں سے ہیں۔

امام ترمذی ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں' حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "ان اللّٰہ جعل الحق علی لسان عمرو قلبه" "بے شک اللہ تعالیٰ نے عمر کی زبان اور ان کے دل کو حق کا مرکز بنایا ہے"۔

امام بخاری اور دوسرے محدثین نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے' انہوں نے فرمایا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ میں نے تین باتوں میں اپنے رب (عزوجل) سے موافقت کی ہے:

(۱) میں نے عرض کی: یارسول اللہ! "لو اتخذنا من مقام ابراهيم مصلى." "اگر ہم مقام ابراہیم کو مصلی (جائے نماز) بناتے تو کتنا اچھا ہوتا اور اسی وقت آیت کریمہ "وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى" (البقرہ:۱۲۵) نازل ہوئی اور (حکم دیا کہ) مقام ابراہیم کو نماز پڑھنے کی جگہ بنالو۔

(۲) میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! ازواجِ مطہرات کے سامنے نیک اور غیر صالح ہر طرح کے لوگوں کی آمدورفت رہتی ہے' اس لیے آپ ان کو پردہ کرنے کا حکم فرمادیتے تو بہتر ہوتا' اس وقت آیت حجاب نازل ہوئی۔

(۳) حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تمام ازواج پاک حضور کی بابت غیرت رکھنے میں ایک ہوگئیں تو میں نے ان سے کہا: "عسى ربه ان طلقكن ان يبدله ازواجا خيرا منكن" یعنی اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تم کو طلاق دے دیں گے تو قریب ہے کہ ان کا رب انہیں تمہارے بدلے میں تم سے اچھی بیویاں عطا فرمادے گا۔ اور اسی طرح پر قرآن کا بھی نزول ہوا۔

حضرت امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے "موافقات عمر" کے موضوع پر ایک مستقل رسالہ تصنیف کیا ہے' جس میں تمام موافقات کو جمع کر دیا ہے اور اس رسالہ کا نام "قطف الثمر فی موافقات عمر" رکھا ہے۔ اور میرے استاذ گرامی حضرت علامہ غلام رسول سعیدی صاحب کا اس موضوع پر ایک تحقیقی مقالہ "مقالاتِ سعیدی" میں چھپا ہے۔

تکرار نزول کا بیان

متقدمین اور متاخرین علماء کی ایک جماعت نے ذکر کیا ہے کہ قرآن کریم کی بعض آیتیں اور سورتیں مکرر نازل ہوئی ہیں اور اس تکرار نزول کی بے شمار حکمتیں ہیں۔

قرآن کے حفاظ اور راویوں کا تعارف

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ قرآن کا علم چار شخصوں سے حاصل کرو:

(۱) عبداللہ ابن مسعود (رضی اللہ عنہما) (۲) سالم (رضی اللہ عنہ) (۳) معاذ (رضی اللہ عنہ) (۴) اور ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ۔

یعنی قرآن کی تعلیم ان لوگوں سے حاصل کرو' ان چاروں مذکورہ بالا اصحاب رضی اللہ عنہم میں سے پہلے دو مہاجر ہیں اور باقی دو انصاری ہیں اور سالم ابن معقل رضی اللہ عنہما' ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ کے مولی ہیں اور معاذ سے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما مراد ہیں۔ (اس سے مقصود ترغیب ہے ورنہ) حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فرمان کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس وقت ان چاروں صحابہ کے علاوہ کوئی صحابی حافظ قرآن نہ تھا بلکہ قرآن کے حفظ کرنے والے اس وقت ان کی طرح بہت سے صحابہ موجود تھے اور صحیح حدیث میں غزوہ بیر معونہ کے حالات میں ہے کہ اس غزوہ میں جس قدر قاری کے لقب سے مشہور صحابہ کرام شہید ہوئے' ان کی تعداد ستر (۷۰) تھی۔

امام بخاری حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں' انہوں نے کہا کہ میں نے انس ابن مالک رضی اللہ عنہما سے پوچھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد مبارک میں کن لوگوں نے قرآن کو جمع کیا تھا؟ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: چار شخصوں نے جو سب انصار میں سے تھے' ابی بن کعب' معاذ بن جبل' زید بن ثابت اور ابوزید رضی اللہ عنہم' ان سے میں نے دریافت کیا: ابوزید کون تھے؟ حضرت انس نے فرمایا: میرے ایک چچا۔ اور ایک اور حدیث حضرت انس ہی سے ثابت رضی اللہ عنہ کے واسطہ سے منقول ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رحلت فرمانے کے وقت ان چار

شخصوں کے سوا اور کسی نے قرآن کو جمع نہیں کیا تھا: ابو الدرداؓ معاذ بن جبلؓ زید بن ثابت اور ابو زید رضی اللہ عنہم اس حدیث میں دو وجہ سے قتادہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے مخالفت پائی جاتی ہے۔

اوّل یہ ہے کہ صیغہ حصر کے ساتھ چار ہی شخصوں کی تصریح کر دی گئی ہے اور دوسری وجہ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی جگہ ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کا نام آیا ہے اور مفسرین کی ایک جماعت نے قرآن کے جمع کرنے کا انحصار محض چار ہی شخصوں میں کر دینے کا انکار کیا ہے۔

مازری کا قول ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے قول سے یہ لازم نہیں آتا کہ قرآن کو ان چار شخصوں کے سوا کسی اور صحابی نے جمع نہیں کیا ہو کیونکہ اس صورت میں مطلب یہ نکلتا ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کو علم نہ تھا کہ ان چار صحابہ کرام کے علاوہ کسی اور صحابی نے بھی قرآن کو جمع کیا ہے' ورنہ انہیں اس کا علم ہوتا تو انہیں یہ علم کیونکر حاصل ہو سکتا تھا جب کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی جماعت بھی بہت بڑی جماعت تھی اور پھر متفرق شہروں میں پھیل چکے تھے۔ اس بات کا علم تو انہیں جب ہی ہو سکتا تھا کہ وہ ہر شخص سے ملے ہوتے اور پھر ہر شخص نے اپنے بارے میں یہ بتلایا ہوتا کہ اس نے عہد رسالت میں قرآن کو مکمل جمع نہیں کیا تھا اور ایسا عادۃً ناممکن ہے۔

اور اگر ان کے قول سے مطلب ان کا ذاتی علم ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ نفس الامر میں بھی ایسا ہی واقع ہو۔

مازری لکھتے ہیں کہ:

حضرت انس رضی اللہ عنہ کے اسی قول سے ملاحدہ کی ایک جماعت نے یہ دلیل پکڑی ہے کہ صحابہ کرام کے دور میں قرآن جمع نہیں تھا' حالانکہ اس میں ان کے دلیل قائم کرنے کی کوئی وجہ نہیں پائی جاتی کیونکہ ہم اس قول کا اس کے ظاہری معنی پر محمول کرنا تسلیم ہی نہیں کرتے اور فرض کرو کہ ہم اس کے ظاہری معنی کو مان بھی لیں تو بھی وہ لوگ یہ بات کیسے ثابت کر سکیں گے کہ واقع میں بھی ایسا ہی تھا اور اسے بھی تھوڑی دیر کے لیے تسلیم کر لیا جائے تو یہ کب لازم آتا ہے کہ ایک جماعت کثیر کے حافظ قرآن نہ ہونے کے ساتھ ویسا ہی ایک گروہ کثیر مکمل قرآن کا حافظ بھی نہ رہا ہو؟

اور تواتر کی کچھ یہ شرط نہیں کہ تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین مکمل قرآن کے

حافظ رہے ہوں' بلکہ ان سب نے مل کر متفرق طور سے بھی کل قرآن کو حفظ کیا ہو اور اتنا بھی تواتر کے ثبوت کو کافی ہے۔

علامہ قرطبی لکھتے ہیں:

جنگ یمامہ میں ستر قاری شہید ہوئے اور رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں غزوہ بیر معونہ کے موقع پر بھی اسی قدر حفاظ قرآن کام آئے تھے۔

اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے جن چار شخصوں کا خصوصیت سے ذکر فرمایا' وہ ان سے اپنے گہرے تعلق کی بنا پر ہے اور دوسروں سے اس قسم کا شدید تعلق نہ ہونے کی بناء پر ان کا ذکر نظر انداز کر گئے اور ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے ذہن میں اتنے ہی لوگ آئے اور دوسرے اس وقت ذہن میں نہ ہوں۔

قاضی ابوبکر الباقلانی کہتے ہیں کہ حدیث انس رضی اللہ عنہ کا جواب کئی طریقوں سے دیا جا سکتا ہے:

اوّل: اس قول کا کوئی مطلب ہی نہیں بنتا' لہٰذا یہ لزوم بھی نہیں پایا جاتا کہ ان چار شخصوں کے سوا کسی نے قرآن کو جمع ہی نہ کیا ہو۔

دوم: اس سے مراد یہ ہے کہ قرآن پاک کو تمام ان وجوہ اور قراءتوں پر جن پر اس کا نزول ہوا تھا' صرف انہی چار صحابہ کرام علیہم الرضوان نے جمع کیا۔

سوم: قرآن مجید میں سے اس کی تلاوت کے بعد منسوخ شدہ اور غیر منسوخ حصوں کی جمع و تدوین اور حفاظت میں ان چار صحابہ کے علاوہ اور کسی نے سعی نہیں کی۔

چہارم: یہاں پر جمع قرآن سے یہ مراد ہے کہ اس کو بلاواسطہ رسول اللہ ﷺ سے صرف انہی چار صحابہ کرام نے سیکھا ہو اور ہو سکتا ہے کہ دوسرے صحابہ نے قرآن کو رسول اللہ ﷺ سے کسی واسطہ کے ساتھ پڑھا ہو۔

پنجم: ان چار اصحاب نے قرآن کی تعلیم و تدریس میں اپنا زیادہ وقت صرف کیا اور یہ مشہور ہو گئے اور دوسروں کو شہرت حاصل نہ ہو سکی' لہٰذا جن لوگوں کو ان چار شخصوں کا حال معلوم تھا اور دوسروں کے حال سے واقف نہ تھے' انہوں نے اپنے علم کے مطابق حفظ قرآن کا انحصار انہی چار صحابہ میں کر دیا' جب کہ واقع میں ایسا نہ تھا۔

ششم: جمع سے مراد کتابت ہے' اس لیے حضرت انس کا یہ قول اس بات کے موافق نہیں کہ اوروں نے قرآن کو صرف زبانی یاد کرنے اور دل میں محفوظ رکھنے پر اکتفاء کیا ہو' لیکن ان چار صحابہ نے اسے دل میں یاد رکھنے کے علاوہ کتابت کی شکل میں بھی محفوظ کر لیا ہو۔

ہفتم: جمع قرآن سے یہ مراد ہے کہ چار صحابہ کرام کے علاوہ کسی نے بصراحت قرآن جمع کرنے کا یوں دعویٰ نہیں کیا کہ اس نے رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک ہی میں حفظ قرآن مکمل کر لیا تھا۔ کیونکہ دوسرے صحابہ نے حفظ قرآن کی تکمیل حضور ﷺ کے وصال کے بعد یا قریب زمانہ میں کی تھی' جب کہ آخری آیت کا نزول ہوا تھا۔ لہٰذا ممکن ہے کہ اس آخری آیت یا اسی کے مشابہ دوسری آیات کے نازل ہونے کے وقت بھی چاروں صحابہ سب سے پہلے ایسے موجود رہے ہوں' جنہوں نے مکمل قرآن پاک بھی حفظ کر لیا تھا اور دوسرے حاضرین پورے قرآن مجید کے حافظ نہ رہے ہوں۔

ہشتم: اس سے مراد قرآن حکیم کے احکام کی اطاعت کرنا اور اس کے موجبات پر عمل پیرا ہونا ہے۔ کیونکہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الزہد میں ابو الزاہریہ کے طریق سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے آ کر ابو الدرداء سے کہا: میرے بیٹے نے قرآن کو جمع کر لیا ہے۔

ابو الدرداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے اللہ! اس شخص کو بخش دے کیونکہ جمع قرآن کا مطلب تو یہ ہے کہ آدمی اس کے امر و نہی کی تعمیل بھی کرے۔

جوابات پر تبصرہ

ابن حجر مذکورہ بالا جوابات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

مذکورہ بالا احتمالات میں سے اکثر احتمال ایسے ہیں' جن میں خواہ مخواہ تکلف کیا گیا ہے' خصوصاً آخری احتمال تو سراپا تکلف ہے' میرے خیال میں ایک اور احتمال آتا ہے' جو ممکن اور درست ہے' وہ یہ ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی اس سے مراد صرف قبیلہ اوس کی قبیلہ خزرج پر برتری ثابت کرنا ہے' اس واسطے یہ بات ان دونوں قبیلوں کے علاوہ مہاجرین وغیرہ کے حق میں منافی نہیں کیونکہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے یہ بات اس وقت کہی تھی' جب اوس اور خزرج دونوں قبائل کے لوگ باہم ایک دوسرے پر تفاخر کا اظہار کر رہے تھے' جیسا کہ ابن جریر نے بھی یہی بات سعید ابن عروبہ کے طریق پر حضرت قتادہ کے حوالہ سے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت

کی ہے کہ اوس اور خزرج کے دونوں قبیلوں نے باہم ایک دوسرے پر اپنی اپنی بڑائی جتانا شروع کی۔ قبیلہ اوس کے لوگوں نے کہا: ہم میں سے چار شخص نہایت صاحب عظمت ہوئے ہیں' ایک وہ جس کے لیے عرش عظیم جھوم اٹھا تھا' اور وہ سعد ابن معاذ رضی اللہ عنہما ہیں۔

دوسرا وہ جس اکیلے کی شہادت دو شہادتوں کے برابر ہوئی اور وہ حضرت خزیمہ بن ثابت ہیں۔

تیسرا وہ شخص جس کو فرشتوں نے غسل میت دیا اور وہ حضرت حنظلہ ابن ابی عامر رضی اللہ عنہما ہوئے۔

اور چوتھا وہ شخص جس کی لاش کو بھڑوں نے مشرکین کے ہاتھوں میں پڑنے سے بچایا اور وہ حضرت عاصم بن ثابت یعنی ابن ابی الافلح تھے۔

قبیلہ خزرج کے لوگ اس بات کو سن کر کہنے لگے: ہم میں سے چار ایسے شخص ہوئے ہیں' جنہوں نے قرآن کو جمع کیا اور ان کے سوا کوئی شخص قرآن کو جمع کرنے کی سعادت حاصل نہیں کر سکا۔

پھر حضرت انس رضی اللہ عنہ نے ان چاروں صحابہ رضی اللہ عنہم کا ذکر کیا' ابن حجر لکھتے ہیں کہ:

بہ کثرت احادیث سے جو بات ظاہر ہوتی ہے' وہ یہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کے زمانہ حیات ظاہری میں قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔ کیونکہ صحیح حدیث میں ہے کہ انہوں نے اپنے مکان کے صحن میں ایک مسجد تعمیر کر رکھی تھی اور اس میں قرآن پڑھا کرتے تھے۔

اور یہ حدیث اس بات پر محمول ہے کہ جس قدر قرآن اس وقت نازل ہو چکا تھا' اسے پڑھتے تھے۔

ابن حجر کہتے ہیں:

اس میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حضور ﷺ سے قرآن سیکھنے کا بے حد شوق تھا اور پھر وہ اس کام کے لیے فارغ البال بھی تھے' وقت تھا۔ مکہ میں رہنے کی صورت میں حضور ﷺ سے بہ کثرت ملاقات رہتی اور دیر دیر تک مجلس نبوی میں روزانہ فیض یابی کا موقع ملتا' یہاں تک کہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

حضور اکرم ﷺ ان کے باپ کے گھر روزانہ صبح وشام دونوں وقت تشریف لاتے تھے اور پھر یہ بھی صحیح حدیث ہے کہ نماز میں لوگوں کی امامت کے فرائض وہ شخص انجام دے' جو ان میں سے کتاب اللہ کا سب سے بہتر قاری ہو۔

خود رسول اللہ ﷺ نے اپنے ایام علالت میں حضرت ابوبکر کو مہاجرین اور انصار کا امام بنا کر نماز پڑھانے کا حکم دیا۔ اس سے بھی اس امر کی دلیل ملتی ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تمام صحابہ میں سب سے بہتر قرآن کے قاری تھے۔

ابوعبید ہی نے کتاب القراءت میں اصحاب رسول اللہ ﷺ میں سے جو حضرات قاری قرآن تھے' ان کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ مہاجرین میں سے (۱) خلفائے اربعہ (۲) حضرت ابن مسعود (۳) حضرت حذیفہ (۴) حضرت سالم (۵) حضرت ابوہریرہ (۶) حضرت طلحہ (۷) حضرت عبد اللہ ابن السائب (۸) حضرت عبداللہ ابن زبیر (۹) حضرت عبد اللہ ابن عباس (۱۰) حضرت عبداللہ بن عمر (۱۱) حضرت عائشہ (۱۲) حضرت حفصہ (۱۳) حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین اور انصار میں سے حضرت عبادہ ابن الصامت' حضرت معاذ جن کی کنیت ابوحلیمہ تھی' حضرت مجمع ابن جاریہ' حضرت فضالہ ابن عبید اور حضرت مسلمہ ابن خلد رضی اللہ عنہم (انہوں نے قرآن کو پورا یاد کیا تھا اور اس کی قراءتوں سے واقف تھے)۔

نیز ابوعبید رضی اللہ عنہ نے یہ بھی تصریح کر دی ہے کہ ان میں سے بعض صحابہ نے حفظ قرآن کی تکمیل رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد کی تھی۔

صحابہ میں سے قرآن کے مشہور قاریوں کا ذکر

صحابہ کرام میں سے قرآن پڑھانے والے سات صحابی مشہور ہیں:

حضرت عثمان' حضرت علی' حضرت ابی' حضرت زید بن ثابت' حضرت ابن مسعود' حضرت ابو الدرداء اور حضرت ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہم۔ علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب طبقات القراء میں ایسا ہی بیان کیا اور لکھا ہے کہ ابی رضی اللہ عنہ سے صحابہ کرام کی ایک جماعت نے قرآن پڑھا تھا' ان جملہ صحابہ میں سے حضرت ابوہریرہ' حضرت ابن عباس اور عبداللہ ابن السائب ہیں۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ نے زید بن ثابت رضی اللہ عنہما سے بھی قراءت سیکھی ہے اور پھر ان صحابہ

کرام سے بہ کثرت تابعین نے بھی قراءت سیکھی۔

مدینہ کے قراء تابعین: منجملہ قراء تابعین کے مدینہ میں یہ جلیل القدر علماء تھے:

حضرت ابن المسیب' حضرت عروہ' حضرت سالم' حضرت عمر ابن عبد العزیز' حضرت سلیمان اور حضرت عطاء' جو دونوں یسار کے بیٹے تھے۔ حضرت معاذ ابن الحارث جو معاذ القاری کے نام سے مشہور تھے۔ حضرت عبدالرحمٰن ابن ہرمز الاعرج' حضرت ابن شہاب الزہری' حضرت مسلم بن جندب اور حضرت زید ابن اسلم رضی اللہ عنہم۔

قراء مکہ: مکہ میں حضرت عبید ابن عمیر' حضرت عطاء ابن ابی رباح' حضرت طاؤس' حضرت مجاہد' حضرت عکرمہ اور ابن ابی ملیکہ رضی اللہ عنہم تھے۔

قراء کوفہ: کوفہ میں حضرت علقمہ' حضرت الاسود' حضرت مسروق' حضرت عبیدہ' حضرت عمرو ابن شرجیل' حضرت حارث بن قیس' حضرت ربیع بن خثیم' حضرت عمرو بن میمون' حضرت ابوعبدالرحمٰن سلمی' حضرت زر ابن حبش' حضرت عبید ابن فضالہ' حضرت سعید ابن جبیر' حضرت نخعی اور حضرت شعبی رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔

قراء بصرہ: بصرہ میں حضرت ابوعالیہ' حضرت ابورجاء' حضرت عاصم رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین' حضرت یحییٰ ابن یعمر' حضرت حسن' حضرت ابن سیرین اور حضرت قتادہ۔

قراء شام: شام میں مغیرہ ابن ابی شہاب المخزومی' جو حضرت عثمان کے شاگرد تھے اور خلیفہ ابن سعد جو ابی الدرداء کے شاگرد تھے' پھر ایک گروہ کثیر نے صرف قراءت ہی پر زیادہ زور دیا اور اس کی طرف اتنی توجہ کی کہ اپنے وقت کا امام فن' مقتدائے خلائق اور مرجع انام بن گئے۔

اس طرح کے فن قراءت کے امام مدینہ میں ابوجعفر یزید ابن القعقاع' ان کے بعد شیبہ ابن نصاع اور پھر نافع ابن نعیم ہوئے۔

اور ''مکہ'' میں عبداللہ ابن کثیر' حمید ابن قیس الاعرج اور محمد ابن ابی محیض نامور قاری اور اپنے وقت کے امام فن مشہور تھے۔

''کوفہ'' میں یحییٰ ابن وثاب' عاصم ابن ابی النجود اور سلیمان الاعمش (یہ تینوں ہم عصر تھے) اور ان کے بعد حمزہ اور پھر کسائی کا دور دورہ رہا۔ ''بصرہ'' میں عبد اللہ ابن ابی اسحاق' عیسیٰ ابن عمر' ابوعمرو ابن العلاء اور عاصم الجحدری' یہ چاروں ہم عصر تھے اور ان کے بعد یعقوب

الحضرمی کا طوطی بولتا رہا۔

''شام'' (دمشق) میں عبد اللہ ابن عامر' عطیہ ابن قیس الکلابی اور اسمٰعیل ابن عبد اللہ ابن المہاجر اور پھر یحیٰی ابن الحارث الذماری اور اس کے بعد شریح ابن یزید الحضرمی نامور قراء ہوئے اور انہی مذکورہ بالا اماموں میں سے حسب ذیل سات قاری فن قراءت کے امام کے طور پر پوری دنیا میں مشہور ہوئے ہیں:

(۱) نافع: انہوں نے ستر تابعی قاریوں سے قراءت کا فن سیکھا' انہیں میں سے ایک ابو جعفر ہیں۔

(۲) ابن کثیر: انہوں نے عبداللہ ابن السائب صحابی سے قراءت کی تعلیم حاصل کی تھی۔

(۳) ابو عمرو: انہوں نے صرف تابعین سے فن قراءت سیکھا۔

(۴) ابن عامر: انہوں نے ابو الدرداء سے اور عثمان کے شاگردوں سے قراءت کی تعلیم حاصل کی تھی۔

(۵) عاصم: انہوں نے تابعین ہی سے قراءت کی تعلیم پائی تھی۔

(۶) حمزہ: انہوں نے عاصم' اعمش اور سبیعی اور منصور بن المعتمر وغیرہ سے قراءت سیکھی تھی۔

(۷) کسائی: انہوں نے حمزہ اور ابوبکر ابن عیاش سے فن قراءت میں مہارت حاصل کی تھی۔

اس کے بعد فن قراءت چہار دانگ عالم میں پھیل گیا اور ہر دور میں بے شمار اس فن کے ماہر اور سرکردہ لوگ پیدا ہوتے رہے۔

ساتوں مذکورہ بالا قراءت کے طریقوں میں سے ہر ایک طریقہ کے دو دو راوی زیادہ مشہور ہوئے اور باقی کو شہرت دوام حاصل نہ ہو سکی۔

O چنانچہ نافع رضی اللہ عنہ کے شاگردوں میں قالون اور ورش ممتاز ہوئے' جو خود نافع رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔

O ابن کثیر رضی اللہ عنہ کے طریقہ سے قنبل اور البزی زیادہ نامور ہوئے' یہ دونوں ابن کثیر رضی اللہ عنہ کے اصحاب کے واسطہ سے ان سے روایت کرتے ہیں۔

O ابو عمرو رضی اللہ عنہ سے بہ واسطہ یزید رحمۃ اللہ الدوری اور السوسی کی روایت شہرہ آفاق ہے۔

O ابن عامر رضی اللہ عنہ سے بہ واسطہ ان کے اصحاب ہشام اور ابن ذکوان ممتاز راوی ہوئے۔

O عاصم رضی اللہ عنہ کے خاص شاگردوں میں ابوبکر ابن عیاش رضی اللہ عنہما اور حضرت حفص رضی اللہ عنہ دو

راویوں نے شہرت دوام پائی ہے۔

O حمزہ رضی اللہ عنہ کے سلسلہ روایت سے بہ واسطہ سلیم' حضرت خلف اور حضرت خلاد دو راویوں کو ممتاز مقام حاصل ہے۔

O اور کسائی کے شاگردوں میں الدوری اور ابو الحارث شہرت دوام اور قبول عام کے مرتبہ پر فائز ہوئے۔

پھر اس کے بعد جب اختلافات اور جھگڑے اس قدر بڑھ گئے کہ باطل اور حق میں فرق کرنا دشوار ہو گیا تو ایسے میں امت مسلمہ کے روشن دماغ اور جید علماء نے نہایت بالغ نظری اور جدوجہد کے ساتھ قرآن کریم کے جملہ حروف اور قراءتوں کو جمع کیا ہے' وجوہ اور روایات کی سندیں واضح کیں۔

اور صحیح مشہور اور شاذ قراءتوں کے اصول اور ارکان مقرر کر کے ان کو ایک دوسرے سے ممتاز بنایا اور ان کو گڈمڈ ہونے سے بچایا۔

فن قراءت میں سب سے پہلے ابو عبید قاسم ابن سلام نے کتاب تصنیف کی' اس کے بعد احمد ابن جبیر کوفی' پھر اسماعیل ابن اسحاق مالکی قالون کا شاگرد' ان کے بعد ابو جعفر ابن جریر طبری' بعد ازاں ابوبکر محمد ابن احمد ابن عمر الدجونی اور پھر ابوبکر مجاہد مگر مجاہد کے زمانہ میں اور ان کے بعد بھی بہ کثرت علماء نے انواع قراءت میں جامع' مفرد' مختصر اور مطول ہر طرح کی کتابیں تصنیف کیں۔

فن قراءت کے اماموں کی اتنی تعداد ہے کہ ان کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔

حافظ ملت شمس الدین الذہبی اور حافظ القراءت ابو الخیر ابن الجزری ابو عبداللہ' دونوں نے قاریوں کے تذکرے لکھے ہیں۔

متواتر' مشہور' آحاد' شاذ' موضوع اور مدرج قراءتوں کی تعریفات

قراءت کی تین قسمیں: متواتر' آحاد اور شاذ' اس نوع میں سب سے خوبصورت کلام اپنے

زمانہ کے امام القراء حافظ سیوطی علیہ الرحمہ کے استادوں کے استاد ابوالخیر ابن الجزری نے کیا ہے ابن جزری رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب ''النشر'' کے شروع میں لکھتے ہیں:

ہر ایسی قراءت جو عربی قواعد کے موافق ہو خواہ کسی وجہ سے بھی ہو اور مصاحف عثمانیہ میں سے کسی مصحف کے ساتھ خواہ احتمالی طور پر بھی مطابقت رکھتی ہو اور صحیح الاسناد بھی ہو تو ایسی قراءت صحیح اور قابل قبول ہے اور اس کے ماننے سے انکار کرنا روا نہیں ہے بلکہ یہ قراءت انہی حروف سبعہ میں شامل ہوگی جن پر قرآن کا نزول ہوا ہے اور لوگوں پر اس کا قبول کرنا واجب ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ وہ سات یا دس اماموں سے منقول یا ان کے ماسوا دوسرے اماموں سے مگر جس وقت ان تینوں مذکورہ بالا ارکان میں سے کوئی رکن بھی مختل ہوگا تو اس قراءت کو شاذ ضعیف اور باطل قراءت کہا جائے گا خواہ اس کے راوی ائمہ سبعہ ہوں یا ان کے ماسوا دوسرے امام جو ان سے بھی برتر و بالا ہیں۔ سلف سے لے کر خلف تک تمام ائمہ محققین نے اس بات کی صحت کو تسلیم کیا ہے۔

پھر ابن الجزری لکھتے ہیں:

ہم نے ضابطہ میں ''ولو بوجہ'' کی قید سے ہر نحوی وجہ مراد لی ہے خواہ وہ افصح ہو یا فصیح، متفق علیہ ہو یا مختلف فیہ تاہم وہ اختلاف اس قسم کا ہو جو قراءت کے (شائع اور ذائع یعنی) مشہور معروف ہونے اور ائمہ کے اس کی تعلیم صحیح اسناد کے ساتھ کرنے کی وجہ سے کوئی نقصان نہ پہنچا سکے کیونکہ فن قراءت کا سب سے بڑا اصول اور محکم ترین رکن یہی صحیح الاسناد ہونا ہے ورنہ یوں تو بہت سی قراءتیں ایسی پائی جاتی ہیں۔ جن کو بعض یا اکثر علماء نحاۃ نے قواعد کے حوالہ سے درست نہیں مانا ہے لیکن ان کا یہ انکار قابل اعتبار نہیں ہے مثلاً ''بارئکم'' اور ''یامرکم'' کا ساکن بنانا ''بارئکم'' اور ''یامرکم'' اور ''والارحام'' کو مجرور پڑھنا وغیرہ۔

قید ''موافقت مصاحف'' کا فائدہ

پھر ابن الجزری لکھتے ہیں کہ:

کسی ایک مصحف کی موافقت سے ہماری یہ مراد ہے کہ جو قراءت مختلف مصاحف میں سے کسی ایک میں بھی ثابت ہو مثلاً ابن عامر رضی اللہ عنہ کی قراءت ''قال اتخذ اللہ'' بغیر واؤ کے

سورہ البقرہ میں اور ''بالزبر وبالکتاب'' دونوں میں اثبات (ب) کے ساتھ یہ شامی مصحف میں ثابت ہے یا جس طرح سورہ براۃ کے آخر میں ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ ''تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ'' میں حرف ''من'' کو بڑھا کر پڑھا ہے اور یہ قراءت مکی مصحف میں ثابت ہے یا اسی طرح کی اور مثالیں ہیں۔

پس اگر اس قسم کی قراءتیں مصاحف عثمانیہ میں سے کسی مصحف میں نہ ثابت ہوں تو وہ شاذ کہلاتی ہیں کیونکہ وہ متفق علیہ رسم الخط کے خلاف ہیں۔

قید ''وصح سندھا'' کا فائدہ

ابن الجزری لکھتے ہیں:

ہمارا یہ قول کہ ''قراءت کی اسناد صحیح ہوں'' اس سے مراد یہ ہے کہ اس قراءت کی روایت عادل اور ضابط راویوں نے اپنے ہی جیسے دیگر راویوں سے کی ہو اور ''از ابتداء تا انتہا'' تمام سندیں اسی طرح کی ہوں اور پھر اس کے ساتھ ہی وہ فن قراءت کے اماموں کے نزدیک مشہور قراءت ہو اور وہ لوگ اسے غلط یا بعض قاریوں کی شاذ قراءت قرار نہ دیں۔

قراءت کی انواع

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: امام ابن الجزری نے اس فصل کو بڑی تفصیل سے اور نہایت مدلل طریق پر تحریر کیا ہے اور امام ممدوح کے بیانات سے ہی معلوم ہوا کہ قراءت کی کئی قسمیں ہیں جو آئندہ سطور میں بیان کی جاتی ہیں۔

اول: متواتر، وہ قراءت ہے جس کو ایک ایسی کثیر جماعت نے نقل کیا ہو جس کا جھوٹ پر متفق ہونا ناممکن ہو اور تمام ناقلین کا سلسلہ اول سے آخر تک ایسا ہی رہا ہو بیشتر قراءتیں ایسی ہی ہیں۔

ثانی: مشہور، وہ قراءت جس کی سند صحیح ہو اور وہ درجہ تواتر تک تو نہ پہنچی ہو لیکن عربیت کے موافق اور مصحف کے رسم الخط کے مطابق ہو قراء کے نزدیک مشہور ہو غلط شمار ہوئی ہو اور نہ ہی شاذ اور اس کی قراءت بھی ہوتی ہو جیسا کہ جزری نے کہا ہے اس کی مثال وہ قراءتیں ہیں جن کا سات قاریوں سے منقول ہونے میں سندوں میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ کچھ نے اس کو

روایت کیا ہے، کچھ نے نہیں کیا' قراءت کی کتابوں میں جہاں پر اختلاف حروف کی فہرستیں دی گئیں' اس کی مثالیں بہ کثرت مل جاتی ہیں' جیسا کہ متواتر کی مثالوں کی کمی نہیں ہے' قراءت کے موضوع پر تصنیف ہونے والی کتب میں سے زیادہ مشہور کتابیں حسب ذیل ہیں:

(۱) التیسیر' جو الدانی کی تصنیف ہے (۲) قصیدہ شاطبی (۳) اوعیہ النشر فی القراءات العشر (۴) اور تقریب والنشر' یہ دونوں کتابیں ابن جزری کی تصنیف کردہ ہیں۔

ثالث: وہ قراءت کہ جس کی سند تو صحیح ہے لیکن ان میں عربیت یا رسم الخط کی مخالفت پائی جاتی ہے یا مذکورہ بالا قراءت کے برابر مشہور نہیں اور نہ اس کی قراءت کی جاتی ہے' امام ترمذی نے اپنی جامع میں اور حاکم نے مستدرک میں ایسی قراءتوں کے بیان کے لیے الگ باب قائم کیا ہے اور اس باب میں بہت سی صحیح الاسناد روایتیں نقل کی ہیں' اس میں سے ایک حاکم کی وہ روایت ہے' جس کو انہوں نے عاصم الجحدری کے طریق پر ابوبکر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے "مُتَّكِئِينَ عَلٰى رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَّعَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ" (الرحمٰن:۷۶) "تکیہ لگائے ہوئے سبز بچھونوں اور منقش خوبصورت چاندنیوں پر" اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے "فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا اُخْفِيَ لَهُمْ مِنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ" پڑھا تھا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے "لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ" (التوبہ:۱۲۸) "بے شک تمہارے پاس تشریف لائے تم میں سے وہ رسول" میں ف کو فتح دے کر قراءت فرمائی اور ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے "فروح وریحان" میں "ر" کے ضمہ کے ساتھ قراءت فرمائی۔

رابع: شاذ' یہ ایسی قراءت ہے جس کی صحیح سند ثابت نہ ہو' اس کے بیان کے لیے مستقل کتابیں تالیف ہوئی ہیں' شاذ کی مثالیں "مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" (الفاتحہ:۳) "روز جزا کا مالک" کی قراءت ہے' جس میں "مَلَكَ" صیغہ ماضی اور لفظ "يَوْمَ" نصب کے ساتھ پڑھا گیا ہے اور اسی طرح "اِيَّاكَ يُعْبَدُ"، "خاص تیری ہی عبادت کی جاتی ہے" میں صیغہ مجہول کے ساتھ قراءت ہے۔

خامس: جیسے الخزاعی کی قراءتیں ہیں۔

اس کے علاوہ ایک اور قسم ہے' جو حدیث کی انواع سے مشابہ ہونے کے باعث مدرج

میں درج کی جا سکتی ہے' یہ ایسی قراءت ہے جو دوسری قراءتوں میں تفسیر کے طور پر زیادہ کر دی گئی ہے' جیسے سعد بن ابی وقاص کی قراءت "وله اخ او اخت من ام" ہے' یہ سعید بن منصور سے مروی ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قراءت "ليس عليكم جناح ان تبتغوا فضلا من ربكم في مواسم الحج" (بخاری)۔

اور حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہما کی قراءت "ولتكن منكم امة يدعون الى الخير ويامرون بالمعروف وينهون عن المنكر ويستعينوك بالله على ما اصابهم"۔ عمرو رحمۃ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں:

مجھے نہیں معلوم ہو سکا کہ آیا یہ ان کی قراءت تھی یا انہوں نے تفسیر کی ہے۔

یہ بھی سعید ابن منصور کی روایت ہے۔

اور ابن الانباری نے بھی اس کو روایت کیا ہے اور انہوں نے یقین کے ساتھ یہ بات کہی ہے کہ یہ زیادتی تفسیر ہی ہے۔

اور حسن رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ وہ پڑھا کرتے تھے "وان منكم الا واردها الورود الدخول" انباری نے کہا کہ حسن رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول "الورود الدخول" خود حسن کی طرف سے لفظ "ورود" کے معنی کی تفسیر ہے اور کسی راوی نے غلطی سے قرآن کے ساتھ لاحق کر دیا ہے۔

تنبیہات

امام فخر الدین رازی لکھتے ہیں کہ:

بعض قدیم کتابوں میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ سورہ الفاتحہ اور معوذتین کو خارج از قرآن مانتے تھے' اس پر ایک سخت اشکال وارد ہوتا ہے کہ اگر ہم کہیں کہ نقل متواتر کا صحابہ کے زمانہ میں پایا جانا ثابت ہے تو فاتحۃ الکتاب اور مُعوّذتین کے داخل قرآن ماننے کا انکار موجب کفر ہوتا ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ تواتر کا وجود صحابہ کے زمانہ میں نہیں تھا تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ قرآن اصل میں متواتر نہیں ہے' امام رازی اس اشکال سے چھٹکارا حاصل کرنے کے طریق پر تنبیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ظن غالب یہ

ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے اس قسم کی روایت کا نقل کرنا ہی سرے سے باطل ہے‘ اس طرح اس پھندے سے گلوخلاصی ممکن ہے۔

قاضی ابوبکر رحمہ اللہ بھی یہی کہتے ہیں کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے فاتحہ اور معوذتین کا قرآن سے ہونے کا انکار صحیح طور پر ثابت نہیں ہے اور نہ ہی اس قسم کا کوئی قول یاد آتا ہے۔ انہوں نے ان سورتوں کو اپنے مصحف سے مٹا دیا تھا‘ جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ان سورتوں کا لکھنا درست نہیں سمجھتے تھے۔

نہ یہ کہ ان کے قرآن ہونے کے منکر تھے۔ بات یہ ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما کے خیال میں مصحف کے لکھنے میں سنت یہ تھی کہ جس چیز کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس میں لکھنے کا حکم دیا ہے وہ تو اس میں لکھی جائے اور اس کے علاوہ کسی چیز کا لکھنا جائز نہیں ہے۔ چونکہ انہوں نے فاتحہ اور معوذتین کو نہ تو کہیں لکھا ہوا پایا اور نہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کے لکھنے کا حکم دیتے سنا‘ اس لیے انہوں نے ان کو اپنے مصحف میں درج نہیں کیا ہے۔

امام نووی نے کہا: ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا جو قول نقل ہے‘ وہ باطل ہے صحیح نہیں ہے۔ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے انکار کی نسبت جس قدر روایتیں آئی ہیں‘ وہ سب صحیح ہیں تو جو شخص کہتا ہے کہ یہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما پر غلط الزام لگایا گیا ہے‘ اس کی بات قابل قبول نہیں۔ کیونکہ بغیر کسی دلیل اور اسناد کے صحیح روایات پر طعن کرنا مقبول نہیں ہو سکتا‘ بلکہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے انکار کی نسبت جتنی روایتیں آئی ہیں‘ وہ سب صحیح ہیں اور ان میں تاویل کرنا ایک احتمالی امر ہے۔

ابن قتیبہ اپنی کتاب ''مشکل القرآن'' میں لکھتے ہیں کہ:

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے یہ گمان کیا کہ معوذتین قرآن میں داخل نہیں ہیں اور اس کی وجہ یہ ہوئی کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان دونوں سورتوں کے ساتھ اپنے نواسوں حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کے لیے تعویذ کرتے دیکھا تھا‘ اسی لیے وہ اپنے گمان پر قائم رہے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما کا موقف درست تھا اور باقی مہاجر اور انصار صحابہ رضی اللہ عنہم صحیح قول پر نہیں تھے۔

دوسری تنبیہ: حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث مبارک کہ ''ان القرآن انزل علی سبعة احرف''

قرآن سات حرفوں پر نازل کیا گیا ہے‘ اس سے مراد یہ ہے کہ قرآن مجید کو ایسے طریقہ پر نازل کیا گیا ہے کہ اس میں ایک لفظ کو کئی طریقوں سے ادا کرنے کی وسعت آسانی اور گنجائش رکھی گئی ہے‘ لیکن اس کے باوجود کہ ایک لفظ کو مختلف وجوہ اور کئی طریقوں سے ادا کرنا جائز ہے‘ تاہم یہ اختلاف وجوہ سات کے عدد سے متجاوز نہ ہوگا۔

تیسری تنبیہ: امام مکی رحمہ اللہ کہتے ہیں:

وہ شخص جو یہ گمان کرتا ہے کہ حضرت نافع اور عاصم وغیرہ قاریوں کی قراءتیں ہی حدیث میں مذکور حروف سبعہ ہیں‘ سخت غلطی پر ہے اور پھر اس سے یہ بھی خرابی لازم آتی ہے کہ جو قراءت ان ساتوں اماموں کی قراءت سے خارج‘ مگر دوسرے ائمہ قراءت سے ثابت اور رسم خط مصحف کے مطابق ہو‘ اس کو قرآن میں نہ مانا جائے اور یہ بہت بڑی غلطی ہے۔

رہا یہ مسئلہ کہ باوجودیکہ فن قراءت کے اماموں میں قراء سبعہ سے کہیں بڑھ کر صاحب رتبہ اور مستند یا انہی کے مرتبہ کے لوگ بہ کثرت موجود تھے تو پھر انہی سات قاریوں کی قراءت پر اکتفاء کیوں کر لیا گیا؟ تو اس کا سبب یہ بنا کہ جب دیکھا گیا کہ طالبان میں فن کی ہمتیں تمام راویوں سے قراءت کا سماع کرنے سے پست ہوتی جا رہی ہیں‘ لوگوں نے محض انہی قراءتوں پر اکتفا کر لیا‘ جو مصحف کے رسم الخط کے موافق تھیں تا کہ ان کے حفظ میں سہولت رہے اور اس کی قراءت کا ضبط بخوبی ہو سکے‘ پھر انہوں نے ایسے ائمہ قراءت کی تلاش کی جو ثقاہت‘ امانت اور کہنہ مشق ہونے کی صفات سے متصف تھے اور اخذ قراءت کے سلسلہ میں غیر متنازعہ شخصیت کے حامل تھے‘ اس لیے بلاد اسلامیہ کے ہر ایک مشہور شہر سے۔

ایک ایک امام منتخب کر لیا اور اسی کے ساتھ ان قراءتوں کا نقل کرنا بھی ترک نہیں کیا‘ جو ان کے علاوہ دوسرے اماموں مثلاً یعقوب‘ ابوجعفر اور شیبہ وغیرہ سے منقول تھیں‘ سندوں کے لحاظ سے امام نافع رحمۃ اللہ علیہ اور امام عاصم رحمۃ اللہ علیہ کی قراءتیں زیادہ صحیح ہیں اور فصاحت کے اعتبار سے ابوعمرو اور کسائی کی قراءتیں اعلیٰ درجہ کی ہیں۔

سات مشہور قراءتوں کے علاوہ دوسری قراءتوں کا حکم

شیخ تقی الدین لکھتے ہیں:

جو قراءت سات مشہور قراءتوں سے خارج ہے‘ اس کی دو قسمیں ہیں۔

پہلی قسم وہ ہے جو مصحف کے رسم الخط کے مخالف ہے' ایسی قراءت کا نماز یا غیر نماز کسی حالت میں بھی پڑھنا ہرگز جائز نہیں ہے۔

اور دوسری قسم وہ ہے' جو مصحف کے رسم الخط کے تو مخالف نہیں لیکن غیر مشہور ہے اور ایسے غریب طریقے سے وارد ہوئی ہے' جس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا تو اس طرح کی قراءت کے پڑھنے کی ممانعت بھی ظاہر ہے' بعض قراءتیں اس قسم کی ہیں' جن کو فن قراءت کے سلف اور خلف سب ائمہ نے پڑھا ہے اور وہ ان کے نام سے مشہور ہیں' اس طرح کی قراءتوں سے ممانعت کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی' یعقوب وغیرہ کی قراءت اسی قبیل سے ہے۔

چوتھی تنبیہ: قراءتوں کا اختلاف احکام میں بھی اختلاف کا باعث بنتا ہے' اسی وجہ سے فقہاء کرام نے ''لمستم'' اور ''لامستم'' کے اختلاف قراءت پر وضو ٹوٹنے کے دو مسئلوں کا استنباط کیا ہے کہ اگر ''لمستم'' پڑھا جائے تو اس صورت میں صرف لمس کرنے والے کا وضو ٹوٹے گا ورنہ ''لامستم'' پڑھنے کی صورت میں لمس کرنے والے اور ملموس دونوں کا وضو ٹوٹ جائے گا اور اسی طرح حائضہ عورت کے بارے میں ''یطھرن'' کا اختلاف قراءت خون کے بند ہوتے ہی غسل سے قبل بھی وطی کو جائز قرار دیتا ہے اور ناجائز بھی۔

قرآن کے تحمل کی کیفیت

قرآن کریم کے تحمل کی دو صورتیں ہیں:

(۱) استاد کے روبرو خود پڑھنا

(۲) استاد کی زبان سے روایت کے الفاظ کی سماعت کرنا

استاد کے سامنے قراءت کرنے اور پڑھنے کا طریقہ سلف سے لے کر خلف تک رائج چلا آ رہا ہے' مگر قرآن کی قراءت بھی خاص استاد کی زبان سے سن کر یاد کرنے کا قول اس مقام پر محض ایک احتمالی امر ہے' کیونکہ صحابہ کرام علیہم الرضوان نے تو بے شک قرآن پاک کو حضور ﷺ ہی کی زبان اقدس سے سن کر یاد کیا اور اس کی تعلیم پائی تھی' لیکن قراء میں سے کسی ایک کا بھی اسے رسول اللہ ﷺ سے اس طرح پر حاصل کرنا ثابت نہیں ہوتا اور اس کی ممانعت کا ہونا' اس سے ظاہر ہے کہ یہاں کیفیت ادا مقصود ہے اور ایسا ہونا ممکن نہیں کہ ہر شخص

استاد کی زبان سے سن کر قرآن کو اسی ہیئت پر ادا بھی کر سکے' جس کیفیت کے ساتھ استاد نے ادا کیا تھا۔ بخلاف حدیث کے کہ اس میں اس خصوصیت کا لحاظ اس لیے نہیں ہے کہ اس میں مطلوب معنی یا لفظ کو یاد کر لیتا ہے' ان ادا کی ہیئتوں کے ساتھ نہیں' جو ادائیگی قرآن میں معتبر ہیں۔

اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم چونکہ فصیح اللسان اور سلیم الطبع تھے تو یہ بات ان کو قرآن کے اسی طرح ادا کرنے پر قادر بنا دیتی ہے' جس طرح انہوں نے حضور ﷺ کی زبان مبارک سے سماعت کیا تھا اور اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ قرآن خاص ان کی زبان میں اترا تھا۔

استاد کے سامنے قرآن پڑھنے کی دلیل کا ثبوت اس امر سے بھی بہم ملتا ہے کہ ہر سال رمضان مبارک کے مہینے میں حضور ﷺ قرآن (منزل) کو جبرائیل علیہ السلام پر پیش کرتے اور ان کو سنایا کرتے تھے اور ان کے ساتھ دور فرمایا کرتے تھے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ جب شیخ شمس الدین ابن جزری' قاہرہ (مصر) میں آئے تو ان سے قراءت سیکھنے کے لیے خلق خدا کا اتنا ازدحام ہو گیا کہ سب کے لیے الگ الگ وقت دینا مشکل ہو گیا' چنانچہ شیخ موصوف نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ وہ ایک آیت کی قراءت کرتے جاتے تھے اور تمام سامعین اکٹھے مل کر اسی آیت کو پھر لوٹا دیتے تھے۔ انہوں نے صرف قراءت پر اکتفاء نہیں کیا۔

استاد کے سامنے اس حالت میں قراءت کرنا بھی جائز ہے' جب کہ کوئی دوسرا شخص اسی استاد کے پاس الگ پڑھ رہا ہو' مگر شرط یہ ہے کہ استاد پر ان تمام قاریوں کی حالت واضح رہے اور کسی کا پڑھنا اس پر مخفی نہ رہے۔

شیخ علم الدین سخاوی رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے ایک ہی وقت میں مختلف مقامات سے دو دو تین تین اشخاص الگ الگ قراءت کیا کرتے تھے اور شیخ ان میں سے ہر شخص کو بتاتے جاتے تھے۔ اسی طرح شیخ کے دوسرے مشاغل مثلاً لکھنے یا مطالعہ کرنے میں مصروف ہوتے ہوئے بھی ان کے سامنے قراءت کی جا سکتی ہے۔

اب رہی یہ بات کہ زبانی قراءت کی جائے تو یہ کوئی شرط نہیں ہے' بلکہ مصحف سے دیکھ کر بھی قراءت کر لینا کافی ہے۔

قراءت کے تین طریقے

اوّل: تحقیق: یعنی یہ کہ مد کے اشباع، ہمزہ کی تحقیق، حرکات کو پوری طرح ادا کرنا، اظہار اور تشدیدوں کی ادائیگی میں پورا اعتماد ہونا، حروف کو واضح طور پر ایک دوسرے سے الگ الگ کرنا، بعض حرف، سکتہ، ترتیل وغیرہ میں بعض سے جداگانہ طور پر مخرج سے نکالنا، دوسرے حرف کی حد سے خارج بنانا اور بغیر کسی قصر اور اختلاس کے اور متحرک کو ساکن بنانے یا اس کو مدغم کر دینے کے وقف جائز مقامات کا لحاظ رکھ کر ایک حرف کو اس کے پورے حق کے ساتھ ادا کرنا۔ یہ باتیں زبان کی ریاضت اور الفاظ کی درستی اور استقامت سے حاصل ہوتی ہیں۔

متعلمین کو ان امور کا سیکھنا مستحب ہے، مگر ساتھ ہی یہ خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ اس سلسلہ میں حد سے تجاوز نہ کریں اور یہ نہ کریں کہ حرکت کی ادائیگی میں افراط کر کے آواز پیدا کر لیں، را کو مکرر بنا دیں، ساکن کو متحرک کر دیں اور نون کے غنہ میں مبالغہ کر کے غنغنانے لگ جائیں۔

چنانچہ امام حمزہ نے ایک شخص کو ان باتوں میں مبالغہ کرتے سنا تو اس سے فرمایا: کیا تم اس بات کو نہیں جانتے ہو کہ حد سے بڑھی ہوئی سفیدی برص اور پھلبہری ہوتی ہے اور بالوں میں حد سے زیادہ پیچ وتاب کا ہو جانا اس کو کاکل مرغوب سے مرغولہ بنا دینا ہے، اسی طرح قراءت بھی حد سے بڑھ جائے تو اس سے کراہت ہو جاتی ہے۔

دوم: قراءت کی دوسری کیفیت حدر ہے اور ''حدر'' ایسی قراءت کو کہتے ہیں جو تیزی سے پڑھی جائے اور اس میں روانی ہو اور اس کے اندر قصر، اسکان، اختلاس، بدل، ادغام، کبیر اور تخفیف ہمزہ وغیرہ امور میں جو روایت صحیح سے ثابت ہیں۔ عجلت کی جاتی ہے، لیکن اسی کے ساتھ اعراب کی رعایت اور الفاظ کی صحت ادا کی محافظت نیز حروف کو ان کی جگہوں پر برقرار رکھا جاتا ہے، یہ نہیں کہ حرف مد کی کشش چھوڑ دیں یا حرکات کا اکثر حصہ ظاہر کرنے سے گول کر جائیں یا غنہ کی آواز کو بالکل اڑا دیں یا ان امور میں اس قدر تفریط اور کمی کریں کہ قراءت کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیں اور اس کی صحت ہی جاتی رہے۔

سوم: تدویر، قراءت کی یہ قسم پچھلی دونوں اقسام یعنی تحقیق اور حدر کے مابین توسط کرنے کا نام ہے، اکثر ائمہ جنہوں نے ہمزہ منفصل میں مد کیا ہے، اس میں اشباع کی حد تک مبالغہ نہیں کیا، ان کا یہی

مذہب ہے، نیز باقی قاریوں کا بھی یہی مختار مذہب ہے اور اہل ادا بھی اسی کو پسند کرتے ہیں۔

تجوید القرآن

قرآن مجید کی تجوید نہایت اہم مسئلہ ہے، یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگوں نے اس موضوع پر مستقل اور مبسوط کتابیں لکھی ہیں۔ انہی مصنفین میں سے ایک ابوعمرو الدانی ہیں، جنہوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: ''جَوِّدُوا الْقُرْاٰنَ'' قرآن پاک کو تجوید سے پڑھا کرو۔

تجوید قراءت کا زیور ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ تمام حروف کو ان کا پورا پورا حق دینا اور ان کو ان کی ترتیب سے رکھنا، ہر حرف کو اس کی اصل اور مخرج کی طرف لوٹانا اور اس لطف اور خوبصورتی کے ساتھ اس کو زبان سے ادا کرنا کہ اس کی اصل صورت بلا کسی قسم کی کمی بیشی اور تکلف کے عیاں ہو جائے، حضور ﷺ نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

''مَنْ اَحَبَّ اَنْ یَّقْرَاَ الْقُرْاٰنَ غَضًّا کَمَا اُنْزِلَ فَلْیَقْرَاْهُ عَلٰی قِرَاءَةِ ابْنِ اُمِّ عَبْدٍ''

جو شخص قرآن کو اسی خوبی کے ساتھ پڑھنا چاہے، جیسے اس کا نزول ہوا تو اس کو ابن ام عبد یعنی عبداللہ بن مسعود کی قراءت کا اتباع کرنا چاہیے، اس میں کوئی شک نہیں کہ جس طرح مسلمانوں کے لیے قرآن مجید کے معانی کا سمجھنا اور اس کے احکام پر عمل کرنا ایک عبادت ہے اور یہ ان پر فرض قرار دیا گیا ہے، اسی طرح ان پر قرآن کے الفاظ کا صحیح طور پر پڑھنا اور اس کے حروف کو اسی طرز پر ادا کرنا بھی لازم اور فرض ہے، جس طرز پر ان حروف کو ادا کرنا، فن قراءت کے اماموں نے رسول اللہ ﷺ تک متصل سند کے ساتھ ثابت کیا ہے۔

علماء فرماتے ہیں: تجوید کے بغیر قراءت کرنا ''لحن'' (غلطی) ہے۔

فصل

قراءتوں کے الگ الگ اور جمع کر کے پڑھنے کے طریقوں کا بیان

پانچویں صدی ہجری تک سلف صالحین کا یہ طریقہ رہا کہ وہ قرآن مجید کا ہر ایک ختم ایک

ہی روایت کے مطابق کیا کرتے تھے اور ایک روایت کو دوسری روایت کے ساتھ کبھی نہیں ملاتے تھے' لیکن پھر ایک ہی ختم میں تمام قراءتوں کو اکٹھے پڑھنے کا رواج پڑ گیا اور اس پر عمل ہونے لگا' تاہم اس کی اجازت صرف ان قاریوں کو دی جاتی تھی' جو الگ الگ تمام قراءتیں پڑھ کر انہیں یاد کر چکے ہوتے تھے اور وہ ان کے طریقوں سے بخوبی واقف ہو چکے ہوتے تھے اور انہوں نے ہر ایک قاری کی قراءت کے مطابق ایک ایک بار الگ بھی ختم کر لیا ہو' حتیٰ کہ اگر شیخ سے دو شخص روایت کرنے والے تھے تو ان میں سے ہر ایک کی روایت کے مطابق بھی الگ الگ قرآن کا ختم بھی کر لیا ہوتا۔ تو اس کے بعد وہ تمام قراءتوں کو جمع کر کے پڑھنے پر قادر مانے جاتے تھے اور کچھ لوگوں نے سہل انگاری سے کام لیتے ہوئے اس کی بھی اجازت دے رکھی تھی کہ قراء سبعہ میں سے ہر ایک قاری کا صرف ایک ختم پڑھنا ہی کافی ہے' سوائے نافع اور حمزہ کے' کیونکہ حمزہ کی قراءت کے چار ختم پورے کرنا لازمی تھا' یعنی قالون' ورش' خلف اور خلاد' چاروں راویوں کے ان کی روایتوں سے الگ الگ ختم کرنا ضروری تھی' اس کے بعد کسی شخص کو تمام قراءتوں کے اکٹھے پڑھنے کی اجازت ملتی تھی۔

البتہ اگر کوئی شخص کسی معتبر اور مستند شیخ سے علیحدہ علیحدہ اور اجتماعی طور پر تمام قراءتوں کی تعلیم حاصل کر چکا ہو اور پھر وہ مُجاز ہو کر اس بات کا اہل بن گیا ہو تو اس کو ایک ختم میں تمام قراءتوں کو اکٹھے پڑھنے کی اجازت ہے اور کوئی ممانعت نہیں' کیونکہ وہ اختلافات سے واقف ہے۔

قراءتوں کو یکجا کر کے پڑھنے کا طریقہ

قراءت کے جمع کرنے میں قاریوں کے دو طریقے ہیں:

اوّل: جمع بالحرف ہے اور اس کی صورت اس طرح ہے کہ قراءت شروع کی اور جب کسی ایسے کلمہ پر پہنچے' جس میں اختلاف ہے تو تنہا اسی کلمہ کو ہر ایک روایت کے مطابق بار بار اعادہ کر کے تمام وجوہ کو مکمل کر لے' پھر اگر وہ کلمہ وقف کے صالح اور اس کے لیے موزوں ہے تو اس پر وقف کر لے' ورنہ آخری وجہ قراءت کے ساتھ اسے مابعد سے وصل کرتے ہوئے جہاں وقف آتا ہے' اس جگہ وقف کرے لیکن اگر وہ اختلاف دو کلموں سے تعلق رکھتا ہے' جیسے مد منفصل کا اختلاف تو ایسی صورت میں دوسرے کلمہ پر وقف کر کے تمام وجوہ اختلاف کا احاطہ کرے اور

پھر اس کے بعد والی آیت شروع کی جائے' یہ طریقہ اہل مصر کا ہے۔

دوم: دوسرا طریقہ جمع بالوقف ہے' وہ اس طرح ہے کہ پہلے جس قاری کی قراءت شروع کی ہے' اسے مقام وقف تک پڑھا جائے اور دوسری دفعہ اسی آیت کو کسی اور قاری کی قراءت کے مطابق پڑھنا شروع کریں' اور اسی انداز سے ہر ایک قاری کی قراءت یا وجہ کو بار بار آیت کی تکرار کر کے ادا کرتے رہیں۔ حتیٰ کہ سب قراءتوں سے فارغ ہو جائیں' یہ اہل شام کا مذہب ہے اور یہ طریقہ استحضار کے لیے بہت بہتر ہے اور اگرچہ وقت تو بہت کھاتا ہے' لیکن عمدہ ہے۔

ابوالحسن قبجاطی اپنے قصیدہ کی شرح میں لکھتے ہیں کہ قراءتوں کو جمع کر کے پڑھنے والے قاری کے لیے سات شرطوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے' جن کا لب لباب حسب ذیل پانچ امور ہیں:

(۱) حسن الوقف

(۲) حسن الاتبداء

(۳) حسن الابتداء

(۴) دم الترکیب' یعنی جب کوئی قاری ایک قراءت شروع کرے تو اس کو مکمل کیے بغیر دوسرے قاری کی قراءت کی طرف منتقل نہ ہو۔

(۵) رعایہ الترتیب' یعنی قراءت میں ترتیب کا لحاظ رکھنا' اس طرح کہ پہلے اسی قراءت سے ابتداء کرے' جس کو فن قراءت کی کتابیں تالیف کرنے والے علماء نے اپنی کتابوں میں پہلے بیان کیا ہے' چنانچہ پہلے نافع پھر ابن کثیر' اس کے بعد قالون اور ازاں بعد ورش کی قراءت پڑھے۔

مگر ابن الجزری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ یہ کوئی شرط نہیں ہے بلکہ مستحب ہے' باقی رہا یہ مسئلہ کہ قراءت سیکھنے کے زمانے میں سبق کے دوران میں کتنی مقدار قرآن پڑھنا چاہیے؟

اس سلسلہ میں بات یہ ہے کہ صدر اوّل کے علماء نے کبھی اور کسی شخص کو دس آیتوں سے زیادہ ایک نشست میں نہیں پڑھائیں' البتہ صدر اوّل کے بعد اساتذہ اور مشائخ نے پڑھنے

والے کی حسب طاقت جس قدر وہ یاد کر سکتا تھا' اتنا ہی زیادہ یا کم سبق دینا شروع کر دیا تھا۔

فائدہ اولیٰ

ابن خیر نے کہا کہ اس امر پر تمام علماء کا اجماع ہے کہ جب تک کسی شخص کو روایت کرنے کی سند حاصل نہ ہو' اس وقت تک وہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث روایت کرنے کا مجاز نہیں ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ آیا قرآن کے بارے میں بھی یہی حکم ہے کہ جب تک کسی شخص سے قرآن کی قراءت نہ سیکھ لی ہو' اس وقت تک کسی شخص کو ایک آیت کا بھی نقل کرنا جائز نہیں ہے؟

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: میری نظر سے ایسی کوئی روایت نہیں گزری' لہٰذا اس کی یہ وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ گو قرآن کے الفاظ ادا کرنے میں حدیث کی بہ نسبت بہت ہی زیادہ احتیاط کی گئی ہے کیونکہ حدیث میں روایت باللفظ شرط ہیں اور قرآن میں لازمی ہے' اس کی وجہ یہ ہے کہ حدیث میں روایت کے لیے اجازت کی شرط لگائی گئی ہے' اس لیے ضرورت ہے کہ اس میں موضوع اقوال کے داخل ہونے کا خوف ہے کہ کہیں لوگ رسول اللہ ﷺ کی طرف خود ساختہ اور من گھڑت باتیں منسوب نہ کر دیں' جبکہ قرآن اس بات سے محفوظ رکھا گیا ہے کیونکہ ہر زمانہ میں اس کے یاد رکھنے والے کثرت سے پائے جائیں گے اور اس طرح وہ متداول رہے گا۔

فائدہ: قراءت سکھانے اور لوگوں کو تعلیم قرآن سے فائدہ پہنچانے کے لیے شیخ کی اجازت حاصل کرنا ضروری ہے' جو شخص اپنے آپ کو اس بات کا اہل سمجھتا ہو کہ وہ لوگوں کو قرآن پڑھا سکتا ہے خواہ کسی شیخ سے اجازت یافتہ ہو یا نہ ہو' اس کو پڑھانا جائز ہے' صدر اوّل کے اسلاف اور صلحاء کا یہی دستور رہا ہے اور یہ بات کچھ قراءت ہی کے لیے مخصوص نہیں بلکہ ہر علم کے لیے عام ہے' کیا پڑھانے میں اور کیا فتویٰ دینے میں بعض غبی لوگ جنہوں نے اجازت اور سند کو شرط قرار دے دیا ہے' یہ ان کا محض توہم ہے اور عام طور سے لوگوں نے سند کی اصطلاح اس لیے مقرر کی ہے کہ اکثر مبتدی لائق اساتذہ کو نہیں جانتے پہچانتے ہیں مگر شاگردی کرنے سے

پہلے استاذ کی اہلیت اور علمی قابلیت کا پایا معلوم کر لینا لازمی امر ہے' اس لیے کہ اجازت یا سند ایک شہادت اور علامت ہے' جو شیخ کی طرف سے قابل اجازت طلباء کو دی جاتی ہے اور وہ اس کے ذریعے سے اور لوگوں پر اپنی اہلیت ثابت کر سکتے ہیں۔

قرآن پاک کو بہ کثرت پڑھنے کا استحباب

کثرت سے قرآن مجید کی قراءت اور تلاوت کرنا مستحب ہے' اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی تلاوت کرنے والوں کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا: ''یَتْلُوْنَ اٰیٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّیْلِ'' (آل عمران: ۱۱۳) ''اللہ کی آیتیں تلاوت کرتے ہیں رات کی گھڑیوں میں'' صحیح بخاری اور مسلم میں ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے کہ ''دو شخصوں کے سوا کسی کے حق میں حسد کرنا جائز نہیں'' ایک اس آدمی کے بارے میں جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن کا علم عطا فرمایا ہے اور وہ شب و روز قرآن پاک کی تلاوت کرتا ہے۔

امام ترمذی' حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ ''جو شخص کتاب اللہ کا ایک حرف بھی پڑھے گا' اس کو ہر ایک حرف کے بدلہ میں ایک نیکی کا ثواب ملے گا جو دس نیکیوں کے برابر ہے''۔ حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ نے روایت کی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: رب سبحانہ وتعالیٰ فرماتا ہے: جس شخص کو قرآن اور میرا ذکر مجھ سے مانگنے سے روک لے گا' میں اس کو مانگنے والوں کی بہ نسبت بہتر اجر عطا فرماؤں گا۔

اور کلام اللہ کی فضیلت باقی کلاموں پر ایسی ہے' جیسی کہ اللہ تعالیٰ کی اپنی تمام مخلوق پر۔

امام مسلم نے ابوامامہ سے روایت کی ہے کہ ''تم لوگ قرآن کو پڑھو' کیونکہ وہ قیامت کے دن اپنے پڑھنے والوں کی شفاعت کرے گا''۔

امام بیہقی' ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں' انہوں نے فرمایا کہ ''جس گھر میں قرآن پاک پڑھا جاتا ہے' وہ آسمان والوں کو اس طرح روشن نظر آتا ہے' جیسے زمین والوں کو تارے دکھائی دیتے ہیں''۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ:

نَوِّرُوْا مَنَازِلَکُمْ بِالصَّلٰوۃِ وَقِرَاءَۃِ الْقُرْاٰنِ — اپنے گھروں کو نماز اور قرآن کے پڑھنے سے روشن کرو۔

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں "اَفْضَلُ عِبَادَةِ اُمَّتِیْ قِرَاءَةُ الْقُرْاٰنِ"
"میری امت کی بہترین عبادت قرآن پاک کی قراءت ہے"۔ حضرت سمرہ بن جندب بیان
کرتے ہیں: ہر دعوت دینے والے کی دعوت پر لوگوں کا آنا ضروری ہے اور اللہ تعالیٰ کی دعوت'
دعوت قرآن ہے' لہٰذا تم اس خوانِ نعمت کو مت چھوڑو۔

قرآن پاک پڑھنے کی مقدار میں اسلاف کا معمول کیا تھا؟

قرآن پاک کی قراءت کی مقدار میں سلف صالحین کا معمول اور طریقہ مختلف ادوار میں
مختلف رہا ہے' زیادہ سے زیادہ ان کے قرآن پڑھنے کی مقدار یہ آئی ہے کہ بعض تو ایک دن اور
ایک رات میں آٹھ بار قرآن پاک ختم کر لیتے تھے' چار ختم دن میں اور چار ختم رات میں' پھر
ان کے بعد ایسے لوگ تھے جو رات اور دن میں چار ختم کیا کرتے تھے' دو دن میں اور دو رات
میں اور ان کے بعد تین ختم اور پھر دو اور پھر ایک ختم قرآن اور کہا گیا کہ اس کے علاوہ بھی
لوگوں کا معمول رہا ہے اور ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے کہ ایسا طریقہ اچھا نہیں
ہے۔ ابن ابی داؤد نے مسلم بن مخراق سے روایت کیا ہے' وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ام
المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے عرض کی کہ کچھ مرد ایک رات میں دو یا تین قرآن ختم کرتے
ہیں' تو ام المومنین نے فرمایا: وہ پڑھیں یا نہ پڑھیں' میں تو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ پوری
رات قیام کرتی تھی اور آپ ﷺ سورہ بقرہ' سورہ آل عمران اور سورہ نساء پڑھتے تھے' مگر
اس طرح کہ جہاں کوئی بشارت کی آیت آتی تو دعا کرتے اور اس میں رغبت ظاہر کرتے اور
اگر خوف کی آیت گزرتی تو دعا کرتے اور پناہ مانگتے تھے۔

اس کے بعد وہ دور آیا' جس میں لوگ دو راتوں میں ایک قرآن پاک ختم کرتے تھے'
ازاں بعد لوگوں کا تین راتوں میں ایک قرآن مکمل ختم کرنے کا معمول رہا اور یہ عمدہ اور
خوبصورت طریقہ ہے۔

بہت سی جماعتوں نے تین راتوں سے کم میں قرآن پاک ختم کرنا مکروہ قرار دیا ہے اور
ان حضرات نے ترمذی اور ابوداؤد کی اس حدیث سے دلیل پکڑی ہے' جسے ان دونوں اماموں
نے صحیح قرار دیتے ہوئے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت کیا ہے' عبداللہ بن عمر

بیان کرتے ہیں:

لَا یَفْقَهُ مَنْ قَرَأَ الْقُرْاٰنَ فِیْ اَقَلَّ مِنْ ثَلَاثٍ۔ جو شخص تین دن سے کم میں قرآن پڑھ لیتا ہے' وہ اس میں سمجھ اور فقاہت حاصل نہیں کر سکتا۔

ابن ابوداؤد اور سعید بن منصور' ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے موقوفاً روایت کرتے ہیں' انہوں
نے فرمایا کہ "لَا تَقْرَءِ الْقُرْاٰنَ فِیْ اَقَلَّ مِنْ ثَلَاثٍ" "قرآن تین دن سے کم میں نہ پڑھو۔
ابوعبید' حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں' حضرت معاذ رضی اللہ عنہ تین دن
سے کم میں قرآن کا پڑھنا مکروہ قرار دیتے تھے۔
احمد اور ابوعبید نے سعید بن المنذر سے (ان سے صرف یہی ایک حدیث مروی ہے)
روایت کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ آیا میں تین دن
میں ایک پورا قرآن پڑھ لوں؟ تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہاں! اگر تو اتنی طاقت رکھتا
ہے۔

اور پھر اس درجہ کے لوگ بھی تھے' جو چار' پانچ' چھ اور سات دن میں ایک ختم کیا کرتے
تھے اور یہ طریقہ متوسط اور زیادہ خوبصورت ہے' اکثر صحابہ کرام اور تابعین رضی اللہ تعالیٰ عنہم
اجمعین کا یہی معمول رہا۔

امام بخاری اور مسلم نے عبداللہ بن عمرو سے روایت کی ہے' وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول
اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ ایک مہینے میں قرآن کا ایک ختم کیا کرو' میں نے عرض کیا:
یارسول اللہ ﷺ! میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں' آپ ﷺ نے فرمایا: تو دس
دن میں پڑھ لیا کرو' میں نے پھر عرض کیا: مجھ میں اس سے بھی زیادہ کی طاقت ہے' رسول اللہ
ﷺ نے ارشاد فرمایا: تو پھر سات دن میں ایک قرآن ختم کیا کرنا اور اس سے زیادہ نہ پڑھنا۔
ابوعبید اور دیگر محدثین نے واسع بن حیان کے طریق پر قیس ابن ابی صعصمہ سے (اور
اس کا صرف یہی راوی ہے) روایت کی ہے کہ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! میں کتنے دنوں
میں ایک قرآن ختم کیا کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: پندرہ دن میں۔ ابن ابی صعصمہ کہتے
ہیں: میں نے عرض کیا: میں اس سے زیادہ پڑھنے کی طاقت رکھتا ہوں' تو آپ ﷺ نے

فرمایا: پھر اسے ایک جمعہ (یعنی سات دن) میں پڑھ لیا کرو اس کے بعد آٹھ دن' پھر دس دن' پھر ایک ماہ اور پھر دو ماہ میں ختم کرنے والوں کا دور ہے۔ ابن ابی داؤد نے حضرت مکحول سے روایت کی ہے' انہوں نے فرمایا ہے کہ صحابہ کرام میں زیادہ پڑھنے والے بھی قرآن کو سات دن میں ختم کرتے تھے اور بعض ایک مہینے میں' بعض دو مہینوں میں اور بعض اس سے بھی زیادہ وقت میں ختم کرتے تھے۔ ابو اللیث نے البستان میں کہا ہے کہ وہ زیادہ نہیں تو ایک سال میں قاری کو دو مرتبہ قرآن پاک ختم کرنا چاہیے۔

اور حسن بن زیاد نے حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کا یہ قول مبارک نقل کیا ہے' انہوں نے فرمایا کہ جو شخص سال بھر میں دو مرتبہ قرآن پاک ختم کرے گا' وہ اس کا حق ادا کر دے گا' کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جس سال وصال ہوا' اس میں دو مرتبہ جبرائیل علیہ السلام کے ساتھ قرآن مجید کا دور فرمایا تھا۔

امام نووی شافعی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب ''الاذکار'' میں لکھتے ہیں: مختار مذہب یہ ہے کہ ختم قرآن کی مدت لوگوں کے حالات کے اعتبار سے مختلف ہے' چنانچہ جن لوگوں پر دقت نظری سے اور خوب غور وفکر کر کے پڑھنے سے قرآن کے لطائف اور علوم ومعارف عیاں اور منکشف ہوتے ہیں' ان کو اتنی مقدار ہی قرآن پاک پڑھنا چاہیے' جس سے تلاوت شدہ حصہ کو خوب اچھی طرح سمجھنا ممکن ہو۔

اسی طرح جو لوگ علم دین کی اشاعت' مقدمات کے فیصلوں یا اسی نوعیت کے اہم ترین دینی مشاغل میں مصروف اور عام دنیاوی دھندوں میں مشغول رہتے ہیں' ان کے لیے اس قدر تلاوت کر لینا کافی ہے' جو ان کے فرائض منصبی اور مصروفیات میں مخل نہ ہو اور جن لوگوں کو فرصت کے لمحات میسر ہوں اور دنیا کے جھمیلوں سے فارغ البال ہوں' انہیں جس قدر ممکن ہو اتنی تلاوت کریں' مگر یہ خیال رہے کہ پھر بھی اسی حد تک کہ جس سے نہ تھکاوٹ ہو اور نہ زبان میں پڑھتے ہوئے کسی قسم کی رکاوٹ پیدا ہونے لگے۔

قرآن مجید کی تلاوت کے آداب

☆ قرآن پاک پڑھنے کے لیے وضو کرنا مستحب ہے' کیونکہ وہ بہترین ذکر ہے اور حدیث

میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ناپاکی کی حالت میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا ناپسند فرماتے تھے۔

☆ قرآن مجید پاک صاف جگہ میں پڑھنا مسنون ہے اور اس کے لیے سب سے بہتر جگہ مسجد ہے۔ بہت سے علماء نے حمام اور راستوں میں قرآن پاک پڑھنے کو مکروہ قرار دیا ہے۔

☆ تلاوت کے وقت قبلہ کی طرف منہ کرنا' سر جھکا کر سکون اور خشوع وخضوع سے بیٹھنا مسنون ہے۔

☆ تعظیم قرآن اور منہ کی صفائی اور پاکی کے ارادہ سے مسواک کرنا بھی سنت ہے۔ امام ابن ماجہ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے موقوفاً اور بزاز رحمۃ اللہ تعالیٰ نے بھی انہی سے جید سند کے ساتھ مرفوعاً روایت کیا ہے:

اِنَّ اَفْوَاهَكُمْ طُرُقٌ لِلْقُرْاٰنِ فَطَيِّبُوْهَا بِالسِّوَاكِ.

تمہارے منہ قرآن کی گزرگاہیں ہیں' لہٰذا ان راستوں کو مسواک کے ذریعے صاف ستھرے کر کے رکھا کرو۔

☆ جب قرآن پڑھنے کا ارادہ کرو تو تلاوت کے شروع میں ''اعوذ باللہ'' پڑھنا سنت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. (النحل:۹۸)

یعنی جب تم قراءت قرآن کا ارادہ کرو تو ''اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم'' پڑھو۔

☆ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''اعوذ باللہ'' کے بارے میں صفت مختار ''اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم'' بیان کی گئی ہے۔

☆ اور سلف صالحین کی ایک جماعت سے ''السمیع العلیم'' کا اضافہ بھی منقول ہے۔

☆ حمید بن قیس سے ''اعوذ باللہ القادر من الشیطن الغادر'' کا قول مروی ہے۔

☆ ابو السمال سے ''اعوذ باللہ القوی من الشیطن الغوی'' منقول ہے' بعض کا قول ہے: ''اَعُوْذُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ'' اور بعض دوسروں سے ''اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ'' منقول ہے' تعوذ میں اس طرح کے اور اقوال بھی وارد ہیں۔

حلوانی اپنی کتاب الجامع میں لکھتے ہیں:

''استعاذہ کی کوئی ایسی حد نہیں ہے' جس سے تجاوز کرنا ممنوع ہو' جس کا دل چاہے اس میں کمی یا زیادتی کر سکتا ہے''۔

☆ اس بات کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے کہ سورہ براۃ کو چھوڑ کر ہر سورہ کے شروع میں ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' پڑھے اور بسم اللہ کا پڑھنا اس لیے لازم ہے کہ اکثر علماء کے نزدیک یہ مستقل آیت ہے' لہٰذا اگر وہ سورت میں داخل سمجھی جائے گی تو اس کا تارک علماء کے نزدیک ختم قرآن میں سے ایک حصہ کا تارک ہو جائے گا' ورنہ بصورت دیگر اگر وہ بسم اللہ کو سورت کے وسط میں بھی پڑھ لے گا تو بھی مناسب ہوگا' جیسا کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس بات پر صاد کیا ہے۔

☆ قرآن پاک ''ترتیل'' سے پڑھنا سنت ہے' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا'' (المزمل: ۴) قرآن ٹھہر ٹھہر کر پڑھو' ابوداؤد اور دوسرے محدثین نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قراءت کی صفت یہ بیان فرمائی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خوب واضح طور پر حرف حرف نمایاں کر کے قراءت کرتے تھے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ ان سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قراءت کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قراءت آواز کھینچ کر فرماتے تھے۔ پھر انہوں نے ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' پڑھ کر سنائی اور ''اللہ' الرحمن'' اور ''الرحیم'' سب کو آواز کی کشش کے ساتھ پڑھا۔

☆ صحیح بخاری اور مسلم میں ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ان سے کسی شخص نے کہا: میں مفصل (قرآن) کو ایک ہی رکعت میں پڑھا کرتا ہوں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جیسے شعروں کو جلد جلد پڑھتے ہیں؟ بے شک بعض لوگ ایسے ہیں' جو قرآن کو پڑھتے ضرور ہیں' مگر وہ ان کے حلق سے نیچے نہیں اترتا۔ کاش! اگر قرآن دل میں اترتا تو اس میں جاگزین ہو جاتا اور نفع بھی دیتا۔

علامہ آجری حملۃ القرآن میں لکھتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے مروی ہے' انہوں نے فرمایا: نہ تم اسے بادبان کشتی کی طرح پھیلاؤ اور نہ اشعار کی طرح سمیٹو' اس کے عجائب پر رک کر سوچو اور دلوں کو جھنجھوڑو اور آخر سورت تک پہنچنے کی فکر نہ کرو' اسی راوی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت کی ہے کہ قرآن مجید پڑھنے والے سے قیامت کے دن کہا جائے گا: پڑھتا جا' چڑھتا جا اور جس طرح دنیا میں ترتیل سے پڑھتا تھا' اسی طرح یہاں بھی ٹھہر ٹھہر کر پڑھ' بے شک بہشت میں تیری منزل وہاں ہوگی' جس جگہ تو آخری آیت کی قراءت کرے گا۔

آجری کی شرح مہذب میں ہے کہ علماء نے لکھا ہے کہ زیادہ تیزی سے قرآن مجید پڑھنا بالاتفاق مکروہ ہے' نیز علماء فرماتے ہیں کہ ایک پارہ ترتیل کے ساتھ پڑھنا' اتنے ہی وقت میں دو پارے بغیر ترتیل کے پڑھ لینے سے افضل ہے۔ علماء کا یہ بھی قول ہے کہ ترتیب کے ساتھ قرآن پڑھنا اس وجہ سے مستحب ہے کہ اس سے قرآن پڑھنے والے کو غور وفکر کرنے کا موقع ملتا ہے' علاوہ ازیں ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا عظمت اور توقیر کی علامت ہے اور اس سے دل میں اثر بھی زیادہ ہوتا ہے۔ اس بارے میں اختلاف ہے کہ آیا ترتیل کے ساتھ تھوڑی مقدار پڑھنا زیادہ فضیلت رکھتا ہے یا تیز تیز زیادہ مقدار پڑھنا افضل ہے؟

ہمارے علماء نے اس کا بہت خوبصورت جواب دیا ہے' وہ فرماتے ہیں کہ ترتیل کے ساتھ قراءت کا ثواب درجہ کے اعتبار سے زیادہ ہے اور زیادہ مقدار پڑھنے کا ثواب تعداد میں زیادہ ہے کیونکہ ہر حرف کے بدلے میں دس نیکیاں ملتی ہیں۔

زرکشی کی کتاب البرہان میں لکھا ہے:

ترتیل کا کمال یہ ہے کہ اس کے الفاظ پُر کر کے ادا کیے جائیں اور ایک حرف کو دوسرے سے جدا کر کے پڑھا جائے اور کسی حرف کو دوسرے میں داخل نہ کیا جائے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ تو ترتیل کا ادنیٰ درجہ ہے' اس کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی قراءت اس کے مقامات نزول کے لحاظ سے کی جائے' یعنی جس مقام پر دھمکی دی گئی ہے اور خوف دلایا گیا ہے' وہاں اسی طرح کی آواز پیدا کی جائے اور جس جگہ تعظیم کا موقع ہے' وہاں پڑھنے والے کے لب ولہجہ سے عظمت وجلالت کا انداز مترشح ہو۔

قرآن پاک پڑھتے وقت اس کے معانی میں تدبر کرنا اور اس کے مطالب کو سمجھنے کی

کوشش کرنا بھی سنت ہے' کیونکہ قرآن پڑھنے کا مقصد عظیم اور اہم ترین مطلوب اس کے مفہوم کو سمجھنا ہے' اسی سے شرح صدور ہوتا ہے اور قلوب میں نور پیدا ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ'' (ص:٢٩) ''(یہ قرآن) برکت والی کتاب ہے جو ہم نے آپ کی طرف نازل فرمائی تاکہ وہ اس کی آیتوں میں غور کریں'' دوسری آیت میں فرمایا: ''اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ'' (النساء:٨٢) پس کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے۔

تدبر کا مطلب یہ ہے کہ جو الفاظ تلاوت کر رہا ہے' ان کے معانی میں دل سے غور و فکر کرے اور ہر آیت کے معنی کو سمجھ کر گزرے' قرآن کے اوامر و نواہی میں تامل کرے اور اس بات پر یقین رکھے کہ یہ تمام احکام قابل تسلیم ہیں' نیز گذشتہ زمانے میں جو کوتاہی ہو گئی ہو' اس سے معذرت کرتے ہوئے بخشش مانگے' کسی رحمت کی آیت پر سے گزر ہو تو خوش ہو اور سوال و دعا کرے اور عذاب کی آیت آئے تو ڈرے اور پناہ مانگے' اللہ تعالیٰ کی تنزیہہ کا ذکر آئے تو اس کی عظمت اور تقدس کو بیان کرے اور دعا کا مقام آئے تو عاجزی کے ساتھ اپنی حاجات اللہ کی بارگاہ میں پیش کرے اور اس سے مراد طلب کرے۔

امام مسلم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے' وہ فرماتے ہیں کہ ایک رات میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی' آپ نے سورہ بقرہ شروع فرمائی اور پوری پڑھ لی' پھر آل عمران شروع کی اور پوری پڑھ لی' پھر سورہ النساء شروع کی اور ختم کی' آپ ترتیل کے ساتھ پڑھتے تھے' جب کسی ایسی آیت پر پہنچتے جس میں تسبیح باری تعالیٰ کا ذکر ہوتا تو سبحان اللہ کہتے' سوال و دعا والی آیت آتی تو دعا مانگتے اور تعوذ کی آیت آتی تو خدا کی پناہ میں آنے کی دعا کرتے۔

تدبر کی ایک صورت یہ ہے کہ قرآن پڑھنے والا اس کے حسب تقاضا اس کی نداء کا جواب دے' اس بات کی طرف حدیث میں بھی اشارہ ہے' جیسا کہ ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے کہ جو شخص سورہ ''وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ'' (التین:١) ''قسم انجیر کی اور زیتون کی'' آخر تک پڑھے تو اسے اختتام سورت پر کہنا چاہیے: ''بَلٰى وَاَنَا عَلٰى ذٰلِكَ مِنَ الشَّاهِدِيْنَ'' اور جو شخص سورہ ''لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ'' (القیامہ:١) ''میں قسم فرماتا ہوں قیامت کے دن

کی'' کو پڑھے اور آخر یعنی ''اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى'' (القیامہ:٤٠) ''کیا وہ مردے زندہ کرنے پر قادر نہیں'' تک پڑھے تو وہ کہے: ''بَلٰى'' (یعنی کیوں نہیں بلاشبہ اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ کرنے پر قادر ہے) اور جو شخص سورہ والمرسلات کو ''فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ'' (المرسلات:٥٠) ''پھر کون سی بات پر اس (قرآن) کے بعد وہ ایمان لائیں گے'' تک پڑھے تو اس آیت پر پہنچ کر ''امنا باللہ'' یعنی ہم اللہ پر ایمان لائے۔

امام احمد اور ابوداؤد حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں' انہوں نے فرمایا کہ حضور ﷺ جب سورہ ''سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى'' (الاعلیٰ:١) ''پاکی بیان فرمایئے اپنے رب کی جو سب سے بلند ہے'' کی قراءت کرتے تو فرماتے تھے: ''سبحان ربی الاعلی'' ''پاک ہے میرا رب جو بلند ہے''۔

امام ترمذی اور حاکم حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں' انہوں نے فرمایا کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ صحابہ کے ساتھ تشریف لے گئے اور ان کو سورہ الرحمٰن اوّل سے آخر تک پوری پڑھ کر سنائی' صحابہ کرام سن کر چپ رہے تو حضور ﷺ نے ان کی خاموشی کو دیکھ کر فرمایا: میں نے یہی سورت جب جنات کی قوم کے سامنے تلاوت کی تو انہوں نے اس کا تمہاری بہ نسبت بہت اچھا جواب دیا تھا' جب بھی میں آیت مبارکہ ''فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ'' (الرحمٰن:١٣) ''تو اے جن و انس! تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے'' پر پہنچتا تو جن جواب میں کہتے: ''وَلَا بِشَيْءٍ مِّنْ نِعَمِكَ رَبَّنَا نُكَذِّبُ فَلَكَ الْحَمْدُ'' ''اے ہمارے رب کریم! ہم تیری نعمتوں میں سے کسی نعمت کی تکذیب نہیں کر سکتے' تیرا شکر ہے' سب تعریفیں تجھ ہی کو زیب ہیں۔

ابن مردویہ' دیلمی اور ابن ابی الدنیا نے کتاب الدعاء میں ایک نہایت ضعیف سند کے ساتھ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ حضور ﷺ نے آیت مبارکہ ''وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ'' (البقرہ:١٨٦) ''اور (اے حبیب!) جب میرے بندے میرے بارے میں آپ سے دریافت کریں تو (آپ فرما دیں کہ) بے شک میں (ان کے) قریب ہوں'' پڑھی اور اس کے بعد اللہ کی جناب میں عرض کیا:

اَللّٰهُمَّ اَمَرْتَ بِالدُّعَاءِ وَتَكَفَّلْتَ اے میرے اللہ! تو نے دعا کرنے کا

بِالْاِجَابَةِ لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ لَاشَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ اَشْهَدُ اَنَّكَ فَرْدٌ اَحَدٌ صَمَدٌ لَمْ تَلِدْ وَلَمْ تُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّكَ كُفُوًا اَحَدٌ وَاَشْهَدُ اَنَّ وَعْدَكَ حَقٌّ وَلِقَاۗئُكَ حَقٌّ وَالْجَنَّةُ حَقٌّ وَالنَّارُ حَقٌّ وَالسَّاعَةُ اٰتِيَةٌ لَا رَيْبَ فِيْهَا وَاَنَّكَ تَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ۔

امر دیا اور اپنے ذمہ کرم پر لیا کہ اس کو قبول فرمائے گا' میں حاضر ہوں اے اللہ! میں حاضر ہوں' تیرا کوئی شریک نہیں بے شک نعمت اور شکر تیرے لیے ہے اور تیری ہی بادشاہی ہے' تیرا کوئی ساجھی نہیں' میں شہادت دیتا ہوں کہ تو ایک ہے' تو نہ کسی کا والد ہے اور نہ بیٹا اور کوئی تیرا ہمسر نہیں ہے' میں شہادت دیتا ہوں کہ تیرا وعدہ سچا ہے' جنت اور دوزخ حق ہیں اور قیامت آنے والی ہے اور اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ تو ضرور قبروں سے مردوں کو زندہ فرما کر اٹھائے گا۔

ابوداؤد اور دوسرے محدثین وائل بن حجر سے حدیث نقل کرتے ہیں' انہوں نے بیان کیا ہے کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو سنا آپ ﷺ نے پڑھا: ''ولا الضالین'' اور اس کے بعد آپ نے کششِ صوت کے ساتھ ''آمین'' فرمایا اور قرآن کی نداء کا جواب دینے کے یہی معنی ہیں۔

طبرانی کی روایت میں ''قَالَ اٰمِيْنَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ'' کے الفاظ ہیں' یعنی آپ ﷺ نے تین مرتبہ آمین فرمایا۔

اور امام بیہقی سے یہی حدیث ''قَالَ رَبِّ اغْفِرْلِيْ آمین''؛ ''کہا: اے میرے رب! میری مغفرت فرما' آمین'' کے الفاظ کے ساتھ مروی ہے۔

علامہ نووی شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

تلاوت قرآن کے آداب سے ایک بات یہ بھی ہے کہ جب آیت مبارکہ ''وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ۨ ابْنُ اللّٰهِ'' (التوبہ: ۳۰) ''اور یہود نے کہا: عزیر اللہ کا بیٹا ہے'' اور آیت ''وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ'' (المائدہ: ۶۴) ''اور یہودیوں نے کہا: اللہ کا ہاتھ بندھا ہوا ہے'' یا

اس قسم کی دیگر آیات کی قراءت کرے تو قاری کو چاہیے کہ اپنی آواز پست اور آہستہ کرے۔ چنانچہ امام نخعی رحمۃ اللہ علیہ ایسے موقع پر ایسا ہی کرتے تھے۔

☆ تلاوت قرآن مجید کے وقت (مناسب جگہ) رونا مستحب ہے' اور جس شخص کو رونا نہ آئے تو زبردستی رونی صورت بنا لے' سوز وگداز اور حزن وملال کا اظہار بھی ٹھیک ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ'' (بنی اسرائیل: ۱۰۹) اور وہ گریہ کناں منہ کے بل گر پڑتے ہیں۔

صحیح بخاری اور مسلم میں یہ حدیث ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کے سامنے قراءت کی تو آپ ﷺ کی دونوں چشم ہائے مبارک اشک بار ہوگئیں۔

☆ امام بیہقی نے اپنی کتاب ''شعب الایمان'' میں حضرت سعد بن مالک سے مرفوعاً حدیث نقل کی ہے کہ بے شک یہ قرآن پاک رنج اور غم کے ساتھ نازل ہوا ہے' اس لیے جب تم اس کی تلاوت کرو تو گریہ زاری کرو اور اگر گریہ طاری نہ ہو تو رونے والے جیسی صورت بنا لو اور اسی کتاب میں عبدالملک بن عمیر سے یہ حدیث مرسلاً روایت کی گئی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: میں تمہارے سامنے ایک سورت کی تلاوت کرتا ہوں' جو شخص اسے سن کر رو دے گا' اس کے لیے جنت ہے' اگر تم کو رونا نہ آئے تو بتکلف رونی شکل بنا لو۔

☆ مسند ابی یعلیٰ میں یہ حدیث ہے کہ تم قرآن پڑھتے ہوئے غمگین ہو جایا کرو کیونکہ قرآن حزن وغم کے ساتھ نازل ہوا ہے۔

☆ طبرانی کی روایت میں ہے کہ حسن قراءت یہ ہے کہ قاری قراءت دردناک اور غمناک لہجہ میں کرے۔

☆ شرح مہذب میں کہا گیا کہ رونے کی قدرت حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ تہدید (دھمکی)' وعید شدید (عذاب کی خبر) اور عہد ومیثاق والی آیات کی تلاوت کرتے وقت ان میں غور وفکر کرے اور سوچے کہ مجھ سے کہاں کہاں کوتاہی ہوئی اور اگر ان تہدیدات (دھمکیوں) اور اخبار عذاب پر بھی اسے رونا نہیں آتا تو پھر اس کو اپنی اس سنگ دلی اور بدبختی پر پھوٹ پڑنا چاہیے کہ میں تو پتھر سے بھی گیا گزرا انسان ہوں' واقعی یہ بڑی

مصیبت ہے کہ انسان اور رونا نہ آئے۔

☆ خوبصورت آواز سے قرآن پڑھنا سنت ہے۔ قراءت قرآن میں تحسین صوت اور لہجہ کی تزئین و آراستگی پر دلیل کے طور پر یہ حدیث پیش کرنا کافی ہے' جسے ابن حبان اور دوسرے محدثین نے روایت کیا ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ''زَیِّنُوا الْقُرْاٰنَ بِاَصْوَاتِکُمْ'' اپنی آواز سے قرآن کو زینت دو۔ سنن دارمی میں یہ روایت بالفاظ ''حَسِّنُوا الْقُرْاٰنَ بِاَصْوَاتِکُمْ'' مروی ہے' قرآن کو اپنی آواز سے حسن بخشو۔ کیونکہ خوبصورت آواز سے قرآن کا حسن دوچند ہو جاتا ہے۔ ''فَاِنَّ الصَّوْتَ الْحَسَنَ یَزِیْدُ الْقُرْاٰنِ حُسْنًا'' ''بے شک خوب صورت آواز قرآن کے حسن میں اضافہ کرتی ہے''۔ بزاز وغیرہ نے حدیث ''حُسْنُ الصَّوْتِ زِیْنَۃُ الْقُرْاٰنِ'' ''خوبصورت آواز (سے پڑھنا) قرآن کی زینت ہے'' کے الفاظ میں روایت کی ہے' اس کے متعلق اور بھی بہ کثرت احادیث صحیحہ وارد ہوئی ہیں۔

اور اگر کوئی شخص خوش آواز نہ ہو تو جس قدر ہو سکے آواز میں خوش الحانی پیدا کرنے کی سعی کرے' مگر اس حد تک نہ جائے کہ گاتا نغمہ سرائی کرتا ہوا معلوم ہو۔

خوش الحان طریقے پر قرآن پڑھنے کے متعلق ایک حدیث میں یوں آیا ہے: (ترجمہ:) تم لوگ قرآن کو عرب کے لہجوں اور ان کی آواز میں پڑھا کرو اور اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) اور فاسقوں کے لہجہ سے پرہیز کرو اور عنقریب زمانہ میں بہت سے لوگ ایسے ظاہر ہوں گے' جو قرآن کو راہبوں اور گویوں کی مانند پڑھیں گے اور قرآن ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا' ان کے دل خوش فہمی میں مبتلا ہوں گے' اس طرح ان لوگوں کے دل بھی جو ان کی حالت پر خوش ہوئے ہوں گے' وہ بھی دھوکا میں مبتلا ہوں گے۔ (طبرانی و بیہقی)

علامہ نووی فرماتے ہیں:

حدیث صحیح کی رو سے خوش آواز قاری سے قراءت کی درخواست کرنا اور اسے دھیان سے سننا مستحب ہے' ایک جماعت کا قراءت میں اجتماع اور دور کے ساتھ قراءت کرنا' ان دونوں باتوں میں کوئی مضائقہ نہیں۔ دور یہ ہے کہ کچھ لوگ ایک حصہ پڑھ لیں' پھر دوسرے بعض لوگ باقی کچھ حصہ کی قراءت کر لیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

☆ قرآن پاک ''تفخیم'' کے ساتھ پڑھنا مستحب ہے' اس کی دلیل حاکم کی یہ حدیث ہے کہ ''نزل القرآن بالتفخیم'' ''قرآن کا نزول ''تفخیم'' کے ساتھ ہوا ہے۔

حلیمی ''تفخیم'' کا مفہوم واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اس کا معنی یہ ہے کہ قرآن پاک مردوں کی طرح پڑھے' اس میں عورتوں کے کلام جیسی لوچدار آواز نہ نکالے اور اس امر میں ''امالہ'' کی کراہت کا کوئی داخل نہیں' جو کہ بعض قراء کا مختار ہے اور ممکن ہے کہ قرآن کا نزول ''تفخیم'' ہی کے ساتھ ہوا ہو اور بعد میں اس بات کی رخصت دے دی گئی ہو کہ جس لفظ کا امالہ کرنا قراءت میں اچھا ہو' اس کا امالہ کر لیں۔

اونچی آواز سے قراءت کرنے کا بیان

ایسی احادیث بہ کثرت آئی ہیں' جو اس امر کی متقاضی ہیں کہ قراءت بلند آواز سے کرنا مستحب ہے' اور دوسری طرف بعض حدیثوں سے آہستہ آواز میں قراءت کرنے کا استحباب ثابت ہوتا ہے۔

پہلے امر کے متعلق صحیح بخاری اور مسلم کی یہ حدیث ہے: اللہ تعالیٰ کسی شے کو اسی طرح نہیں سنتا' جس طرح خوش آواز نبی کے خوش الحانی کے ساتھ بلند آواز میں قرآن پڑھنے کو سنتا ہے' دوسرے امر کے متعلق ابوداؤد' ترمذی اور نسائی کی یہ حدیث بہ طور دلیل پیش کی جاتی ہے کہ بلند آواز میں قرآن پڑھنے والا اعلانیہ صدقہ دینے والے کی مثل ہے اور آہستہ قراءت کرنے والا پوشیدہ طور پر صدقہ کرنے والے کی طرح ہے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: مذکورہ بالا ان دو حدیثوں میں تطبیق یوں ممکن ہے کہ جس جگہ ریاکاری کا اندیشہ ہو' وہاں آہستہ قراءت کرنا افضل ہے یا بلند آواز میں پڑھنے سے نمازیوں یا سونے والوں کو اذیت پہنچتی ہو تو وہاں آہستہ پڑھنا بہتر ہے۔

اور جہر (بلند آواز) سے پڑھنا' اس کے علاوہ صورتوں میں ہے کیونکہ عمل اسی میں زیادہ ہے اور اس لیے بھی کہ اس کا فائدہ سامعین کو بھی ہوتا ہے' پھر خود قاری کا قلب بھی بیدار ہوتا ہے اور فکر کے لیے اس کی توجہ جمع رہتی ہے اور اسے اپنی قراءت سننے کی مصروفیت نیند نہیں

آنے دیتی اور اس کی چستی بڑھتی رہتی ہے۔ ان دونوں حدیثوں کو جمع کرنے اور ان کے مابین تطبیق دینے کے عمل کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے' جس کو ابوداؤد نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد میں اعتکاف کی حالت میں تھے کہ آپ نے کچھ لوگوں کو بلند آواز میں قراءت کرتے سنا' اس پر آپ نے پردہ اٹھا کر ارشاد فرمایا: سنو! تم میں سے ہر آدمی اپنے رب سے مناجات کرنے والا ہے' لہٰذا ایک دوسرے کو اذیت نہ دو اور قراءت میں اپنی آوازیں اونچی نہ کرو۔

☆ بعض علماء کا قول ہے کہ مستحب طریقہ یہ ہے کہ کچھ قرآن پاک کا حصہ آہستہ اور کچھ حصہ بلند آواز سے پڑھ لیا جائے' اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ آہستہ پڑھنے والا بعض اوقات پریشان ہو جاتا ہے اور وہ بلند آواز سے پڑھنا پسند کرتا ہے' اسی طرح بلند آواز میں پڑھنے والا جب اکتاہٹ محسوس کرتا ہے تو وہ چاہتا ہے کہ راحت حاصل کرے اور اس طرح پڑھنے کی کیفیت بدل کر آرام حاصل کیا جا سکتا ہے۔

مصحف میں دیکھ کر پڑھنے کا بیان

حفظ کی بناء پر زبانی پڑھنے کی نسبت قرآن پاک میں سے دیکھ کر پڑھنا افضل ہے کیونکہ قرآن پاک کا دیکھنا بھی ایک عبادت مقصودہ ہے۔

امام نووی شافعی فرماتے ہیں:

ہمارے اصحاب (شوافع) کا یہی قول ہے اور سلف صالحین بھی یہی کہتے تھے' میں نے نہیں دیکھا کہ کسی نے بھی اس بارے میں اختلاف کیا ہو' علامہ نووی کہتے ہیں اور اگر یوں کہا جاتا تو زیادہ اچھا ہوتا کہ اس بارے میں لوگوں کے مختلف ہونے کی وجہ مختلف حکم ہیں۔ جس شخص کا خشوع اور تدبر مصحف میں دیکھ کر پڑھنے کی حالت میں اور حفظ کی بناء پر زبانی پڑھنے کی حالت میں دونوں طرح سے یکساں رہتا ہے۔ اس کے لیے قرآن پاک سے دیکھ کر پڑھنا افضل ہے۔

اور جس شخص کے خشوع وخضوع میں زبانی پڑھنے میں دیکھ کر پڑھنے کی بہ نسبت زیادتی اور اضافہ ہوتا ہے' اس کے لیے زبانی پڑھنا ہی افضل ہے اور تطبیق کا یہ طریقہ بہت اچھا ہے۔

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

مصحف میں دیکھ کر پڑھنے کا ثواب زیادہ ہونے کی دلیل وہ حدیث ہے' جس کو طبرانی اور امام بیہقی نے ''شعب الایمان'' میں اوس الثقفی سے مرفوعاً نقل کیا ہے کہ زبانی پڑھنے کا ثواب ایک ہزار درجے اور قرآن پاک میں دیکھ کر قراءت کرنے کا اجر وثواب دو ہزار درجے ہیں۔

ابوعبید نے ایک کمزور سند کے ساتھ روایت بیان کی ہے کہ ''مصحف میں دیکھ کر قرآن کے پڑھنے کو زبانی قرآن پڑھنے پر وہی فضیلت حاصل ہے جو فرض کو نفل پر ہوتی ہے''۔ امام بیہقی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت کی ہے کہ ''مَنْ سَرَّهٗ اَنْ یُّحِبَّ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ فَلْيَقْرَاْ فِی الْمُصْحَفِ'' جس شخص کا دل اللہ اور رسول کی محبت سے خوش ہوتا ہے' اس کو چاہیے کہ دیکھ کر قرآن پڑھے۔ بیہقی نے کہا کہ یہ حدیث منکر ہے۔

پھر بیہقی ہی نے ایک حسن سند کے ساتھ انہی سے موقوفاً روایت بیان کی ہے:

اَدِيْمُو النَّظْرَ فِی الْمُصْحَفِ. ہمیشہ مصحف میں دیکھ کر پڑھا کرو۔

☆ اور آداب قراءت میں سے ایک بات یہ بھی ہے کہ جب قاری پڑھتے پڑھتے گھبرا کر بھول جائے اور اس کو سمجھ نہ آ رہی ہو کہ اس کے بعد کون سی آیت پڑھنی ہے' پھر وہ اس مقام کے بارے میں کسی دوسرے شخص سے پوچھے تو اس شخص کو ادب سے بتانا چاہیے' کیونکہ ابن مسعود' نخعی اور بشیر بن ابی مسعود سے مروی ہے' وہ فرماتے ہیں کہ جب تم میں سے ایک شخص اپنے بھائی سے کسی آیت کے متعلق سوال کرے تو اس کو چاہیے کہ اس سے پہلی آیت پڑھ کر چپ ہو جائے اور یہ نہ کہے کہ فلاں فلاں آیت کیسے ہیں؟ کیونکہ اس طرح کہنے سے اس کو اشتباہ لگے گا۔

☆ قراءت کے آداب میں سے ایک بات یہ بھی ہے کہ ترتیب کے مطابق قرآن کو پڑھا جائے۔ شرح المہذب میں یہ قول ہے کہ مصحف کی موجودہ ترتیب حکمت پر مبنی ہے' لہٰذا اس ترتیب کا لحاظ رکھنا چاہیے اور سوائے ان حالتوں کو جو شرعاً ثابت ہیں' کسی صورت میں بھی ترتیب کو چھوڑنا درست نہ ہوگا' جیسے مثلاً جمعہ کے دن فجر کی نماز میں سورہ ''الٓمّٓ تَنْزِيْل'' اور سورہ ''هَلْ اَتٰی'' پڑھنا اور اس طرح کی اور بھی مثالیں ہیں' اس لیے کہ اگر

سورتوں میں تفریق کر دی جائے یا ان کو برعکس پڑھا جائے تو یہ جائز تو بے شک ہے' مگر افضل طریقے کا ترک لازم آتا ہے۔

نیز لکھتے ہیں کہ رہی یہ بات کہ ایک ہی سورت کو آخر کی جانب سے اوّل کی طرف الٹا پڑھنا' تو یہ بالاتفاق سب کے نزدیک ممنوع ہے کیونکہ اس انداز پر پڑھنے سے قرآن حکیم کا اعجاز اور ترتیب آیات کی حکمت فوت ہو جاتی ہے۔

صاحب شرح المہذب فرماتے ہیں: میں کہتا ہوں کہ اس کے متعلق ایک ''اثر'' بھی وارد ہے' جس کو علامہ طبرانی نے ''سند جید'' کے ساتھ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے: ''اِنَّهٗ سُئِلَ عَنْ رَّجُلٍ يَقْرَأُ الْقُرْاٰنَ مَنْكُوْسًا قَالَ ذَاكَ مَنْكُوْسُ الْقَلْبِ'' حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایک ایسے شخص کے متعلق سوال کیا گیا' جو قرآن پاک کو ترتیب کے خلاف الٹی طرف کو پڑھتا ہو تو انہوں نے جواب دیا کہ اس شخص کا قلب بہک گیا ہے کہ بیک کو جاتا ہے (یعنی وہ دل کا اندھا ہے کہ اوندھا چلتا ہے)۔

☆ اور ایک سورت کو دوسری سورت کے ساتھ مخلوط کر کے پڑھنے کا کیا حکم ہے؟ تو اس کے بارے میں حلیمی کا قول یہ ہے کہ ادب یہی ہے کہ اس انداز کو ترک کر دے' اس کی دلیل وہ حدیث ہے جس کو ابو عبید نے حضرت سعید بن المسیب سے روایت کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ' حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے پاس سے گزرے' اس وقت حضرت بلال رضی اللہ عنہ اس طرح قراءت کر رہے تھے کہ کچھ اس سورت سے لے لیتے تھے اور کچھ دوسری سورت سے' اس کے بعد آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

☆ اے بلال! میں نے گزرتے ہوئے تمہیں ایک سورت کے حصہ کو دوسری سورت کے حصہ سے مخلوط کر کے قراءت کرتے ہوئے سنا تھا' بلال نے عرض کی: یارسول اللہ! میں ایک پاکیزہ چیز کو پاکیزہ چیز کے ساتھ ملاتا ہوں' حضور ﷺ نے فرمایا: ''اِقْرَاِ السُّوْرَةَ عَلٰى وَجْهِهَا اَوْ قَالَ عَلٰى نَحْوِهَا'' یہ حدیث مرسل اور صحیح ہے۔ ابوداؤد کے نزدیک یہ حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے سوائے آخری حصہ کے موصول حدیث ہے۔

☆ ابو عبید نے اس حدیث کی تخریج ایک اور طریقہ پر عفرہ کے مولی عمر سے بھی کی ہے کہ

رسول اللہ ﷺ نے حضرت بلال سے فرمایا: جب تم کوئی سورت پڑھو تو اسے مکمل کر کے آگے گزرا کرو۔ ابو عبید ہی کہتے ہیں کہ ہم سے معاذ نے ابن عون کے واسطہ سے حدیث بیان کی۔ ابن عون کہتے ہیں کہ میں نے ابن سیرین سے اس شخص کے متعلق پوچھا' جو ایک سورت سے دو آیتیں پڑھ کر اس کو چھوڑ دے اور پھر دوسری سورت پڑھنا شروع کر دے۔

تو ابن سیرین نے جواب دیا کہ تم میں سے ہر شخص کو لاشعوری طور پر بھی اس قسم کے بڑے گناہ سے بچنا چاہیے۔

☆ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' انہوں نے فرمایا: جب تم کوئی سورت پڑھنا شروع کرو' پھر اس کو چھوڑ کر کسی دوسری سورت کی طرف منتقل ہونے کا ارادہ ہو تو سورہ ''قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ'' (الاخلاص:۱) ''آپ فرما دیجئے: وہ اللہ ہے یکتا'' کی طرف پھر جاؤ اور جب سورہ اخلاص ہی کو شروع کرو تو پھر اس کو مکمل کیے بغیر کسی اور سورت کو شروع نہ کرو۔

☆ ابن ابی الھذیل سے یہ روایت کی ہے کہ ان کا قول ہے: صحابہ کرام علیہم اجمعین اس بات کو ناپسند کرتے تھے کہ کوئی شخص آیت کا بعض حصہ پڑھ کر باقی حصے کو چھوڑ دے۔

☆ ابو عبید نے کہا ہے کہ ہمارے نزدیک مختلف آیات کی قراءت کے مکروہ اور ناپسند ہونے کا معاملہ اسی طرح ہے' جیسا کہ حضور ﷺ نے بلال پر ایسا کرنے سے انکار فرمایا اور ابن سیرین نے بھی اس کو ناپسند قرار دیا ہے۔

علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی مذکورہ بالا حدیث کی توجیہ میرے نزدیک یہ ہو سکتی ہے کہ کسی شخص نے ایک سورت پڑھنا شروع کی اور اسے پورا کرنے کا ارادہ بھی کیا تھا' لیکن درمیان میں ایک اور سورت کے پڑھنے کا خیال آ گیا تو اس کے لیے یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ سورہ ''قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ'' (آپ فرما دیجئے: وہ اللہ ہے یکتا) پڑھ لے۔

لیکن اگر کوئی شخص قراءت شروع کرنے کے بعد ایک آیت سے دوسری آیت کی طرف پھر جانے کا ارادہ کرتا ہے اور قرآن پاک کی آیات کو ترک کرنے کا مرتکب ہوتا ہے تو ایسا عمل

کسی بے علم شخص سے ہی متوقع ہو سکتا ہے کیونکہ اگر قرآن حکیم کی آیات کو ایک ترتیب پر نازل کرنے کا کوئی فائدہ نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ قرآن کو اسی بے ترتیبی کے انداز پر نازل فرما دیتا' ترتیب کا لحاظ نہ فرماتا۔

☆ حلیمی کا قول ہے کہ ہر ایسا حرف جس کو فن قراءت کے امام قاری نے قراءت میں ثابت کیا ہے' اس کا پورا پورا حق ادا کرنا مسنون ہے' تا کہ قراءت کرنے والا اس چیز کو جو قرآن ہونے میں شامل تصور ہوتی ہے' اس کا ادا کرنے والا قرار پا سکے۔

ابن الصلاح اور نووی رحمہما اللہ تعالیٰ دونوں کا بیان ہے کہ جب قرآن پاک پڑھنے والا مشہور قراء میں سے کسی ایک کی قراءت شروع کرے تو اس کو چاہیے کہ جب تک کلام کا ربط قائم رہے' اس وقت تک برابر وہی ایک قراءت پڑھتا جائے اور جب ربط کلام ختم ہو جائے تو پھر پڑھنے والے کو اختیار ہے کہ اگر وہ چاہے تو دوسری قراءت شروع کر دے' لیکن افضل یہی ہے کہ جب تک اسی مجلس میں ہے پہلی قراءت پر ہی مداومت کرے۔

☆ جب قرآن کی تلاوت ہو رہی ہو تو مسنون طریقہ یہ ہے کہ دھیان سے قرآن کو سنے اور اس دوران شور وغل اور باتیں نہ کرے' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ. (الاعراف: ۲۰۴)

جب قرآن پڑھا جائے تو غور سے سنو اور خاموش رہو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔

☆ آیت سجدہ کی قراءت کے وقت سجدہ کرنا سنت ہے۔

علامہ نووی شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

• قرآن پاک پڑھنے کے لیے پسندیدہ اوقات میں سے سب سے بہتر اوقات وہ ہیں' جو نماز کے لیے ہوتے ہیں' پھر رات کا وقت' پھر صبح کا پہلا پہر' موزوں ہے' مغرب و عشاء کے درمیان قراءت بہت پسندیدہ اور دن میں افضل وقت صبح کے بعد کا وقت ہے' ویسے تو قرآن کی تلاوت کسی وقت بھی مکروہ نہیں ہوتی۔

باقی ابن ابی داؤد کا وہ قول جو انہوں نے معاذ بن رفاعہ کے واسطہ سے ان کے مشائخ سے نقل کیا ہے کہ وہ لوگ نماز عصر کے بعد قرآن پڑھنے کا مکروہ جانتے تھے اور فرماتے تھے کہ اس وقت پڑھنا یہود کا معمول رہا ہے تو یہ ایک غیر مقبول بات ہے' اس کا کوئی سر پیر نہیں ہے۔

☆ قراءت قرآن کے لیے سال کے دنوں میں سے عرفہ کا دن' پھر جمعہ' پھر پیر' پھر جمعرات کا دن پسندیدہ دن ہیں۔

اور آخری دس دس دنوں میں سے رمضان المبارک کا آخری عشرہ اور ذوالحجہ کا پہلا عشرہ اور مہینوں میں سے رمضان المبارک کا مہینہ افضل اور مختار ہے۔

قرآن پڑھنے کی ابتداء کرنا جمعۃ المبارک کی شب اور ختم قرآن پاک کے لیے جمعرات کی شب بہتر ہے' کیونکہ ابن ابی داؤد سے عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کا یہی معمول منقول ہے۔

ختم قرآن شریف دن یا رات کے اوّل حصہ میں افضل ہے' اس لیے کہ دارمی نے سند حسن کے ساتھ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے' انہوں نے فرمایا کہ اگر قرآن پاک کا ختم آغاز شب میں ہو تو فرشتے قرآن ختم کرنے والے کے حق میں صبح تک دعائے رحمت کرتے رہتے ہیں اور اگر دن کے اوّل حصہ میں ختم کرے تو شام تک فرشتے اس کے لیے رحمت کی دعا کرتے رہتے ہیں۔

احیاء العلوم میں یہ قول بھی ہے کہ دن کے آغاز کا ختم القرآن فجر کی دو رکعتوں میں کیا جائے اور اوّل شب کا ختم قرآن نماز مغرب کی دو رکعت سنت میں کرنا بہتر ہے۔

☆ ختم قرآن کے دن روزہ رکھنا مسنون ہے' اس بات کو ابن ابی داؤد نے تابعین رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے نقل کیا ہے۔ ختم قرآن پاک میں اہل خانہ اور دوستوں کو شریک دعوت کرنا افضل ہے۔ امام طبرانی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی نسبت حدیث بیان کی ہے کہ ان کا معمول تھا کہ جب قرآن پاک ختم کرتے تو ختم شریف میں اپنے اہل قبیلہ کا اجتماع منعقد کرتے اور ان کے لیے دعا مانگتے تھے' ابن ابی داؤد نے حکم بن عتبہ سے روایت کیا ہے' انہوں نے کہا کہ مجھے مجاہد نے مدعو کیا' میں گیا تو ان کے پاس ابن ابی امامہ بھی تھے' مجاہد اور ابن ابی امامہ دونوں نے مجھ سے کہا کہ ہم نے آپ کو اس لیے مدعو کیا ہے کہ آج ہمارے یہاں ختم قرآن پاک کا پروگرام ہو رہا ہے اور ختم قرآن کے وقت دعا قبول ہوتی ہے۔

مجاہد ہی سے روایت ہے' وہ فرماتے ہیں کہ ختم قرآن پاک کے موقع پر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجتماع منعقد کرتے تھے اور انہی کا قول ہے کہ ختم قرآن کے وقت اللہ کی رحمت

نازل ہوتی ہے۔

☆ سورۃ الضحیٰ سے آخر قرآن تک ہر سورہ کے ختم پر ''تکبیر'' کہنا مستحب ہے' اہل مکہ کے نزدیک قراءِ قرآن کا اسی طرح معمول ہے۔

امام بیہقی نے کتاب ''شعب الایمان'' میں اور ابن خزیمہ نے ابن ابی بزہ کے طریق سے بیان کیا ہے کہ میں نے عکرمہ بن سلیمان سے سنا' وہ بیان کرتے تھے کہ میں نے اسمٰعیل بن عبداللہ المکی کے سامنے قراءت کی' جس وقت میں سورہ الضحیٰ پر پہنچا تو انہوں نے کہا: یہاں سے تکبیر کہو' حتیٰ کہ قرآن پاک ختم کرو۔ میں نے عبداللہ بن کثیر کے ساتھ قراءت پڑھی تھی' انہوں نے مجھے یہی حکم دیا تھا اور فرمایا تھا کہ میں نے مجاہد سے قراءت سیکھی تھی' انہوں نے مجھے اسی طرح حکم دیا تھا اور مجاہد نے مجھے خبر دی ہے کہ انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس قراءت کی تعلیم پائی تو ابن عباس نے انہیں اسی بات کی ہدایت کی تھی اور فرمایا تھا کہ میں نے ابی بن کعب رضی اللہ عنہما کے پاس قراءت سیکھی تو انہوں نے مجھے اسی کا امر دیا تھا' یہ حدیث ہم نے اسی طرح موقوفاً روایت کی ہے' پھر اسی حدیث کو امام بیہقی نے دوسرے طریق پر ابن ابی بزہ ہی سے مرفوعاً بھی روایت کیا ہے اور اسی طریق پر (یعنی مرفوعاً) حاکم نے مستدرک میں یہ حدیث بیان کی ہے اور اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے' اس حدیث کے بزی سے اور بھی بہ کثرت طرق منقول ہیں۔

موسیٰ بن ہارون کا قول ہے' انہوں نے کہا ہے کہ مجھ سے بزی نے یہ بیان کیا ہے کہ مجھ سے حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اگر تو نے تکبیر کو چھوڑ دیا تو حضور ﷺ کی ایک سنت کا چھوڑنے والا ہوگا۔

حافظ عمادالدین ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حاکم کا یہ قول اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ انہوں نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔

☆ قراءتِ قرآن میں سنت یہ ہے کہ جب ایک ختم ہو تو اس کے ساتھ ہی دوسرا شروع کر دے' اس لیے کہ امام ترمذی اور دیگر محدثین نے یہ حدیث بیان کی ہے:

اَحَبُّ الْاَعْمَالِ اِلَى اللّٰهِ الْحَالُّ الْمُرْتَحِلُ الَّذِيْ يَضْرِبُ مِنْ اَوَّلِ الْقُرْاٰنِ

اِلٰى اٰخِرِهٖ كُلَّمَا حَلَّ ارْتَحَلَ.

جب کوئی شخص قرآن پاک کو اول سے آخر تک پڑھتا ہے اور جب اختتام کو پہنچتا ہے تو پھر دوبارہ اس کو شروع کر دیتا ہے' ایسا طریقہ اللہ تعالیٰ کو بہت زیادہ پسند ہے۔

دارمی نے سند حسن کے ساتھ بواسطہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما' حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ جب ''قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ'' (الناس:1) ''تم کہو میں اس کی پناہ میں آیا جو سب لوگوں کا رب ہے'' پڑھ لیتے تو الحمد سے شروع فرما دیتے' پھر اس کے بعد سورہ البقرہ سے بھی ''وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ'' (البقرہ:5) ''اور وہی مراد کو پہنچنے والے'' تک پڑھتے' پھر آخر میں ختم قرآن شریف کی دعا کر کے مجلس برخاست فرماتے۔

☆ کسی غیر سے گفتگو کرنے کے لیے قراءت کو بند کرنا مکروہ ہے کیونکہ اللہ کے کلام پر کسی غیر کے کلام کو ترجیح دینا مناسب نہیں ہے۔ بیہقی نے اس امر کی تائید میں صحیح بخاری کی یہ حدیث پیش کی ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما جب قرآن کی تلاوت میں مشغول ہوتے تھے تو فارغ ہونے تک کسی سے بات چیت نہیں کرتے تھے' اسی طرح تلاوت کے دوران میں ہنسنا' عبث کام کرنا اور ایسی چیز کی طرف دیکھنا جس سے ذہن قراءت سے غافل ہو جائے' ایسی سب باتیں مکروہ ہیں۔

☆ غیر عربی زبان میں محض ترجمہ قرآن مجید پڑھنا (جس کے ساتھ عربی نہ ہو) مطلقاً ناجائز ہے' چاہے آدمی عربی زبان کو اچھی طرح جانتا ہو یا نہ جانتا ہو' نماز کے اندر ہو یا نماز سے خارج' بہرحال ناجائز ہے۔

☆ شاذ قراءت کا پڑھنا ناجائز ہے۔

ابن عبدالبر سے منقول ہے کہ اس پر اجماع ہے' مگر موہوب الجزری نے نماز کے علاوہ اس کا جائز ہونا ذکر کیا ہے' وہ قراءت شاذ کے جواز کو حدیث کے روایت بالمعنی جائز ہونے پر قیاس کرتے ہیں۔

☆ قرآن مجید کو ذریعہ معاش بنانا مکروہ ہے۔

آجری نے عمران بن حصین کی حدیث سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ جو شخص قرآن پاک پڑھے' اس کے وسیلہ سے اللہ تعالیٰ سے سوال کرے' کیونکہ قریب ہی ایک زمانہ آئے گا' جب ایسے لوگ ظاہر ہوں گے جو قرآن پڑھ کر اس کو لوگوں سے مانگنے کا ذریعہ بنا لیں گے۔

☆ ایسا کہنا مکروہ ہے کہ میں فلاں آیت بھول گیا ہوں' بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ مجھے بھلا دی گئی ہے۔ صحیح بخاری اور مسلم کی حدیث میں ایسا کہنے کی ممانعت آئی ہے۔

☆ قرآن پاک یاد کر کے بھلا دینا گناہ کبیرہ ہے۔

ابوداؤد اور دوسرے محدثین نے یہ حدیث نقل کی ہے کہ حضور ﷺ فرماتے ہیں:

میرے سامنے میری امت کے گناہوں کو پیش کیا جاتا ہے اور میں نے اس سے بڑا کوئی گناہ نہیں دیکھا کہ ایک آدمی نے قرآن حکیم کی کوئی سورت یا آیت حفظ کی' پھر یاد کرنے کے بعد اس کو بھلا دیا۔

اقتباس کا بیان

اقتباس: کسی شعر یا عبارت میں آیت مبارکہ یا حدیث پاک کا حوالہ دیئے بغیر کوئی آیت یا حدیث یا ان کا کچھ حصہ تضمین کر لینے کو اقتباس کہتے ہیں۔

اقتباس کا حکم: مالکیہ کا مشہور قول یہ ہے کہ قرآن سے اقتباس کرنا حرام ہے اور انہوں نے اقتباس کرنے والے شخص کو بہت سخت سست کہا ہے۔

متاخرین کی ایک جماعت نے شیخ عزالدین عبدالسلام سے اقتباس کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ جائز ہے اور اس کے جواز پر شیخ ان احادیث نبویہ سے استدلال کرتے ہیں' جن میں حضور ﷺ نے اقتباس کیا' نماز میں مثلاً ''وجهت وجهى''، ''میں متوجہ ہوتا ہوں'' (آیت) اور اسی طرح دعا کے اندر قرآن سے اقتباس کرتے ہوئے ''اَللّٰهُمَّ فَالِقَ الْاَصْبَاحِ وَجَاعِلَ اللَّيْلِ سَكَنًا وَّالشَّمْسِ وَالْقَمَرِ حُسْبَانًا اِقْضِ عَنِّى الدَّيْنَ وَاَغْنِنِىْ مِنَ الْفَقْرِ'' کا قول کیا ہے۔

اقتباس کی قسمیں

ابن حجہ کی شرح بدیعیہ میں ہے کہ اقتباس کی تین قسمیں ہیں:

مقبول' مباح اور مردود۔

(۱) مقبول: وہ اقتباس ہے' جو مواعظ' خطبات اور فرامین اور عہد ناموں میں کیا گیا ہے۔

(۲) مباح: وہ اقتباس ہے جو غزلوں' قصوں اور خطوط میں ہو۔

(۳) اور اقتباس کی قسم ثالث یعنی مردود کی آگے پھر دو قسمیں ہیں:

اوّل: اس کلام کا اقتباس کرنا جس کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی طرف فرمائی ہے' کوئی بشر اس کو اپنی ذات کی طرف نسبت کر کے بیان کرے (نعوذ باللہ) جیسا کہ بنوامیہ کے ایک حکمران کے متعلق کہا گیا ہے کہ اس نے ایک عرضداشت پر جس میں اس کے کارندوں کی شکایت کی تھی' یہ جواب لکھا تھا:

اِنَّ اِلَيْنَآ اِيَابَهُمْ ۝ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ ۝ (الغاشیہ: ۲۵-۲۶)

بے شک ہماری ہی طرف ان کا پلٹنا ہے' پھر بے شک ہم ہی پر ان کا حساب ہے۔

دوم: اور دوسری قسم اقتباس مردود کی یہ ہے کہ کسی آیت کی ''ھزل'' کے مضمون میں تضمین کی جائے (نعوذ باللہ من ذلک) جیسا کہ کسی واہیات شاعر کا قول ہے:

ارخى الى عشاقه طرفه ۔۔۔ هيهات هيهات لما توعدون

وردفه ينطق من خلفه ۔۔۔ لمثل ذا فليعمل العاملون

شیخ تاج الدین سبکی نے اپنی طبقات میں امام ابو منصور عبدالقاہر بن الطاہر التمیمی البغدادی' جو شافعیہ کے بہت جلیل القدر بزرگ ہوئے ہیں' کے حالات میں ان کے شعر نقل کیے ہیں:

يامن عدى ثم اعتدى ثم اقترف ۔۔۔ ثم انتهى ثم ارعوى ثم اعترف

ابشر بقول الله فى آياته ۔۔۔ ان ينتهوا يغفر لهم ما قد سلف

(۱) ترجمہ: اے وہ شخص جس نے حد سے تجاوز کیا اور پھر اس میں بہت بڑھ گیا اور پھر گناہ کا ارتکاب کر لیا' اس کے بعد وہ رک گیا اور نادم ہو کر اپنے گناہوں کا اعتراف کیا۔

(۲) تو اللہ تعالیٰ کے اس قول سے بشارت حاصل کر' جو اس نے اپنی آیتوں میں فرمایا ہے: اگر وہ لوگ باز آ جائیں گے تو اللہ تعالیٰ گذشتہ گناہوں میں ان کی مغفرت فرما دے گا۔

حافظ سیوطی علیہ الرحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

یہ دونوں اشعار اقتباس کے قبیل سے نہیں ہیں' کیونکہ اس میں شاعر نے ''بقول اللہ'' کہہ کر کلام الٰہی ہونے کی تصریح کر دی ہے اور یہ بات ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ اس طرح کی صراحت کر دینے کے بعد وہ کلام اقتباس کے زمرہ سے خارج ہو جاتا ہے' ورع اور تقویٰ کا

تقاضا یہی ہے کہ ایسی تمام باتوں سے اجتناب کیا جائے اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے کلام کو ان باتوں سے پاک اور منزہ رکھا جائے' اگرچہ اس کا استعمال بڑے بڑے جلیل القدر اماموں سے ثابت ہے' جیسا کہ امام ابو القاسم رافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اشعار میں کلام شارع سے اقتباس کرنے کو روا رکھا ہے:

(۱) الملك لله الذی عنت الوجوه ۔۔۔ له وذلت عنده الارباب

''بادشاہی صرف اس اللہ تعالیٰ کی ہے' جس کے سامنے چہروں کے رنگ اڑ جاتے ہیں اور جس کے حضور بڑے بڑے ارباب اقتدار سرافگندہ ہیں''

(۲) متفرد بالملك والسلطان قد ۔۔۔ خسر الذین تجاذ بوه وخابوا

''وہ اکیلا ہی ملک اور سلطنت کا بلاشرکت غیرے مالک ہے اور جو اس سے اقتدار میں کشاکشی کا تصور بھی کرتے ہیں' منہ کی کھاتے اور خائب وخاسر ہو کر لوٹتے ہیں''

(۳) دعهم وزعم الملك یوم غرورهم ۔۔۔ فسیعلمون غداً من الکذاب

''آج وہ دھوکے میں ہیں' تو ان کو بادشاہی کے گھمنڈ سمیت چھوڑ دے' کل قیامت کے دن خود بخود ہی کھل جائے گا کہ کون جھوٹا تھا''۔

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ شعب الایمان میں اپنے استاد ابو عبد الرحمٰن سلمی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں' ان کا بیان ہے کہ ہمیں احمد بن یزید نے اپنے اشعار سنائے:

(۱) سل الله من فضله واتقه ۔۔۔ فان التقی خیر ما تکتسب

''اللہ سے ڈر اور اس کا فضل مانگ کیونکہ اللہ (کے غضب وقہر) کا اندیشہ اچھا پیشہ ہے''

(۲) ومن یتق الله یصنع له ۔۔۔ ویرزقه من حیث لا یحتسب

''جو شخص اللہ تعالیٰ (کی ناراضی) سے ڈرتا ہے' تو اللہ تعالیٰ اس کے کام بناتا ہے اور اس کو ایسی جگہ سے رزق پہنچاتا ہے' جہاں سے اس کو سان گمان بھی نہیں ہوتا''۔

قرآن حکیم کے غریب (غیر مانوس) الفاظ کی شناخت

غرائب قرآن کا علم حاصل کرنا نہایت ضروری ہے اور اس پر انتہائی توجہ کی ضرورت ہے اور اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ امام بیہقی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے

مرفوعاً روایت کیا ہے:

اَعْرِبُوا الْقُرْاٰنَ وَالْتَمِسُوْا غَرَائِبَهٗ.

قرآن کے معانی کی تفتیش کرو اور غرائب القرآن تلاش کرو۔

اسی طرح ایک حدیث عمرو بن مسعود سے بھی موقوفاً مروی ہے اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے مرفوعاً روایت کی ہے کہ:

مَنْ قَرَأَ الْقُرْاٰنَ فَاَعْرَبَهٗ كَانَ لَهٗ بِكُلِّ حَرْفٍ عِشْرُوْنَ حَسَنَةً وَمَنْ قَرَأَهٗ بِغَيْرِ اِعْرَابٍ كَانَ لَهٗ بِكُلِّ حَرْفٍ عَشْرُ حَسَنَاتٍ.

جس شخص نے قرآن پاک پڑھا اور اس کے غریب الفاظ کے معانی کی تحقیق کی تو اسے ہر حرف کے بدلے بیس نیکیاں ملیں گی اور جو شخص قرآن پاک کو معانی کی تحقیق اور شناخت کے بغیر پڑھے گا' اس پر ایک حرف کے بدلے میں دس نیکیاں عطا کی جائیں گی۔

اعراب القرآن سے کیا مراد ہے؟

اعراب القرآن کے معنی یہ ہیں کہ اس کے الفاظ کے معانی کی معرفت حاصل کرنا۔ نحویوں کی اصطلاح میں اعراب کے جو معنی ہوتے ہیں وہ یہاں مراد نہیں ہیں' کیونکہ نحاۃ کے نزدیک تو اس سے لحن کے مقابل یعنی صحت الفاظ مراد ہوتی ہے' وہ مراد لینا درست نہیں' اس لیے کہ صحت الفاظ کے فقدان کی صورت میں تو نہ قراءت صحیح ہوتی ہے اور نہ ثواب ملتا ہے۔

غرائب القرآن میں غور وخوض کرنے والے شخص پر مستقل مزاجی سے کام لینا اور اہل فن کی اس موضوع پر لکھی ہوئی کتابوں کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے اور اس سلسلہ میں قیاس آرائی اور رائے زنی کو بالکل دخل نہیں ہے۔ کیونکہ صحابہ کرام خاص عرب کے باشندے تھے' فصیح عربی جاننے والے اور اہل لسان تھے' پھر قرآن کا نزول بھی انہی کی زبان میں ہوا تھا' اگر اتفاق سے ان پر بھی کسی لفظ کے معنی ظاہر نہ ہوتے تو وہ قیاس آرائی اور ظن وتخمین سے کام ہرگز نہیں لیتے تھے' بلکہ توقف فرماتے اور سکوت اختیار کر لیتے تھے۔

ابوعبید نے ''کتاب الفضائل'' میں ابراہیم تیمی سے روایت کی ہے' حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا قول ''وَفَاكِهَةً وَّاَبًّا'' (العبس: ۳۱) ''اور میوے اور مویشیوں کا چارہ'' کا معنی پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: ''ای سماء تظلنی وای ارض تقلنی ان انا قلت فی کتاب اللّٰہ ما لا اعلم'' کون سا آسمان مجھ پر سایہ فگن رہے گا اور کون سی زمین مجھے برداشت کرے گی' اگر میں نے کتاب اللہ میں ایسی بات کہہ دی کہ جس کا میں علم نہیں رکھتا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے برسرِ منبر اللہ تعالیٰ کا یہ قول ''وَفَاكِهَةً وَّاَبًّا'' (العبس: ۳۱) پڑھا اور فرمایا: یہ ''فاکھة'' کا معنی تو ہمیں معلوم ہے' مگر ''ابا'' کیا چیز ہے؟ پھر خود ہی فرمانے لگے: ''ان ھذا لھو الکلف یا عمر!'' اے عمر! یہ بڑا مشکل معاملہ ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے:

کنت لا ادری ما فاطر السموات حتی اتانی اعرابیان یختصمان فی بئر فقال احدھما انا فطرتھا یقول انا ابتداتھا.

مجھے ''فاطر'' کے معنی معلوم نہ تھے' یہاں تک کہ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ میرے پاس دو دیہاتی آئے' ان کا آپس میں کنویں کا جھگڑا تھا۔ اُن میں سے ایک نے بیان کیا: ''انا فطرتھا'' میں نے پہلے اس کو کھودنا شروع کیا تھا (تب فاطر کے معنی کا انکشاف ہوا)۔

ابن جریر نے سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ ان سے اللہ تعالیٰ کے قول ''وَحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا'' (مریم: ۱۳) ''اور اپنی طرف سے مہربانی'' کا معنی پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کا معنی دریافت کیا تھا تو انہوں نے اس کا مجھے کوئی جواب نہیں دیا۔

حضرت عکرمہ کی روایت ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے تھے کہ میں تمام قرآن کا عالم ہوں' مگر چار الفاظ کے معانی کا مجھے علم نہیں ہے اور وہ چار الفاظ یہ ہیں: ''غسلین' حنانا' اواہ'' اور ''الرقیم''۔

ابن ابی حاتم نے حضرت قتادہ سے روایت کیا' وہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے تھے: مجھے اللہ کے قول ''رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا'' (الاعراف: ۸۹) ''اے ہمارے رب! ہم میں فیصلہ کر'' کا معنی معلوم نہیں تھا' یہاں تک کہ میں نے ذی یزن کی بیٹی کا یہ مقولہ سنا: ''تعال افاتحك تراخاصمك'' یعنی آیئے ہم یہ جھگڑا نمٹا ہی لیں۔

امام بیہقی نے مجاہد کے طریق پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ حدیث نقل کی ہے' انہوں نے فرمایا کہ میں نہیں جانتا ''غسلین'' کیا چیز ہے؟ لیکن میرا گمان یہ ہے کہ یہ زقوم (یعنی تھوہڑ) کو کہتے ہیں۔

فصل: مفسر کے لیے کس کس فن سے واقف ہونا ضروری ہے۔

کتاب البرہان' میں بیان کیا گیا ہے کہ غرائب القرآن کی تحقیق کرنے والا علم لغت کا محتاج ہوتا ہے اور اس کے لیے اسماء افعال اور حروف کی معرفت ضروری ہے اور حروف چونکہ نسبتاً قلیل ہیں' اس لیے علماء نحو نے اس کے معانی بیان کر دیئے ہیں' لہٰذا حروف کا علم ان کتابوں سے معلوم کیا جا سکتا ہے' لیکن اسماء اور افعال کا علم لغت کی کتابوں سے حاصل کرنا ضروری ہے۔ علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

غرائب القرآن کی دریافت کے لیے سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ ان امور کی طرف رجوع کیا جائے' جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ان کے تلامذہ سے ثابت ہیں' کیونکہ ان سے جو روایات منقول ہیں' ایک تو وہ صحیح الاسناد ہیں اور اس کے ساتھ وہ غرائب القرآن کی تفسیر کا احاطہ بھی کرتی ہیں اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول روایتوں میں سب سے زیادہ صحیح وہ روایات ہیں' جو ابی طلحہ کے طریق پر مروی ہیں۔

علامہ سیوطی علیہ الرحمہ نے ان الفاظِ غریبہ کی تشریح نہایت عمدہ طریقے سے جامع انداز میں سورتوں کی ترتیب کے لحاظ سے لکھی ہے' ان میں سے چند الفاظ مع تشریح یہاں درج کیے جاتے ہیں:

یومنون: یصدقون

یعمھون: یتمادون

مطھرۃ: من القذر والاذی

الغاشعین: المصدقین بما نزل اللہ

وفی ذلکم بلاءٌ: نعمتہ

وفومها: الحنطۃ

الا امانی: احادیث

فائدہ قرآن مجید میں الفاظ غریبہ کو شامل ماننے پر ایک سخت دشواری یہ پیش آتی ہے کہ قرآن حکیم فصیح ترین کلام پر مشتمل ہے' جس کے لیے غرابت سے خالی ہونا ضروری ہے' کیونکہ فصاحت کلام کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ وہ غرابت سے پاک اور سلامت ہو۔

اس کا جواب دیا گیا ہے کہ غرابت کے دو معنی ہیں:

اوّل: یہ ہے کہ غیر مانوس اور وحشی لفظ کو کلام میں استعمال کرنا اور یہ فصاحت میں بے شک خلل انداز ہوتا ہے۔

دوم: غرابت کا دوسرا معنی یہ ہے کہ کلام میں ایسے الفاظ کو استعمال کرنا' جن کے معانی کے انکشاف اور تفتیش میں قیاس اور رائے کو کچھ دخل نہ ہو' غرابت کی اس نوع کا وقوع قرآن حکیم میں ہوا ہے' اس میں اہل فن کے بیان کی حاجت ہوتی ہے' لیکن یہ فصاحت میں مخل نہیں۔

فصل: ابوبکر ابن الانباری کہتے ہیں:

صحابہ کرام اور تابعین رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین نے قرآن کے غریب اور مشکل الفاظ پر (شعراء جاہلیت کے) اشعار سے بہ کثرت استدلال کیا ہے۔

حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں:

''الشعر دیوان العرب'' اشعار اہل عرب (کے علوم وفنون' تواریخ اور زبان) کا انسائیکلو پیڈیا ہے۔

اور جب کبھی بھی قرآن پاک کا کوئی لفظ ہم پر مخفی ہوتا تو اس کے معنی کی تلاش کے لیے ہم اہل عرب کے دیوان کی طرف رجوع کرتے' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو اہل عرب کی زبان میں نازل فرمایا ہے۔

پھر ابن الانباری نے عکرمہ کے طریق پر ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: اگر تم مجھ سے قرآن پاک کے غریب الفاظ کے بارے میں دریافت کرنا چاہتے ہو تو

اسے اشعار میں ڈھونڈو کیونکہ شعر عرب کا دیوان ہے۔

ابوعبید نے اپنی کتاب ''الفضائل'' میں اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن عباس کی روایت بیان کی ہے' ان سے اگر قرآن پاک کے معانی کے متعلق سوال کیا جاتا تو وہ ان کے معانی کی دلیل میں شعر پڑھ کر سنا دیتے تھے۔

ابوعبید کہتے ہیں: اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت ابن عباس اس لفظ کی تفسیر پر بہ طور استشہاد شعر پیش کرتے تھے۔ علامہ سیوطی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں:

ہم نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس طرح کی بہ کثرت روایات بیان کی ہیں' ان روایتوں میں سب سے بڑھ کر جامع اور مکمل نافع بن الازرق کی سوالات والی روایت ہے' جس کا کچھ حصہ ابن الانباری ''کتاب الوقف'' میں اور کچھ حصہ طبرانی نے اپنی کتاب ''المعجم الکبیر'' میں درج کیا ہے' انہی میں سے حضرت نافع کا یہ قول ہے' جس میں انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے قول ''عَنِ الْیَمِیْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِیْنَ'' (المعارج: ۳۷) ''دائیں اور بائیں گروہ کے گروہ'' میں ''عزین'' کے بارے میں مجھے بتلائیے کہ اس کا کیا مفہوم ہے؟

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے جواب دیا کہ ''العزون حلق الرفاق'' کے معنی میں ہے' یعنی ساتھیوں اور ہم سفروں کا حلقہ بنا لینا اور کسی کے ارد گرد جمع ہو جانا۔

نافع کہنے لگے: کیا اہل عرب کے ہاں یہ معنی معروف ہے؟

ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ہاں! کیا تم نے عبید بن الابرص کا شعر نہیں سنا ہے؟ وہ کہتا ہے۔

فجاؤوا یهرعون الیه حتی   یکونوا حول منبره عزینا

''وہ اس کی طرف دوڑتے ہوئے آئے تا کہ اس کے منبر کے ارد گرد حلقہ بنا لیں''

نافع نے کہا: مجھے بتلائیے کہ اللہ تعالیٰ کے قول ''وَابْتَغُوْٓا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ'' (المائدہ: ۳۵) کے کیا معنی ہیں؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس میں وسیلہ کا معنی حاجت ہے۔

حضرت نافع نے کہا: کیا اہل عرب کے نزدیک یہ لفظ اس معنی میں معروف ہے؟

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ہاں! کیا تم نے عنترہ کا یہ شعر نہیں سن رکھا' وہ کہتا

ہے۔

اِنَّ الرِّجَالَ لَهُمْ اِلَيْكَ وَسِيْلَةٌ اَنْ يَّاْخُذُوْكِ تَكَحُّلِيْ وَتَخَفُّفِيْ

"بے شک مردوں کو تیرے حاصل کرنے کی حاجت ہے (جس سے وہ تیری طرف راغب ہیں) تو سرمہ اور مہندی لگا"۔

قرآن حکیم میں غیر عربی زبان کے الفاظ کا بیان

قرآن مجید میں معرب الفاظ کے وقوع میں ائمہ لغت کا اختلاف ہے' جمہور ائمہ جن میں امام شافعی' ابن جریر' ابوعبیدہ' قاضی ابوبکر اور ابن فارس بھی ہیں' ان کی رائے یہ ہے کہ قرآن پاک میں عربی زبان کے علاوہ کسی زبان کا کوئی لفظ واقع نہیں ہوا' کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ ءَاَعْجَمِيٌّ وَّعَرَبِيٌّ. (حٰم السجدہ: ۴۴)

اور اگر ہم اس کو عجمی زبان کا قرآن بناتے تو وہ ضرور کہتے: اس کی آیتیں کیوں مفصل کی گئیں' کیا کتاب عجمی زبان میں اور نبی کی زبان عربی۔

امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس شخص پر شدید انکار کیا' جو قرآن حکیم میں غیر عربی زبان کے الفاظ کے وقوع کا قائل ہے۔

ابوعبیدہ نے کہا: قرآن مجید صرف اور صرف فصیح عربی زبان میں نازل کیا گیا ہے' اس لیے جو شخص یہ کہتا ہے کہ اس میں غیر عربی زبان کے الفاظ بھی ہیں' وہ بلاشبہ (بُری) بات کہتا ہے اور جو شخص یہ کہتا ہے کہ "کذابا" نبطی زبان کا لفظ ہے' اس نے بھی بڑا بول بولا ہے۔ اس کے مدمقابل قائلین جواز کا کہنا یہ ہے کہ کچھ الفاظ جو اصل میں عربی تھے' لیکن جب اہل عرب نے اپنے اشعار اور محاورات میں ان کو استعمال کیا تو اس طرح وہ معرب الفاظ فصیح عربی کلمات کے قائم مقام ہو گئے اور ان میں بھی بیان کی صفت جو عربی زبان کا خاصہ تھی' پیدا ہو گئی۔ پس اسی تعریف کے لحاظ سے قرآن کا نزول ان کلمات کے ساتھ ہوا۔

دوسرے بعض علماء لغت کا بیان ہے کہ یہ تمام الفاظ خالص عربی زبان کے الفاظ ہیں۔

مگر بات یہ ہے کہ عربی زبان ایک بہت وسیع زبان ہے اور اس کے متعلق جلیل القدر علماء اور ماہرین لسانیات کو بھی اس کے بعض الفاظ کا علم نہ ہو' بعید از قیاس نہیں۔ چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما پر لفظ "فاطر" اور "فاتح" کے معنی مخفی رہے تھے' بعد ازاں منکشف ہوئے۔

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ "الرسالۃ" میں لکھتے ہیں:

لا يحيط باللغة الانبی. زبان کا احاطہ صرف نبی ہی کر سکتا ہے۔

ابوعبید القاسم ابن اسلام غیر عربی زبان کے الفاظ کے قرآن پاک میں وقوع یا عدم وقوع کے اختلاف کا ذکر کرنے کے بعد اپنا تجزیہ اور عندیہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

میرے نزدیک وہ مذہب حق وصواب ہے' جس میں دونوں قولوں کی تصدیق کی جاتی ہے اور وہ مذہب یہ ہے۔

اس میں شک نہیں کہ علماء لغت کے بیان کے مطابق ان الفاظ کی اصل' عجمی زبانیں ہیں' جیسا کہ ماہرین زبان نے کہا ہے' لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جب ان کلمات کے استعمال کی ضرورت اہل عرب کو پڑی تو انہوں نے ان کلمات کو مُعَرَّب بنا کر اپنی زبان سے ادا کرنے کے قابل بنالیا۔ پھر عجمی الفاظ کی صورت سے ان کی صورت بھی بدل دی اور یہ الفاظ ایک طرح سے عربی ہی بن گئے۔

چنانچہ جب قرآن حکیم نازل ہوا تو اس وقت یہ الفاظ عربی کلام میں ایسے مخلوط ہو گئے تھے کہ ان کے درمیان خط امتیاز کھینچنا دشوار تھا۔ لہٰذا اس لحاظ سے جو شخص یہ کہتا ہے کہ یہ عربی الفاظ ہیں' وہ بھی اور جو ان کی عجمیت کا قائل ہے وہ بھی' دونوں ہی اپنی اپنی جگہ درست کہتے ہیں' کسی کو بھی جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

الجوالیقی' ابن الجوزی اور دوسرے بہت سے علماء لغت کا اسی قول کی طرف میلان ہے۔

ایسے الفاظ کی چند مثالیں بہ طور مشتے نمونہ از خروارے ذیل میں پیش کی جاتی ہیں:

لفظ	معنی	تفصیل
اباریق	لوٹے' چھاگل	ثعالبی نے "فقہ اللغۃ" میں بیان کیا ہے کہ فارسی لفظ ہے' جوالیقی نے کہا: "ابریق" کا لفظ فارسی سے معرب بنایا گیا ہے' اس کا معنی

		پانی کا راستہ یا آہستہ آہستہ پانی انڈیلنا ہے۔
اب	گھاس چارہ	بعض نے کہا کہ اہل مغرب کی زبان میں اس کا معنی ''گھاس'' ہے۔
ابلعی	تو نگل جا	ابن ابی حاتم نے وہب ابن منبہ کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قول ''ابلعی مائك'' میں ''ابلعی'' حبش کی زبان کا لفظ ہے اور اس کا معنی نگلنا ہے۔
اخلد	جھک گیا، مائل ہو گیا	واسطی نے ''الارشاد'' میں لکھا ہے کہ عبرانی زبان میں ''اخلد الی الارض'' کا محاورہ ٹیک لگانا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔
الارائك	صوفے، تخت	ابن الجوزی ''فنون الافنان'' میں لکھتا ہے کہ حبشی زبان میں یہ لفظ تخت کے لیے بولتے ہیں۔
استبرق	موٹا ریشم	ابن ابی حاتم نے ضحاک سے روایت کی ہے کہ یہ عجمی زبان میں موٹے ریشم پر بولا جاتا ہے۔
اسفار	کتابیں	واسطی نے ''کتاب الارشاد'' میں کہا ہے کہ سریانی زبان میں اس کا اطلاق ''کتابوں'' پر ہوتا ہے۔
اصری	میرا ذمہ، عہد	ابو القاسم نے ''لغات القرآن'' میں بیان کیا ہے کہ نبطی زبان میں یہ لفظ ''عہد'' کے معنی کے لیے آتا ہے۔
اکواب	کوزے	ابن الجوزی نے بیان کیا ہے کہ یہ ''نبطی'' زبان میں ''کوزوں'' کو کہتے ہیں۔
اناہ	اس کی پختگی	اہل مغرب کی زبان میں اس کا معنی ہے: کسی چیز کا پکنا۔

اواہ	بہت رجوع کرنے والا	ابو الشیخ ابن حبان نے عکرمہ کے طریق پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ ''اواہ'' حبشہ کی زبان میں صاحب ایقان شخص کو کہتے ہیں۔

چند اہم قواعد کا بیان، جن کا جاننا مفسر کے لیے ضروری ہے

ضمیروں کے متعلق قاعدہ

ضمیر کا مرجع

ضمیر کے لیے ایک مرجع کا ہونا ضروری ہوتا ہے، جس کی طرف وہ لوٹتی ہے۔

○ یا ضمیر کا مرجع سابق لفظوں میں مذکور ہوتا ہے اور ضمیر کی دلالت مرجع پر مطابقی طور پر ہوتی ہے، جیسا کہ ان مثالوں میں ہے:

''وَنَادٰی نُوْحُ ابْنَهٗ''. (ھود:۴۲) ''اور نوح نے اپنے بیٹے کو پکارا''۔ ''وَعَصٰی اٰدَمُ رَبَّهٗ'' (طٰہٰ:۱۲۱) ''اور آدم سے اپنے رب کے حکم میں لغزش واقع ہوئی''۔ ''اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا'' (النور:۴۰) ''جب اپنا ہاتھ نکالے تو اسے دیکھ نہ سکے''۔ یا ضمیر کی دلالت مرجع پر ضمنی طور پر ہوتی ہے، جیسے ''اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ'' (المائدہ:۸) ''انصاف کرو وہ زیادہ قریب ہے'' کی مثال میں ہے۔ ''ھو'' ضمیر کا مرجع وہ ''عدل'' ہے، جس پر صیغہ ''اعدلوا'' تضمنی طور پر دلالت کر رہا ہے۔

○ یا ضمیر کی دلالت مرجع پر التزامی طور پر ہوگی، جیسے ''انا انزلناہ'' میں ''ہ'' ضمیر کا مرجع ''قرآن'' ہے، جس پر نازل کرنا التزامی طور پر دلالت کرتا ہے، اسی طرح ''فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ'' (البقرہ:۱۷۸) ''تو جس کے لیے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معافی ہوئی تو بھلائی سے تقاضا ہو اور اچھی طرح ادا'' اللہ تعالیٰ کے اس قول میں ''عفی'' کا لفظ ایک عافی یعنی معاف کرنے والے پر لازماً دلالت کر رہا ہے اور وہی ''الیہ'' کی ''ہ'' ضمیر کا مرجع قرار پاتا ہے۔

☆ یا ضمیر کا مرجع اس سے لفظی اعتبار سے متاخر ہوگا (مگر رتبہ کے لحاظ سے اس کو تقدم حاصل ہوگا) اور ضمیر مرجع کے مطابق ہوگی جیسے "فَاَوْجَسَ فِیْ نَفْسِهٖ خِیْفَةً مُّوْسٰی" (طٰہٰ:٦٧) "تو اپنے جی میں موسیٰ نے خوف پایا"۔ "وَلَا یُسْئَلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ O" (القصص:٧٨) "اور مجرموں سے ان کے گناہوں کی چھوٹ نہیں" اور "فَیَوْمَئِذٍ لَّا یُسْئَلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖٓ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ" (الرحمٰن:٣٩) "گناہ گار کے گناہ کی پوچھ نہ ہوگی آدمی اور جن سے" کی مثالوں میں ہے۔

☆ اور کبھی ضمیر مذکور لفظ پر بغیر اس کے معنی کے راجع ہوتی ہے جیسے "وَمَا یُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا یُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ" (الفاطر:١١) یعنی دوسرے معمر کی عمر سے کچھ کم نہیں کیا جاتا۔

☆ اور کبھی ضمیر ایک شے کی طرف راجع ہوتی ہے مگر اس سے اس شے کی جنس مراد ہوتی ہے۔ علامہ زمخشری نے کہا کہ اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: "اِنْ یَّكُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰی بِهِمَا" (النساء:١٣٥) "مال دار ہو یا فقیر ہو بہر حال اللہ کو اس کا سب سے زیادہ اختیار ہے" یعنی فقیر اور غنی کی جنس سے کیونکہ "غنیا" اور "فقیرا" کے الفاظ دونوں کی جنس پر دلالت کرتے ہیں ورنہ اگر ضمیر متکلم کی طرف راجع ہوتی تو واحد لائی جاتی۔

☆ اور کبھی ضمیر تثنیہ کی ہوتی ہے مگر وہ راجع دو مذکور چیزوں میں سے ایک کی طرف ہوتی ہے جیسے اس کی مثال یہ ہے: "یَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ" (الرحمٰن:٢٢) "ان سے موتی اور مونگا نکلتا ہے"۔ "وانما یخرج من احدهما" "حالانکہ وہ صرف میٹھے پانی والے سمندر سے نکلتے ہیں کھاری سے"۔

☆ کبھی ضمیر متصل کسی اور چیز کے ساتھ ہوتی ہے اور اس کا مرجع اس شے کے علاوہ کوئی دوسری شے ہوتی ہے جیسے "وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِیْنٍ O" (المؤمنون:١٢) "اور بے شک ہم نے آدمی کو چنی ہوئی مٹی سے بنایا" یعنی آدم علیہ السلام کو پھر اس کے بعد فرمایا: "ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً" (المؤمنون:١٣) "پھر اسے پانی کی بوند بنایا" چنانچہ یہ ضمیر اولاد آدم کے لیے ہے کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق نطفے سے نہیں ہوئی تھی۔

علامہ سیوطی فرماتے ہیں:

اور یہی استخدام کا باب ہے۔

"صنعت استخدام" کی تعریف اور ایک آیت کا صحیح ترجمہ

صنعت استخدام یہ ہے کہ ایک لفظ کے دو معنی ہوں ایک معنی اس لفظ سے مراد لیے جائیں اور دوسرے معنی اس ضمیر سے مراد لیے جائیں جو اس کی طرف راجع ہے جس کی مثال جریر کا یہ مشہور شعر ہے:

اذا نزل السماء بارض قوم — رعیناه وان کانوا غضابا

"جب کسی قوم کی زمین میں بارش ہو تو ہم اس سے پیدا ہونے والے سبزہ کو چرا لیتے ہیں اگرچہ وہ لوگ غضب ناک ہی کیوں نہ ہوں"

لفظ "سماء" کے دو مجازی معنی ہیں ایک بارش دوسرا بارش سے پیدا ہونے والا سبزہ شاعر نے لفظ "سماء" سے بارش مراد لی ہے اور "رعیناہ" میں اس کی طرف راجع ہونے والی ضمیر منصوب سے بارش سے پیدا ہونے والا سبزہ مراد لیا یہ "صنعت استخدام" ہے۔

حضرت غزالیٔ زمان سید احمد سعید کاظمی قدس سرہ اپنے ترجمہ قرآن کے مقدمہ میں لکھتے ہیں: بعض مترجمین قرآن نے آیہ کریمہ "وَمَرْیَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِیْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِیْهِ مِنْ رُّوْحِنَا" (التحریم:١٢) کا انتہائی شرم ناک الفاظ میں حسب ذیل ترجمہ کیا ہے:

"اور مریم بیٹی عمران کی جس نے روکے رکھا اپنی شہوت کی جگہ کو پھر ہم نے پھونک دی اس میں اپنی طرف سے جان"۔ (ترجمہ مولانا محمود الحسن دیوبندی)

امام اہل سنت قدس سرہ فرماتے ہیں:

یہ غلط ہے کہ حضرت مریم کی شہوت کی جگہ میں جان پھونکی گئی۔ کیونکہ یہ بات نہایت شرم ناک اور حضرت مریم کی عزت وعظمت کے قطعاً خلاف ہے حضرت جبرائیل نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت مریم کے چاک گریبان میں جان پھونکی۔ (تفسیر ابن کثیر ج ٤ ص ٣٩٤)

ہم نے ترجمہ میں شرم وحیا اور حضرت مریم کی عزت وعظمت کو ملحوظ رکھتے ہوئے جمہور مفسرین کے مطابق "صنعت استخدام" سے کام لیا اور اس کے مطابق ہم نے لفظ "فرج" سے اس کے مجازی معنی عفت مراد لیے اور "فیہ" میں اس کی طرف راجع ہونے والی ضمیر مجرور سے لفظ "فرج" کے دوسرے مجازی معنی "چاک گریبان" مراد لیے اور اجلہ مفسرین کے مطابق

حسب ذیل ترجمہ کیا: ''اور عمران کی بیٹی مریم (کی مثال بھی) جس نے اپنی عفت کی (ہر طرح) حفاظت کی تو ہم نے (بہ واسطہ جبریل اس کے) چاک گریبان میں اپنی (طرف کی) روح پھوک دی''۔ (مترجم عفی عنہ)

اور اسی سے ہے اللہ تعالیٰ کا یہ قول: ''لَا تَسْاَلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَلَكُمْ تَسُؤْكُمْ'' (المائدۃ:۱۰۱) ''ایسی باتیں نہ پوچھو جو تم پر ظاہر کی جائیں تو تمہیں بری لگیں''، پھر فرمایا: ''قد سالها'' یعنی دوسری چیزیں جو کہ سابق میں لفظ اشیاء سے مفہوم ہوتی ہیں۔

○ اور کبھی ضمیر اس شے کے ملابس اور ہم شکل کی راجع ہوتی ہے' جس کے واسطے وہ ضمیر آئی ہے۔ جیسے یہ مثال ہے: ''اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحَاهَا'' (النازعات:۴۶) یعنی اس شام کے دن کی چاشت' نہ کہ خود شام کی چاشت کہ وہ تو ہوتی ہی نہیں ہے۔

قاعدہ

جمع ذوی العقول کی طرف ضمیر بھی غالب طور پر جو راجع ہوتی ہے' وہ بصیغہ جمع ہی لائی جاتی ہے۔ عام ازیں کہ وہ جمع' جمع قلت ہو یا جمع کثرت' جیسے ''وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ'' (البقرہ:۲۳۳) ''اور مائیں دودھ پلائیں'' اور ''وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ'' (البقرہ:۲۲۸) ''اور طلاق یافتہ ٹھہری رہیں'' میں مگر ''ازواج مطهره'' میں یہ ضمیر واحد لائی گئی ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ''مطهرات'' نہیں فرمایا۔

☆ مگر غیر ذوی العقول کی جمع کی صورت میں اکثر و غالب طور پر یہ ہوتا ہے کہ جمع کثرت ہو تو اس کے لیے واحد کی ضمیر لاتے ہیں اور جمع قلت ہو تو اس کے لیے ضمیر جمع لانا معمول ہے۔

از قول باری تعالیٰ: ''اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا'' تا ''مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ'' (التوبہ:۳۶) ''بے شک مہینوں کی گنتی اللہ کے نزدیک بارہ مہینے ہیں اللہ کی کتاب میں' جب سے اس نے آسمان اور زمین بنائے ان میں چار حرمت والے ہیں'' میں دونوں طرح کی ضمیروں کا اجتماع ہو گیا ہے کہ ''شهور'' جو جمع کثرت ہے' اس کی طرف ''منها'' والی واحد کی ضمیر راجع ہے اور پھر فرمایا: ''فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ'' (التوبہ:۳۶) ''پھر ظلم نہ کرو ان میں'' اور اس میں جمع کی ضمیر لائی گئی ہے' جو اربعہ حرم کی طرف راجع ہے اور وہ جمع قلت ہے۔

قاعدہ

جب ضمائر میں لفظ اور معنی دونوں کی رعایتیں مجتمع ہو جائیں تو ایسی صورت میں ابتداءً لفظی رعایت سے کی جانی چاہیے اور پھر معنی کی رعایت ہو کیونکہ قرآن مجید میں یہی طریقہ ہے' اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ'' (البقرہ:۸) ''اور کچھ لوگ کہتے ہیں'' اس کے بعد فرمایا: ''وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ'' (البقرہ:۸) ''اور وہ ایمان والے نہیں'' دیکھیے! اس میں پہلے لفظ ''من'' کے لفظی رعایت کے پیش نظر مفرد کی ضمیر لائی گئی ہے' پھر معنی کی رعایت کرتے ہوئے ضمیر بصیغہ جمع ذکر فرمائی' اسی طرح ''وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ'' (الانعام:۲۵) ''اور ان میں سے کوئی وہ ہے جو تمہاری طرف کان لگاتا ہے'' اور ''وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا'' (التوبہ:۴۹) ''اور ان میں سے کوئی تم سے یوں عرض کرتا ہے کہ مجھے رخصت دیجیے فتنہ میں نہ ڈالیے' سن لو! وہ فتنہ ہی میں پڑے'' میں بھی ہے۔

شیخ علم الدین عراقی کا قول ہے کہ قرآن مجید میں معنی پر محمول کر کے صرف ایک ہی جگہ ابتداء کی گئی ہے' اس کی کوئی دوسری مثال قرآن میں نہیں ملتی اور وہ جگہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''وَقَالُوْا مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰى اَزْوَاجِنَا'' (الانعام:۱۳۹) ''اور بولے جو ان مویشی کے پیٹ میں ہے اور نرا ہمارے مردوں کا ہے اور ہماری عورتوں پر حرام ہے'' اس میں ''ما'' کے معنی پر محمول کر کے ''خالصه'' کو بصیغہ مونث لایا گیا ہے اور پھر لفظی رعایت کے پیش نظر ''محرم'' بصیغہ مذکر بیان ہوا ہے۔

معرفہ اور نکرہ کے قواعد

واضح رہے کہ معرفہ اور نکرہ میں سے ہر ایک کے لیے بعض ایسے مخصوص احکام ہیں' جو ان میں سے دوسرے کے لائق اور مناسب نہیں ہوتے ہیں' تنکیر یعنی نکرہ لانے کے کئی اسباب ہیں۔

(۱) وحدت کا ارادہ ہو' جیسے مثلاً:

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَآءُ — اللہ نے ایک غلام کی مثال بیان فرمائی'

مُتَشٰکِسُوْنَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ. (الزمر:۲۹)	جس میں کئی آدمی شریک ہیں، جو آپس میں سخت اختلاف رکھتے ہیں اور ایک غلام ایسا ہے جو پورا ایک ہی آدمی کی ملک میں ہے۔

(۲) نوع مراد ہو، جیسے مثلاً ''هذا ذكر ''یعنی'' نوع من الذكر ''ذکر کی ایک نوع ہے۔

وَعَلٰۤى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ (البقرہ: ۷) ای نوع غریب من الغشاوة ولا يتعارفه الناس بحيث غطى مالا يغيطه شئى من الغشاوة.	اور ایک عجیب نوع کا پردہ، جو لوگوں میں معروف بھی نہیں اور وہ آنکھوں کو اس طرح ڈھانپ لیتا ہے کہ ہر قسم کے پردوں اور جالوں میں سے کوئی بھی اس طرح نہیں ڈھانپ سکتا۔

''وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ'' (البقرہ:۹۶) ''اور بے شک تم ضرور انہیں پاؤ گے کہ سب لوگوں سے زیادہ جینے کی ہوس رکھتے ہیں''یعنی ایک نوعیت کی زندگی پر وہ لوگ بہت زیادہ حریص ہیں اور وہ ہے مستقبل میں لمبی عمر کی خواہش کیونکہ حال اور ماضی میں تو زیادتی عمر میں حرص و آز ممکن نہیں ہے۔

اور کبھی وحدت اور نوعیت ایک ساتھ بھی ہو سکتے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ کے اس قول ''وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ'' (النور:۴۵) میں ہے، اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چوپاؤں کی انواع میں سے ہر ایک نوع کو پانی کی انواع میں سے ایک نوع کے ذریعے سے پیدا فرمایا ہے اور چوپاؤں کے افراد میں سے ہر ایک فرد کو افراد نطفہ میں سے ایک نطفہ سے پیدا کیا۔

(۳) تعظیم مراد ہو، بایں معنی کہ جس شے کی بابت کچھ کہا جا رہا ہے، وہ اتنی عظیم ہے کہ اس کی تعریف یا تحسین کرنا ممکن نہیں، جیسے ''فاذنوا بحرب يعنى بحرب اى حرب'' کا مطلب یہ ہے کہ ''اتنی بڑی جنگ کہ اس کا تم اندازہ نہیں لگا سکتے ہو''۔

(۴) تکثیر (کثرت بیان کرنا مقصود ہو) جیسے ''اَئِنَّ لَنَا لَاَجْرًا'' (الشعراء:۴۱) ''اى وافرا جزيلا ''یعنی بہت سا اجر و ثواب تعظیم اور تکثیر دونوں کا احتمال ایک ساتھ بھی ممکن ہے، جیسے اس مثال ''فقد كذبت رسل ''میں ہے، مطلب یہ ہے کہ بڑے بڑے رسول جن کی تعداد کثیر تھی، وہ بھی جھٹلائے گئے۔

(۵) تحقیر مراد ہو، بایں معنی کہ کسی چیز کی شان اس حد تک گر جائے اور اس کا مرتبہ اس حد تک گھٹیا ہو کہ وہ کم ترین ہونے کی وجہ سے معروف نہ ہو سکے، جیسے ''اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا'' (الجاثیہ:۳۲) ''اى ظنا حقيرا لا يعبابه ''یعنی معمولی سا نا قابل ذکر گمان۔

(۶) تقلیل (کمی ظاہر کرنا) مراد ہو، جیسے ''وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ'' (التوبہ:۷۲) یعنی اللہ تعالیٰ کی قلیل سی رضامندی اور خوشنودی بھی ساری جنتوں سے بڑھ کر ہے، کیونکہ اللہ کی رضامندی ہی ہر سعادت کی اصل ہے، وہ حاصل ہو گئی تو سب کچھ مل گیا۔

''اللهم انا نسئلك رضاك ونعوذبك من عذابك وسخطك''۔

اے اللہ! ہم تیری رضا کے منگتے ہیں اور تیرے عذاب اور ناراضگی سے پناہ مانگتے ہیں۔ (آمین مترجم)

قليل منك يكفينى ولكن　　قليلك لا يقال له قليل

''تیری ذرا سی نظر کرم ہی میرے بھاگ جگانے کے لیے کافی ہے، لیکن تیری تھوڑی سی عنایت کو بھی تھوڑا کہنا جائز نہیں ہے''

تعریف (معرفہ) کے بھی کئی وجوہ اور اسباب ہوتے ہیں:

(۱) ضمیر لانے کے ساتھ اس لیے کہ اس کا مقام متکلم یا خطاب (مخاطب) یا غیبت (غائب) کا مقام ہوتا ہے۔

(۲) علمیت کے ساتھ تا کہ اس کو ابتداءً ہی ایسے اسم کے ساتھ جو اس کے لیے مخصوص ہے بعینہ سامع کے ذہن میں حاضر کر سکیں، جیسے ''قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ'' (الاخلاص:۱) ''تم فرماؤ وہ اللہ ہے وہ ایک ہے'' اور ''مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' (الفتح:۲۹) ''محمد اللہ کے رسول ہیں'' کی مثالوں میں ہے۔

یا تعظیم یا اہانت کے لیے اور یہ اس موقع پر ہوتا ہے، جہاں اس کا علم ان باتوں کا تقاضا کرتا ہو، تعظیم کی مثال حضرت یعقوب علیہ السلام کا ''اسرائیل'' کے لقب کے ساتھ ملقب ہونا کہ اس میں مدح اور تعظیم ہے، کیونکہ وہ سری اللہ یا صفوۃ اللہ ہیں۔

اور اہانت کی مثال جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ قول ''تَبَّتْ يَدَآ اَبِىْ لَهَبٍ'' (اللہب:۱) ''تباہ ہو

جائیں ابولہب کے دونوں ہاتھ" اس میں ایک اور نکتہ بھی مضمر ہے وہ یہ ہے کہ "ابی لھب" کہنے میں اس کے جہنمی ہونے سے کنایہ بھی ہے۔

(۳) اشارہ کے ساتھ تاکہ معرف کو محسوس طور پر سننے والے کے ذہن میں حاضر کر کے پوری طرح ممیز کر دیا جائے' جیسے "هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَاَرُوْنِیْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِیْنَ مِنْ دُوْنِهٖ" (لقمان:۱۱) "یہ تو اللہ کا بنایا ہوا ہے مجھے وہ دکھاؤ جو اس کے سوا اوروں نے بنایا" اور کبھی اس سے سامع کی غباوت اور کند ذہنی کی طرف تعریض اور اشارہ کرنا مقصود ہوتا ہے کہ سامع اتنا موٹے دماغ کا ہے کہ وہ حسی اشارہ کے بغیر کسی شے کی تمیز ہی نہیں کر سکتا' اسی مذکورہ بالا آیت سے اس کو بھی سمجھا جا سکتا ہے' الگ مثال کی ضرورت نہیں ہے۔

اور کبھی اسم اشارہ قریب کے ذریعہ مشار الیہ کی تحقیر مقصود ہوتی ہے' جیسے کفار کا قول "اَهٰذَا الَّذِیْ یَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ" (الانبیاء:۳۶) "کیا یہ ہیں وہ جو ہمارے خداؤں کو برا کہتے ہیں"۔ "اَهٰذَا الَّذِیْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا" (الفرقان:۴۱) "کیا یہ ہیں جن کو اللہ نے رسول بنا کر بھیجا" اور "مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا" (البقرہ:۲۶) "اللہ نے ایسی مثال سے کیا ارادہ کیا؟" یا جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد "وَمَا هٰذِهِ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ" (العنکبوت:۶۴) "دنیا کی زندگی تو نہیں مگر کھیل کود" بھی اسم اور کبھی اشارہ اسم بعید سے مشار الیہ کی تعظیم مقصود ہوتی ہے' مثلاً "ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ" (البقرہ:۲) "وہ بلند درجہ کتاب کوئی شک کی جگہ نہیں" اس کے درجہ کی دوری کی طرف جاتے ہوئے۔

(۴) اسم موصول کے ساتھ معرفہ لانا' یہ اس وقت ہوتا ہے جب اسم خاص کے ساتھ اس کا ذکر ناپسندیدہ تصور کیا جاتا ہو اور اس کی پردہ داری مقصود ہو یا اہانت وغیرہ دیگر اسباب کی بناء پر جیسے "وَالَّذِیْ قَالَ لِوَالِدَیْهِ اُفٍّ لَّكُمَا" (الاحقاف:۱۷) "اور وہ جس نے اپنے ماں باپ سے کہا: اف" اور "وَرَاوَدَتْهُ الَّتِیْ هُوَ فِیْ بَیْتِهَا" (یوسف:۲۳) "اور وہ جس عورت کے گھر میں تھا اس نے اسے لبھایا"۔

○ اور کبھی یہ تعریف بالموصول عموم مراد لینے کی غرض سے ہوتی ہے' جیسے "اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا" (حم السجدہ:۳۰) "اور وہ جس نے کہا: ہمارا رب اللہ ہے پھر

اس پر قائم رہے" الایہ اور "وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا" (العنکبوت:۶۹) "اور جنہوں نے ہماری راہ میں کوشش کی ضرور ہم انہیں اپنے رستے دکھا دیں گے" اور "اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ" (المؤمن:۶۰) "وہ جو میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں عنقریب جہنم میں جائیں گے ذلیل ہو کر" یا اختصار کی غرض سے موصول سے معرفہ لایا جاتا ہے۔ جیسے "لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا" (الاحزاب:۶۹) "ان جیسے نہ ہونا جنہوں نے موسیٰ کو ستایا تو اللہ نے اسے بری فرما دیا اس بات سے جو انہوں نے کہی" یعنی ان کے اس قول سے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو آدر کی بیماری ہے' اللہ تعالیٰ نے ان کی برأت کا اظہار فرما دیا' اس میں اختصار یوں ہوا کہ اگر ان کے ناموں کی فہرست گنوائی جاتی تو بات طول پکڑ جاتی۔

اور یہ مثال عمومیت کی اس لیے نہیں ہو سکتی' کیونکہ تمام بنی اسرائیل نے تو موسیٰ علیہ السلام کے حق میں یہ بیماری کا عیب لگانے والا قول نہیں کیا تھا۔

تعریف وتنکیر کے متعلق ایک اور قاعدہ

جب کسی اسم کا ذکر دو بار ہو تو اس کے چار احوال ہوتے ہیں:

(۱) دونوں معرفہ ہوں (۲) دونوں نکرہ ہوں (۳) اول نکرہ ثانی معرفہ (۴) اس کے برعکس (یعنی اوّل معرفہ اور ثانی نکرہ) اگر دونوں اسم معرفہ ہوں تو اس صورت میں غالب طور پر ثانی عین اوّل ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے اس معہود پر دلالت کرتا ہے جو لام یا اضافت میں اصل ہے۔ جیسے:

وَقِهِمُ السَّیِّاٰتِ وَمَنْ تَقِ السَّیِّاٰتِ. (المؤمن:۹) اور انہیں برائیوں (کے وبال) سے بچاؤ اور اس دن تو جسے برائیوں (کے وبال) سے بچائے۔

اور اگر دونوں نکرہ ہوں تو ثانی غیر اوّل ہوگا اور ایسا اکثر اور غالب طور پر ہے کیونکہ اگر ثانی کو اوّل سے جدا کوئی دوسرا اسم قرار نہ دیں تو پھر تو وہی تعریف اس کے مناسب تھی' اس بناء پر کہ وہ اسم ثانی معہود سابق ہے' جیسے:

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّشَيْبَةً. (الروم:۵۴)	اللہ ہے جس نے تمہیں کمزوری کی حالت میں پیدا کیا' پھر تمہیں کمزوری کے بعد قوت عطا فرمائی' پھر قوت کے بعد ضعف اور بڑھاپا دیا۔

اس میں اول ''ضعف'' سے مراد نطفہ ہے اور ثانی ''ضعف'' سے بچپن اور ''ضعف'' ثالث سے بڑھاپا مراد ہے۔

اللہ تعالیٰ کا قول ''فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًاO اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًاO'' (الانشراح:۶-۵) ''تو بے شک دشواری کے ساتھ آسانی ہےO دشواری کے ساتھ آسانی ہے'' میں دونوں ہی قسمیں جمع ہوگئی ہیں' چنانچہ دوسرا ''عسر'' وہی ہے جو کہ پہلا ''عسر'' ہے مگر دوسرا ''یسر'' پہلے ''یسر'' کا غیر ہے' اس بات کی تائید حضور ﷺ کے اس فرمان سے بھی ہوتی ہے' آپ نے فرمایا: ''لَنْ يَّغْلِبَ عُسْرٌ يُّسْرَيْنِ'' ایک عُسر (تنگی) دو یُسروں (آسانیوں) پر غالب نہیں ہو سکتی۔

ایک شاعر کہتا ہے:

اِذَا اشْتَدَّتْ بِكَ الْبَلْوٰى فَفَكِّرْ فِیْ اَلَمْ نَشْرَحْ
فَعُسْرٌ بَيْنَ يُسْرَيْنِ اِذَا فَكَّرْتَهٗ فَافْرَحْ

(۳) اگر پہلا اسم نکرہ اور دوسرا معرفہ تو عہد پر حمل کرتے ہوئے ثانی اسم بعینہ اسم اول قرار پائے گا۔

جیسے ''اَرْسَلْنَا اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًاO فَعَصٰى فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ'' (المزمل:۱۶-۱۵) ''ہم نے فرعون کی طرف رسول بھیجے تو فرعون نے اس رسول کا حکم نہ مانا''۔ ''فِيْهَا مِصْبَاحٌ اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَةٍ اَلزُّجَاجَةُ'' (النور:۳۵) ''اس میں چراغ ہے وہ چراغ ایک فانوس میں ہے''۔ ''اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ صِرَاطِ اللّٰهِ'' (الشوریٰ:۵۳-۵۲) ''سیدھی راہ اللہ کی راہ''۔ ''مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍO اِنَّمَا السَّبِيْلُ'' (الشوریٰ:۴۲-۴۱) ''ان پر کچھ مواخذہ کی راہ نہیں بے شک مواخذہ''۔

(۴) اگر اول اسم معرفہ ہو اور ثانی اسم نکرہ ہو تو مطلق طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا بلکہ قرائن پر مدار

ہوگا' چنانچہ کبھی دونوں اسموں کے باہم مغائر ہونے پر قرینہ قائم ہوگا' جیسے ''وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ مَا لَبِثُوْا غَيْرَ سَاعَةٍ'' (الروم:۵۵) ''اور قیامت کے دن مجرم قسمیں کھائیں گے کہ نہ رہے تھے مگر ایک گھڑی'' اور کبھی دونوں اسموں کے متحد ہونے پر قرینہ پایا جاتا ہے۔ جیسے ''لِلنَّاسِ فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَO قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا'' (الزمر:۲۸-۲۷) ''بے شک ہم نے لوگوں کے لیے اس قرآن میں ہر قسم کی مثالیں بیان فرمائی ہیں' تا کہ وہ نصیحت قبول کریں (ہم نے انہیں عربی (زبان کا) قرآن (عطا فرمایا)''۔

O تنبیہ: شیخ بہاؤ الدین نے ''عروس الافراح'' میں بیان کیا ہے اور دوسرے حضرات کا بھی کہنا ہے کہ یہ مذکورہ بالا قاعدہ' مستحکم اور مکمل نہیں معلوم ہوتا یا یوں کہہ لیں کہ یہ قاعدہ کلیہ نہیں ہے کیونکہ بہت سی آیات سے اس پر نقض وارد ہوتا ہے۔

مثلاً مذکورہ بالا پہلی قسم میں (یعنی جب کہ معرفہ کا اعادہ معرفہ کے ساتھ ہو تو ثانی عین اوّل ہوتا ہے) اس آیت کے ساتھ یہ قاعدہ ٹوٹ جاتا ہے کہ مثلاً اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ''هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ'' (الرحمٰن:۶۰) ''نیکی کا بدلا نیکی کے سوا کچھ نہیں'' اس میں ''الاحسان'' کا اسم دونوں جگہ معرفہ وارد ہوا ہے' حالانکہ ثانی غیر اول ہے' عین نہیں ہے اور اسی طرح آیت ''اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ'' (البقرہ:۱۷۸) ''آزاد کے بدلے آزاد''۔ ''هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ'' (الدھر:۱) ''بے شک گزرا ہے انسان پر زمانے میں ایک ایسا وقت'' کہ اس کے بعد آگے ایک مقام پر فرمایا: ''اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ'' (الدھر:۲) ''بے شک ہم نے آدمی کو مخلوط نطفے سے پیدا کیا'' یہاں بھی دونوں جگہ ''الانسان'' معرفہ وارد ہوا' مگر دوسرے سے مراد اور ہے اور پہلے سے مراد اور ہے کیونکہ پہلے ''الانسان'' سے مراد آدم علیہ السلام ہیں اور دوسرے سے مراد آدم علیہ السلام کی اولاد سے ہے۔ اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کے اس قول میں ''وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتَابَ فَالَّذِيْنَ اٰتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ'' (العنکبوت:۴۷) ''اے محبوب! یونہی تمہاری طرف کتاب اتاری تو وہ جنہیں ہم نے کتاب عطا فرمائی وہ اس پر ایمان لاتے ہیں'' کیونکہ اس آیت میں پہلی کتاب سے قرآن اور دوسری کتاب سے تورات اور انجیل مراد ہے اور قسم ثانی (یعنی دونوں اسموں کا نکرہ ہونے کی صورت

میں دونوں کا متغائر ہونا) میں جو قاعدہ بیان کیا گیا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کے قول ''وَهُوَ الَّذِىْ فِى السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِى الْاَرْضِ اِلٰهٌ'' (الزخرف:۸۴) ''وہ ذات آسمان میں معبود ہے اور زمین میں معبود ہے'' اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کے قول ''يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ'' (البقرہ:۲۱۷) ''تم سے پوچھتے ہیں ماہِ حرام میں لڑنے کا حکم' تم فرماؤ اس میں لڑنا بڑا گناہ ہے'' سے نقض وارد ہوتا ہے کہ دو قول میں ہر دو اسم نکرہ ہیں' حالانکہ دونوں قولوں میں دوسرے دوسرے قول سے پہلا اسم ہی مراد ہے' مغایرت نہیں پائی گئی۔

اور قاعدہ کی قسم ثالث میں اللہ تعالیٰ کے قول ''اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا وَالصُّلْحُ خَيْرٌ'' (النساء:۱۲۸) ''کہ آپس میں صلح کرلیں اور صلح خوب ہے''۔ ''وَيُؤْتِ كُلَّ ذِىْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ'' (ھود:۳) ''اور ہر فضیلت والے کو اس کا فضل پہنچائے گا''۔ ''وَيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ'' (ھود:۵۲) ''اور بڑھا دے گا تمہیں قوت میں تمہاری پہلی قوت سے''۔ ''لِيَزْدَادُوْا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ'' (الفتح:۴) ''تاکہ وہ اور بڑھ جائیں (قوت) ایمان میں اپنے (پہلے) ایمان کے ساتھ''۔ ''زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ'' (النحل:۸۸) ''ہم نے عذاب پر عذاب بڑھایا''۔ ''وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا اِنَّ الظَّنَّ'' (یونس:۳۶) ''اور ان میں اکثر تو نہیں چلتے مگر گمان پر بے شک گمان'' آیات سے نقض وارد ہوتا ہے کیونکہ ان میں ثانی غیر اول ہے۔

علامہ سیوطی قدس سرہ العزیز فرماتے ہیں:

اگر غور و فکر سے کام لیا جائے تو ثابت ہو جاتا ہے کہ ان مثالوں میں سے کسی مثال سے بھی قاعدہ مذکورہ بالا پر نقض وارد نہیں کیا جا سکتا' کیونکہ ''الاحسان'' میں جیسا کہ ظاہر حال سے معلوم ہوتا ہے' الف لام جنس کا ہے اور اس حالت میں وہ معنی کے لحاظ سے اسم نکرہ کی طرح ہوتا ہے' یہی حالت النفس اور الحر کی آیت کی ہے۔

بخلاف آیت العسر کے کہ اس میں الف لام عہد یا استغراق کے لیے آیا ہے' جیسا کہ حدیث پاک سے معلوم ہو رہا ہے۔

اسی طرح آیت الظن میں (جو قاعدہ سوم کے تحت پیش کی گئی ہے) ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ یہاں دوسرا ''ظن'' پہلے ظن کا مغائر ہے' بلکہ وہ قطعی طور پر پہلے کا عین ہے' اس لیے کہ ہر ''ظن'' (گمان) مذموم نہیں ہے اور ایسا ہو بھی کیونکر سکتا ہے کیونکہ قطعیات کو چھوڑ کر

شریعت کے باقی تمام احکام خود ظنی ہیں تو کیا پھر ہر گمان کو بُرا گمان کرنا بُرا نہ ہوا؟

اور اسی طرح ''آیۃ الصلح'' میں کوئی امر اس بات سے مانع نہیں کہ دوسری صلح سے وہی مذکورہ سابقہ صلح مراد ہو اور یہ وہ صلح ہے' جو میاں بیوی کے درمیان ہوتی ہے۔ پھر تمام معاملات میں صلح کا مستحب ہونا سنت سے ماخوذ ہے اور اس آیت سے قیاس کے طور پر' لیکن اسی کے ساتھ آیت میں عموم کا قول کرنا جائز نہیں ہے اور یہ نہیں کہنا چاہیے کہ ہر ایک صلح اچھی ہے' کیونکہ جو صلح کسی حرام کو حلال یا کسی حلال کو حرام قرار دیتی ہو' وہ یقیناً ممنوع ہے۔

''آیت قتال'' کی بھی یہی حالت ہے کہ بے شک اس میں ''قتال'' ثانی قتال اول کا عین نہیں ہے' بلکہ دونوں سے الگ الگ مراد وہ جنگ ہے جو کہ ہجرت کے دوسرے سال ابن الحضرمی کے سریہ میں ہوئی تھی اور وہی جنگ اس آیت کا سبب نزول ہے اور دوسرے ''قتال'' سے جنس قتال مراد ہے نہ کہ بعینہ وہی پہلا قتال اور رہی آیت کریمہ ''وَهُوَ الَّذِىْ فِى السَّمَآءِ اِلٰهٌ'' (الزخرف:۸۴) ''وہی ذات ہے جو آسمانوں کا معبود ہے'' تو اس کا جواب علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ دیا ہے کہ یہ ایک امر زائد کا فائدہ دینے کے لیے تکریر کے باب سے ہے۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنے قول ''سُبْحٰنَ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبِّ الْعَرْشِ'' (الزخرف:۸۲) ''پاکی ہے آسمان اور زمین کے رب کو عرش کے رب کو'' میں اسی فائدہ کے لیے مکرر ذکر فرمایا ہے اور اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کی طرف اولاد کی نسبت کرنے سے اس کی تنزیہ (پاکی) میں اطناب کرنا مقصود ہے اور اس قاعدہ کی شرط یہ ہے کہ تکریر کا قصد نہ ہو۔

قاعدہ (دربیان مفرد وجمع)

مفرد اور جمع لانے کے قواعد میں سے ایک ''السماء'' اور ''الارض'' کا مفرد اور جمع ہونا ہے' قرآن پاک میں جہاں کہیں بھی ''ارض'' کا لفظ آتا ہے' مفرد ہی آیا ہے' جمع کے صیغہ کے ساتھ واقع نہیں ہوا' بخلاف ''السموات''۔

''ارض'' کی جمع نہ آنے کی وجہ اس کا ثقیل ہونا ہے' کیونکہ اس کی جمع ہے: ''ارضون'' اور اسی لیے جہاں تمام زمینوں کا ذکر مقصود ہوتا ہے' وہاں اللہ تعالیٰ نے ''وَمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ''

فرمایا ہے' لیکن سماء کسی جگہ صیغہ جمع کے ساتھ اور کہیں صیغہ مفرد کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے' موقع محل کے مطابق ہر ایک میں کوئی نہ کوئی نکتہ ہوتا ہے' جو اس مقام کے مناسب ہوتا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ جس جگہ تعداد ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے' وہاں پر بصیغہ جمع ذکر کیا گیا ہے' جو کہ کثرت اور عظمت کی وسعت پر دلالت کرتی ہے' جیسے اس کی مثال ہے: ''سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ'' (الحشر:۱) ''اللہ کی پاکی بولتا ہے جو کچھ آسمان میں ہے'' یعنی ہر آسمان مع اپنی تعداد کے اختلاف کے اور جہاں محض جہت مراد ہوتی ہے۔ وہاں ''السماء'' مفرد صیغہ کے ساتھ ذکر کیا گیا' مثلاً ''وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ'' (الذریٰت:۲۲) ''اور آسمان میں تمہارا رزق ہے'' اور ''ءَ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ'' (الملک:۱۶) ''کیا تم نڈر ہو گئے جس کی سلطنت آسمان میں ہے کہ تمہیں زمین میں دھنسا دے گا'' یعنی تمہارے اوپر سے یہاں سمت مراد ہے۔

افراد جمع کی ایک مثال ''الریح'' ہے' یہ لفظ واحد اور جمع دونوں طرح مذکور ہوتا ہے' جس مقام پر اس سے مراد ''رحمت'' ہو' وہاں جمع اور جہاں ''عذاب'' کے سیاق میں واقع ہو' اس جگہ واحد ذکر کیا ہے۔

ابن ابی حاتم اور دوسرے علماء نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے' انہوں نے فرمایا کہ ''الریاح'' بصیغہ جمع قرآن میں جہاں بھی آیا ہے وہ رحمت (کے لیے) ہے اور جہاں کہیں ''الریح'' آیا' وہ عذاب (کے لیے) ہے' اس لیے حدیث مبارک میں آیا ہے: ''اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهَا رِيَاحًا وَّلَا تَجْعَلْهَا رِيْحًا'' اے اللہ! تو اس ہوا کو ''ریاحا'' (رحمت) بنا اور ''ریح'' عذاب نہ بنا۔

اس کی حکمت یہ بیان کی گئی ہے کہ باد رحمت کے مختلف فوائد' خصوصیات' تاثیرات اور منافع ہوتے ہیں' لہٰذا جب ان میں سے کوئی تند و تیز ہوا چلتی ہے تو اس کے مقابل دوسری ہوا ایسی چلا دی جاتی ہے' جو پہلی ہوا کی طوفان خیزی اور آفت انگیزی کا زور توڑ کر اس میں ایک قسم کی لطافت اور خنکی پیدا کر دیتی ہے' جو حیوانات اور نباتات کے لیے یکساں طور پر مفید ثابت ہوتی ہے' لہٰذا رحمت میں بہت سی ہوائیں ہوئیں اور عذاب کی حالت میں وہ (ہوا) ایک ہی طرح سے چلتی ہے اور اس جھکڑ اور آندھی کے مقابل اور اس کو دفع کرنے والی دوسری ہوا نہیں

ہوتی' مگر اللہ تعالیٰ کا قول جو سورۂ یونس میں ہے:

''وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ'' (یونس:۲۲) ''اور لوگوں کو لے کر موافق ہوا کے ساتھ چلیں'' وہ اس زیر بحث قاعدہ سے اس لیے خارج ہو گیا ہے کہ اس میں ''ریح'' کو باوجودیکہ رحمت کے معنی میں ہے' مفرد لایا گیا ہے۔

اور اسے مفرد لانے کی دو وجہیں ہیں:

(۱) ایک وجہ لفظی ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قول ''وَجَآءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ'' (یونس:۲۲) ''ان پر آندھی کا جھونکا آیا'' میں جو لفظ ''ریح'' آیا ہے' وہ مفرد ہے۔ لہٰذا اس کے مقابلہ میں واقع ہونے کی وجہ سے مشاکلت لفظی کا لحاظ رکھتے ہوئے اس میں بھی مفرد لے آئے' کیونکہ بہت سی چیزیں ایسی ہوتی ہیں' جو مستقل طور پر تو جائز نہیں ہوتیں مگر مقابلہ کی صورت میں ان کا جواز ثابت ہو سکتا ہے۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد ''وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ'' (آل عمران:۵۴) ''اور کافروں نے مکر کیا اور اللہ نے خفیہ تدبیر کی'' میں ہے کہ کافروں کے ''مکر'' کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے عمل سزا جو ان کے مکر و فریب پر مرتب ہوتا ہے' کو بھی مقابلہ کے طور پر اسی لفظ ''مکر'' سے تعبیر فرما دیا اور مقابلہ سے الگ کر کے دوسری حالتوں میں بالاستقلال دیکھا جائے تو معاذ اللہ اللہ سبحانہ وتقدس کی طرف ''مکر'' کی نسبت ناجائز ہے' وہ ایسے عیوب سے پاک ہے' دوسری وجہ معنوی ہے' وہ یہ ہے کہ اس مقام پر رحمت کا اتمام کو اکمال ''ریح'' کی وحدت سے ہی حاصل ہوتا ہے' نہ کہ اس کے اختلاف سے کیونکہ سفینہ (بحری جہاز) صرف موافق ہوا ہی سے چلتا ہے' باد مخالف سے نہیں چل سکتا' بلکہ مختلف ہواؤں کے جھمیلوں اور تھپیڑوں سے اس کی ہلاکت اور تباہی ہو جاتی ہے' الغرض یہاں ایک ہی نوع کی ہوا مطلوب ہے' اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس ''ریح'' کو ''طیبہ'' کی صفت کے ساتھ مؤکد کر کے بیان فرمایا ہے۔ اسی بیان کردہ قاعدہ مبینہ پر اللہ تعالیٰ کا قول ''اِنْ يَّشَاْ يُسْكِنِ الرِّيْحَ فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ'' (الشوریٰ:۳۳) ''وہ چاہے تو ہوا تھما دے کہ ٹھہری رہ جائیں'' بھی موجود ہے۔

مگر ابن المنیر نے کہا ہے کہ نہیں یہ آیت مذکورۃ الصدر قاعدہ پر آئی ہے کیونکہ ہوا کا ساکن

ہو جانا' جہاز والوں پر عذاب و مصیبت ہوتا ہے۔

○ افراد و جمع کی مثالوں میں سے ایک ''نور اور ظلمت'' کی مثال ہے۔

''نور'' کو ہمیشہ مفرد اور ''ظلمات'' کو بہ صیغہ جمع لایا گیا ہے' اسی طرح ''سبیل الحق'' کو مفرد اور ''سبل الباطل'' کو جمع ذکر کیا گیا ہے' اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ قول ''وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ'' (الانعام: ۱۵۳) ''نہ چلو کہ وہ راہیں تمہیں (اللہ کی راہ) سے جدا کر دیں'' ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ حق کا راستہ ایک ہی ہے اور باطل کے راستے شاخ در شاخ اور متعدد ہیں اور ''ظلمت'' بہ منزلۂ طرقِ باطل اور ''نور'' بہ منزلۂ طرقِ حق ہے' بلکہ وہ دونوں بالکل ان دونوں کی طرح ہیں۔ اور اسی قاعدہ پر ''ولی المومنین'' (مسلمانوں کے دوست) کو واحد اور ''اولیاء الکفار'' (کفار کے دوستوں) کو بہ صیغہ جمع اس وجہ سے ذکر کیا ہے کہ ان کی تعداد کثیر ہے' چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ. (البقرہ: ۲۵۷)

اللہ مددگار ہے ایمان والوں کا' نکالتا ہے انہیں تاریکیوں سے روشنی کی طرف اور جنہوں نے کفر کیا ان کے دوست شیطان ہیں' وہ انہیں روشنی سے تاریکیوں کی طرف نکالتے ہیں۔

اسی اصول پر ''نار'' جہاں کہیں بھی آیا ہے' مفرد ذکر ہوا ہے اور ''جنہ'' واحد اور جمع دونوں صیغوں کے ساتھ واقع ہوا ہے' کیونکہ ''جنان'' باغ مختلف الانواع ہیں' لہٰذا ان کی جمع لانا مستحسن تھا اور ''نار'' آتش ایک ہی مادہ ہے' دوسری وجہ یہ ہے کہ جنت رحمت ہے اور ''نار'' آگ عذاب' اس لیے ''ریاح'' اور ''ریح'' کی تعریف کے مطابق جنت کو بہ صیغہ جمع اور نار کو بہ صیغہ واحد بیان کرنا مناسب ٹھہرا۔

''الصدیق'' کو بہ صیغہ مفرد لانے اور ''الشافعین'' کو جمع لانے میں بھی وہی قاعدہ کارفرما ہے' اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ''فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ ○ وَلَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ ○'' (الشعراء: ۱۰۰-۱۰۱) ''اور اب ہمارا کوئی سفارشی نہیں ○ اور نہ کوئی غم خوار دوست ○'' اور اس کی حکمت

یہ ہے کہ عادتاً شفاعت چاہنے والوں کی کثرت اور سچے دوست کی کمی ہوتی ہے۔

زمخشری کہتا ہے کہ کیا تم نہیں دیکھتے ہو کہ جب کوئی شخص کسی ظالم کے ظلم کا شکار ہو اور اس کے جور و ستم میں مبتلا ہوتا ہے تو اس کے کتنے ہی اہل وطن کہ ان میں سے اکثر کی اس سے جان پہچان بھی نہیں ہوتی' اس کی محض جذبہ خیر سگالی اور رحم دلی کے تحت سفارش کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں' لیکن مخلص اور سچے دوست کا ملنا اونٹنی کا انڈہ اور دودھ کا دریا لانے کی مانند کارِ دشوار است۔

○ مفرد اور جمع لانے کی مثالوں میں ایک ''سمع'' اور ''بصر'' ہے۔ ''سمع'' مفرد اور ''بصر'' بہ صیغہ جمع ''ابصار'' آیا ہے' اس کی وجہ یہ ہے کہ ''سمع'' پر مصدریت غالب ہے' لہٰذا اس کو مفرد لایا جاتا ہے اور اس کے برخلاف ''بصر'' کہ وہ اعضاء جارحہ یعنی ظاہری اعضاء میں مشہور ہے اور اس لیے بھی سمع سے اصوات (آوازیں) کا تعلق ہے' جو ایک ہی حقیقت رکھتی ہیں جبکہ ''بصر'' کا تعلق رنگوں اور کائنات کی دیگر اشیاء سے ہے' جو مختلف حقیقتیں ہیں۔

چنانچہ ان دونوں لفظوں کے اس اندازِ استعمال میں ان کے تعلقات اور ان کی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ قول بھی ہے: ''وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ'' (الملک: ۲۳) اور تمہارے لیے کان اور آنکھیں بنائے' اس کی ایک مثال ''مشرق'' اور ''مغرب'' ہیں کہ ہر دو لفظ مفرد' تثنیہ اور جمع تینوں طریقوں سے آئے ہیں۔ جہاں مفرد ذکر کیے گئے ہیں' وہاں جہت کا اعتبار ہے' اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا قول ''رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ'' (الرحمٰن: ۱۷) ''دونوں مغرب کا رب اور دونوں مشرق کا رب'' ہے اور جس مقام پر تثنیہ کے صیغہ کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے' وہاں دو موسموں سرما اور گرما کے دو مشرقوں اور دو مغربوں کا اعتبار کیا گیا ہے' اس کی مثال ''رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ'' (الشعراء: ۲۸) ''مشرق اور مغرب کا رب' اور جہاں ان دونوں لفظوں کو بہ صیغہ جمع لایا گیا ہے' وہاں سال کی دونوں فصلوں (گرمی' سردی) میں تعدد مطالع کا اعتبار کرتے ہوئے ایسا کیا گیا ہے' اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: ''بِرَبِّ الْمَشَارِقِ وَالْمَغَارِبِ'' (المعارج: ۴۰) ''مشرقوں اور مغربوں کے رب کی قسم!''۔

سوال وجواب کا بیان

جواب میں اصل یہ ہے کہ سوال کے مطابق ہو۔

لیکن بعض اوقات اس امر پر تنبیہ کرنے کے لیے کہ سوال یوں نہیں بلکہ یوں کرنا چاہیے تھا' سوال کے تقاضوں سے تجاوز کرتے ہوئے بھی جواب دے دیا جاتا ہے۔ یعنی یہ بات سمجھانے کے لیے کہ سائل کا سوال غلط ہے' اس کو جواب کے انداز پر سوال کرنا مناسب تھا' سوال کے مطابق جو جواب دینا چاہیے تھا' اس کی بجائے کچھ اور جواب دے دیا جاتا ہے اور علامہ سکاکی اس اندازِ جواب کو اسلوب حکیم کا نام دیتے ہیں۔

○ اور ہر سوال میں چونکہ اس بات کی حاجت ہوتی ہے کہ اس کا جواب سوال کی بہ نسبت زیادہ عام ہو' لہٰذا جواب زیادہ عام بھی ہوتا ہے اور بعض اوقات مقتضائے حال کے مطابق جواب سوال کی نسبت سے بہت زیادہ ناقص بھی آتا ہے۔

اور اس سوال و جواب کی مثال کہ جس میں سوال کے مقتضی سے عدول کر کے سائلین کو کچھ اور جواب دیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: ''یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ قُلْ هِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ'' (البقرہ:۱۸۹) ''تم سے نئے چاند کو پوچھتے ہیں' تم فرما دو وہ وقت کی علامتیں ہیں لوگوں اور حج کے لیے'' لوگوں نے ہلال کے بارے میں سوال کیا' وہ شروع شروع میں دھاگے کی طرح باریک سا دکھائی دیتا ہے' پھر رفتہ رفتہ بڑھتا ہے حتیٰ کہ ماہ کامل بن جاتا ہے اور اس کے بعد دوبارہ گھٹتے گھٹتے اپنی پہلی صورت پر آ جاتا ہے' ایسا کیوں ہوتا ہے؟

مگر اس سوال کے جواب میں ان لوگوں کو چاند کے گھٹنے بڑھنے کی حکمت بتا دی گئی ہے۔ اس کی علت نہیں بتلائی گئی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں اس امر پر متنبہ کرنا مقصود تھا کہ تمہیں جو جواب دیا گیا ہے' تم کو سوال ہی اس چیز کے بارے میں کرنا چاہیے تھا اور تم لوگوں نے جو سوال کیا' وہ غیر ضروری سوال ہے۔

لیکن یہ ساری تقریر اس صورت میں ہے' جب ان کا سوال کرنا ایسا ہی ہو جیسا کہ ہم نے بیان کیا' اس لیے کہ یہ بھی تو ممکن ہے کہ ان کا سوال ہی اس بارے میں ہو کہ وہ اس کی حکمت

دریافت کرنا چاہتے ہوں تو اس صورت میں پھر سوال اور جواب میں مطابقت کا پایا جانا ظاہر ہے۔

اور جواب میں سوال سے زیادتی کرنے کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ قول ''یُنَجِّیْكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ'' (الانعام:۶۴) ''(اللہ ہی) تمہیں اس سے اور ہر سختی سے بچاتا ہے'' ہے کیونکہ یہ قول ''مَنْ یُّنَجِّیْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ'' (الانعام:۶۳) ''کون تمہیں نجات دیتا ہے خشکی اور دریاؤں کی تاریکیوں میں'' کے جواب میں آیا ہے اور موسیٰ علیہ السلام کا قول ''هِیَ عَصَایَ اَتَوَكَّؤُا عَلَیْهَا وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰی غَنَمِیْ'' (طٰہٰ:۱۸) ''یہ میرا عصا ہے میں اس پر ٹیک لگاتا ہوں اور اس سے بکریوں کے لیے پتے جھاڑ لیتا ہوں'' بھی اسی طرح کا ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے صرف یہ فرمایا تھا کہ ''وَمَا تِلْكَ بِیَمِیْنِكَ یٰمُوْسٰی'' (طٰہٰ:۱۷) ''اے موسیٰ! تمہارے دائیں ہاتھ میں کیا ہے؟'' مگر موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی کی لذت و سرور میں جواب دراز کر دیا۔

اسی طرح قوم ابراہیم کا جواب ''نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِیْنَ'' (الشعراء:۷۱) ''ہم بتوں کی عبادت کرتے ہیں تو ہم انہی کے لیے جم کر بیٹھے رہتے ہیں'' بھی اصل سوال ''مَا تَعْبُدُوْنَ'' (الشعراء:۷۰) ''تم کس کی عبادت کرتے ہو'' سے زائد ہے' اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے بتوں کی پرستش میں اپنے مسرت محسوس کرنے اور بت پرستی پر ڈٹے رہنے کا اظہار کرنے کی غرض سے جواب کو طول دیا ہے تاکہ سوال کرنے والے کو غیظ میں جلائیں اور اس کے غضب کو بڑھکائیں۔

وجوہ اور نظائر کی شناخت

وجوہ

وہ مشترک لفظ جو کئی معانی میں استعمال ہو' جس طرح کہ لفظ ''امۃ'' ہے۔

نظائر

مترادف اور ہم معنی الفاظ کو نظائر کہتے ہیں' بعض علماء نے اس کو معجزاتِ قرآن کی انواع

سے شمار کیا ہے کیونکہ قرآن پاک کا ایک ہی کلمہ بیس یا اس سے کم وبیش وجوہ اور طریقوں پر جاری وساری ہوتا ہے اور ایسا بندے بشر کے کلام میں نہیں پایا جاسکتا۔

ابن سعد اور دیگر محدثین نے حضرت ابوالدرداء سے موقوفاً روایت کیا ہے:

''لَا یَفْقَهُ الرَّجُلُ کُلَّ الْفِقْهِ حَتّٰی یَرٰی لِلْقُرْاٰنِ وُجُوْهًا کَثِیْرَةً''، یعنی کوئی شخص اس وقت تک کامل فقیہ نہیں ہوسکتا جب تک وہ قرآن حکیم کی بہت سی وجوہ پر نظر نہ رکھتا ہو۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ اس حدیث کی مراد اشارات باطنی کا بھی استعمال کرنا ہے اور یہ نہ کیا جائے کہ صرف ظاہری تفسیر پر ہی اقتصار کرلیا جائے۔ ابن سعد نے حضرت عکرمہ کے طریق پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ الکریم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو خوارج سے مباحثہ کے لیے بھیجتے وقت فرمایا تھا: تم خوارج کے پاس جاکر مباحثہ کرنا' لیکن خبردار! قرآن سے حجت نہ لانا کیونکہ وہ بہت سی وجوہ کا احتمال رکھتا ہے بلکہ ان کے ساتھ سنت کے ذریعے مقدمہ لڑنا' اس قسم کے چند خاص الفاظ کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

''الھدی'' یہ لفظ سترہ معانی کے لیے آتا ہے

(۱) ثبات ''اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ'' (الفاتحہ:۵) ''ہمیں سیدھی راہ چلا''۔

(۲) بیان ''اُولٰٓئِكَ عَلٰی ھُدًی مِّنْ رَّبِّھِمْ'' (البقرہ:۵) ''وہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں''۔

(۳) دین ''اِنَّ الْھُدٰی ھُدَی اللّٰهِ'' (آل عمران:۷۳) ''ہدایت تو وہی ہے جو اللہ کی طرف سے ہدایت ہو''۔

(۴) ایمان ''وَیَزِیْدُ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اهْتَدَوْا ھُدًی'' (مریم:۷۶) ''اور جو ایمان سے مشرف ہوئے اللہ انہیں اور پختگی دے گا''۔

(۵) دعاء ''وَلِكُلِّ قَوْمٍ ھَادٍ'' (الرعد:۷) ''اور ہر قوم کے لیے آپ ہادی ہیں''۔

''وَجَعَلْنٰھُمْ اَئِمَّةً یَّھْدُوْنَ بِاَمْرِنَا'' (الانبیاء:۷۳) ''ہم نے ان کو پیشوا بنایا وہ ہمارے حکم سے ہدایت کرتے ہیں''۔

(۶) رسول اور کتب الٰہی ''فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ ھُدًی'' (البقرہ:۳۸) ''تو میری طرف سے

تمہارے پاس کوئی رسول آئے''۔

(۷) معرفت ''پہچان'' ''وَبِالنَّجْمِ ھُمْ یَھْتَدُوْنَ'' (النحل:۱۶) ''اور ستاروں سے وہ معرفت پاتے ہیں''۔

(۸) بمعنی نبی ﷺ ''اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَالْھُدٰی'' (البقرہ:۱۵۹) ''بے شک وہ لوگ جو ہماری اتاری ہوئی روشن باتوں اور ہدایت کو چھپاتے ہیں''۔

(۹) قرآن ''وَلَقَدْ جَآءَھُمْ مِّنْ رَّبِّھِمُ الْھُدٰی'' (النجم:۲۳) ''حالانکہ بے شک ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے ہدایت آئی'' (یعنی قرآن پاک)۔

(۱۰) توراۃ: ''وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْھُدٰی'' (غافر:۵۳) ''بے شک ہم نے موسیٰ کو تورات عطا کی''۔

(۱۱) استرجاع: ''وَاُولٰٓئِكَ ھُمُ الْمُھْتَدُوْنَ'' (البقرہ:۱۵۷) ''اور یہی لوگ ہدایت پر ہیں''۔

(۱۲) حجت: ''دلیل'' ''لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ'' (آل عمران:۸۶) ''ہدایت نہیں دیتا (اللہ) ظالم لوگوں کو'' (یعنی دلیل وحجت کا علم)۔

بعد قولہ تعالیٰ ''اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰھٖمَ فِیْ رَبِّهٖٓ'' (البقرہ:۲۵۸) ای لا یھدیھم حجه''۔

(۱۳) توحید: ''اِنْ نَّتَّبِعِ الْھُدٰی مَعَكَ'' (القصص:۵۷) ''اگر ہم تمہارے ساتھ توحید کے پیروکار بنیں''۔

(۱۴) سنت: ''فَبِھُدٰھُمُ اقْتَدِهْ'' (الانعام:۹۰) ''تو تم انہیں سنت کی پیروی کرو''۔

''وَاِنَّا عَلٰٓی اٰثٰرِھِمْ مُّھْتَدُوْنَ'' (الزخرف:۲۲) ''اور ہم انہیں کی سنت پر چل رہے ہیں''۔

(۱۵) اصطلاح: ''وَاَنَّ اللّٰهَ لَا یَھْدِیْ كَیْدَ الْخَآئِنِیْنَ'' (یوسف:۵۲) ''اور یقیناً اللہ تعالیٰ کامیاب نہیں ہونے دیتا دغابازوں کی فریب کاری کو''۔

(۱۶) الہام: ''اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ ھَدٰی'' (طٰہٰ:۵۰) ''ای المھد المعاش''۔

(۱۷) توبہ: ''اِنَّا ھُدْنَآ اِلَیْكَ'' (الاعراف:۱۵۶) ''بے شک ہم تیری طرف رجوع لائے''۔

(۱۸) ارشاد: ''اَنْ یَّھْدِیَنِیْ سَوَآءَ السَّبِیْلِ'' (القصص:۲۲) ''(میرا رب) مجھے سیدھی راہ

بتائے‘‘۔

’’السوء‘‘ یہ بھی کئی وجوہ پر آتا ہے

(۱) شد: ’’يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ‘‘ (البقرۃ:۴۹)۔

(۲) عقر: کونچیں کاٹنا ’’وَلَا تَمَسُّوْهَا‘‘ (الاعراف:۷۳) ’’اسے ہاتھ نہ لگاؤ‘‘۔

(۳) زنا (بدکاری) ’’مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا‘‘ (یوسف:۲۵) ’’کیا سزا ہے اس کی جس نے تیری بیوی سے بدی چاہی‘‘۔

’’مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ‘‘ (مریم:۲۸) ’’تیرا باپ بدکار نہیں تھا‘‘۔

(۴) برص: سفید داغ: ’’بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ‘‘ (القصص:۳۲) ’’سفید چمکتا بے عیب‘‘۔

(۵) شرک: ’’مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ‘‘ (النحل:۲۸) ’’ہم تو کچھ برائی (شرک) نہیں کرتے ہیں‘‘۔

(۶) قتل اور شکست ’’لَمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ‘‘ (آل عمران:۱۷۴) ’’نہ چھوا ان کو کسی برائی نے‘‘۔

(۷) عذاب: ’’اِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَالسُّوْٓءَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ‘‘ (النحل:۲۷) ’’آج ساری رسوائی اور عذاب کافروں پر ہے‘‘۔

’’الصلوٰۃ‘‘ یہ بھی کئی وجوہ پر آتا ہے

(۱) پانچ نمازیں: ’’يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ‘‘ (البقرۃ:۳) ’’نماز قائم رکھیں‘‘۔

(۲) نماز عصر: ’’تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْ بَعْدِ الصَّلٰوةِ‘‘ (المائدہ:۱۰۶) ’’ان دونوں کو نماز عصر کے بعد روکو‘‘۔

(۳) نماز جمعہ: ’’اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ‘‘ (الجمعہ:۹) ’’جب نماز جمعہ کی اذان ہو‘‘۔

(۴) جنازہ: ’’وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ‘‘ (التوبہ:۸۴) ’’اور ان میں سے کسی کی میت پر کبھی نماز جنازہ نہ پڑھنا‘‘۔

(۵) دعاء: ’’وَصَلِّ عَلَيْهِمْ‘‘ (التوبہ:۱۰۳) ’’اور ان کے لیے دعا خیر کریں‘‘۔

(۶) دین: ’’اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ‘‘ (ھود:۸۷) ’’کیا تمہارا دین تمہیں یہ حکم دیتا ہے‘‘۔

(۷) قراءۃ: ’’وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ‘‘ (الاسراء:۱۱۰) ’’اور نہ تو بلند آواز سے قراءت کر‘‘۔

(۸) رحمت واستغفار: ’’اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ‘‘ (الاحزاب:۵۶) ’’بے شک

اللہ اور اس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں نبی مکرم پر‘‘۔

’’اَلرَّحْمَةُ وَرَدَتْ عَلٰى اَوْجُهٍ‘‘ (رحمت بھی کئی وجوہ پر آتا ہے)

(۱) اسلام: ’’يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ‘‘ (آل عمران:۷۴) ’’اپنے دین اسلام سے خاص کرتا ہے جسے چاہے‘‘۔

(۲) ایمان: ’’وَاٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ‘‘ (ھود:۲۸) ’’اور اس نے عطا فرمایا مجھے ایمان اپنی جناب سے‘‘۔

(۳) جنت: ’’فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ‘‘ (آل عمران:۱۰۷) ’’وہ اللہ کی رحمت (جنت) میں ہیں اور وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے‘‘۔

(۴) بارش: ’’بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ‘‘ (الاعراف:۵۷) ’’خوش خبری سناتے ہوئے اپنی رحمت (بارش) سے پہلے‘‘۔

’’اَلْفِتْنَةُ وَرَدَتْ عَلٰى اَوْجُهٍ‘‘ (لفظ فتنہ کئی وجوہ کے لیے آتا ہے)

(۱) شرک: ’’وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ‘‘ (البقرۃ:۱۹۱) ’’اور ان کا فتنہ (شرک) تو قتل سے بھی سخت ہے‘‘۔

(۲) گمراہ کرنا: ’’ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ‘‘ (آل عمران:۷) ’’گمراہی چاہنے کو‘‘۔

(۳) قتل: ’’اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا‘‘ (النساء:۱۰۱) ’’کہ کافر تمہیں قتل کر دیں گے‘‘۔

(۴) معذرت: ’’ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ‘‘ (الانعام:۲۳) ’’پھر ان کا کوئی بہانہ (معذرت) نہ ہوگا‘‘۔

(۵) قضاء: ’’اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ‘‘ (الاعراف:۱۵۵) ’’وہ نہیں مگر تیری قضا‘‘۔

(۶) مرض: ’’يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ‘‘ (التوبہ:۱۲۶) ’’ہر سال مرض میں مبتلا کیے جاتے ہیں‘‘۔

(۷) عبرت: ’’لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً‘‘ (یونس:۸۵) ’’ہمیں عبرت نہ بنا‘‘۔

’’اَلرُّوْحُ وَرَدَ عَلٰى اَوْجُهٍ‘‘ (روح کئی وجوہ کے لیے آتا ہے)

(۱) امر: (حکم) ’’وَرُوْحٌ مِّنْهُ‘‘ (النساء:۱۷۱) ’’اور اس کی طرف سے ایک حکم‘‘۔

(۲) وحی: ’’يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ‘‘ (النحل:۲) ’’فرشتوں کو اللہ اتارتا ہے وحی دے کر‘‘۔

(۳) قرآن: ’’اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا‘‘ (الشوریٰ:۵۲) ’’اور ہم نے تمہاری طرف

قرآن بھیجا اپنے حکم سے"۔

(۴) جبریل: "فَاَرْسَلْنَآ اِلَیْهَا رُوْحَنَا" (مریم:۱۷) "تو اس کی طرف ہم نے اپنا فرشتہ (جبریل) بھیجا"۔

(۵) روح بدن: "وَیَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ" (الاسراء:۸۵) "اور تم سے روح کو پوچھتے ہیں"۔

"الذکر" (کئی وجوہ کے لیے آتا ہے)

(۱) ذکر لسان: "فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ" (البقرہ:۲۰۰) "تو اللہ کا ذکر کرو جیسے اپنے باپ دادا کا ذکر کرتے تھے"۔

(۲) حفظ (یاد کرنا): "وَاذْكُرُوْا مَا فِیْهِ" (البقرہ:۶۳) "اور اس کے مضمون یاد کرو"۔

(۳) طاعت اور جزاء: "فَاذْكُرُوْنِیْٓ اَذْكُرْكُمْ" (البقرہ:۱۵۲) "تم میری اطاعت کرو میں تمہیں اچھی جزاء پرطور پر تمہارا چرچا کروں گا"۔

(۴) بات: "اُذْكُرْنِیْ عِنْدَ رَبِّكَ" (یوسف:۴۲) "اپنے رب (بادشاہ) کے پاس میری بات کرنا"، "اَیْ حَدِّثْهُ بِحَالِیْ"، "میرا حال ان سے کہنا"۔

(۵) قرآن: "وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ" (طٰہٰ:۱۲۴) "اور جس نے میرے ذکر (قرآن) سے منہ پھیرا"۔

(۶) شرف (عزت): "وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ" (الزخرف:۴۴) "اور بے شک وہ شرف ہے تمہارے لیے"۔

(۷) عیب: "اَهٰذَا الَّذِیْ یَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ" (الانبیاء:۳۶) "کیا یہ ہیں جو تمہارے خداؤں کا عیب نکالتے اور ان کو بُرا کہتے ہیں"۔

(۸) لوح محفوظ: "مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ" (الانبیاء:۱۰۵) "نصیحت کے بعد"۔

(۹) ثناء: "وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِیْرًا" (الاحزاب:۲۱) "اللہ کو بہت یاد کرے"۔

(۱۰) نماز: "وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ" (العنکبوت:۴۵) "اور بے شک اللہ کا ذکر سب سے بڑا"۔

فوائد: ابن فارس نے "کتاب الافراد" میں بیان کیا ہے:

قرآن مجید میں تمام مقامات پر لفظ "الأسف" رنج اور غم کے معنی میں استعمال ہوا ہے، مگر ایک جگہ "فلما اسفونا" میں اس کے معنی ہیں: "اغضبونا" یعنی انہوں نے ہمیں

غضب ناک کیا اور غصہ دلایا۔

O اور لفظ "بروج" قرآن پاک میں جہاں بھی ذکر ہوا ہے، اس سے کواکب (ستاروں کے برج) مراد ہیں، سوائے "وَلَوْ كُنْتُمْ فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَةٍ" (النساء:۷۸) "اگرچہ تم مضبوط قلعوں میں ہو"، کہ اس میں بروج کے معنی مضبوط اور عالی شان محل ہیں۔

"بر و بحر"

قرآن پاک میں جہاں بھی بحر و بر کا ذکر آیا، خشکی اور دریا کے معنوں میں استعمال ہوئے ہیں، مگر "ظَهَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ" (الروم:۴۱) "صحرا اور بستیوں میں فساد پھیل گیا" میں ان سے صحرا اور بستیاں مراد ہیں۔

"بعل": یہ لفظ عام طور پر شوہر کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، مگر "اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا" میں اس سے مراد ایک بت کا نام ہے۔

"اَلدَّحْضُ": قرآن مجید میں یہ لفظ جہاں بھی آیا ہے، اس سے مراد باطل لیا گیا مگر "فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِیْنَ" میں اس کے معنی ہیں: جو قرعہ اندازی میں نکلے ہیں۔

"الرجم": رجم کا لفظ ہر جگہ "قتل" کے معنی میں استعمال ہوا ہے، مگر "لارجمنك" میں اس کا معنی گالی گلوچ ہے اور "رَجْمًۢا بِالْغَیْبِ" کی مثال میں اس سے ظن اور اٹکل پچو کے معنی مراد ہیں۔

"شهيد": مقتولوں کے ذکر کے ساتھ آنے کے علاوہ دیگر جہاں بھی کہیں "شهيد" کا لفظ قرآن پاک میں ذکر ہوا ہے، اس سے لوگوں کے معاملات میں گواہی دینے والا شخص مراد ہے، مگر "وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ" (البقرہ:۲۳) میں اس سے مراد ہے کہ اپنے شریکوں کو بلاؤ۔

"اَصْحٰبُ النَّارِ": اس سے ہر جگہ اہل دوزخ مراد ہیں، مگر "وَمَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً" (المدثر:۳۱) "اور ہم نے دوزخ کے داروغہ نہ کیے مگر فرشتے" میں دوزخ کے محافظ و نگران فرشتے مراد ہیں:

"نباء": قرآن مجید میں "نباء" کا لفظ ہر جگہ بہ معنی خبر آیا ہے، مگر "فَعَمِیَتْ عَلَیْهِمُ الْاَنْۢبَآءُ" (القصص:۶۶) "تو اندھی ہو جائیں گی (نظر نہیں آئیں گی) ان پر خبریں (دلیلیں)" میں اس سے دلائل اور حجتیں مراد لیا گیا ہے۔

"بعد": ابن خالویہ کا بیان ہے کہ قرآن پاک میں لفظ "بعد" بہ معنی "قبل" صرف ایک مقام پر استعمال ہوا ہے اور وہ یہ ہے: "وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ" (الانبیاء: ۱۰۵) "اور بے شک ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد لکھ دیا" مغلطائی نے "کتاب المیسر" میں کہا ہے کہ ہم نے ایک جگہ اور بھی دریافت کیا ہے' وہ ہے قولہ "وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا O" (النّٰزعٰت: ۳۰) "اور اس کے بعد زمین پھیلائی"۔ ابوموسیٰ نے "کتاب المغیث" میں کہا ہے کہ اس جگہ "بعد" کا معنی ہے۔

"قبل": اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے زمین کو دو دن میں پیدا فرمایا' پھر آسمانوں کی تخلیق کا قصد فرمایا (یا ان کو درست فرمایا)' سو اس اعتبار سے زمین کی تخلیق آسمانوں کی تخلیق سے قبل (پہلے) ہوئی ہے۔ (ختم شد)

O نبی کریم ﷺ' صحابہ اور تابعین رضی اللہ عنہم سے اس موضوع پر کچھ باتیں منقول ہیں۔

چنانچہ امام احمد نے اپنی مسند میں اور ابن ابی حاتم وغیرہ نے دراج کے طریق پر بہ واسطہ ابوالہیثم' حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے' وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

كل حرف في القرآن يذكر فيه القنوت فهو الطاعة.	قرآن مجید میں جہاں کہیں "قنوت" کا ذکر ہوا ہے' اس سے اطاعت (عبادت) مراد ہے۔

اس حدیث کی سند جید ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

ابن ابی حاتم نے عکرمہ کے طریق پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ قرآن پاک میں لفظ "الیم" جہاں بھی کہیں آیا ہے' اس کا معنی ہے: موجع یعنی دردناک۔

اور ضحاک کے طریق پر ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے' انہوں نے فرمایا: کتاب اللہ میں کلمہ "رجز" ہر جگہ عذاب کے معنی میں آیا ہے۔

سعد بن جبیر' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں' انہوں نے بیان کیا کہ قرآن مجید میں ہر جگہ "تسبیح" سے نماز مراد ہے اور لفظ "سلطان" جہاں بھی آیا ہے' قرآن میں اس سے مراد دلیل وحجت ہے۔

ابن ابی حاتم' عکرمہ کے طریق پر ابن عباس سے روایت کرتے ہیں' انہوں نے بیان فرمایا: "دین" کا لفظ قرآن میں ہر جگہ "حساب" کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

ابن ابی حاتم وغیرہ نے حضرت ابی بن کعب سے روایت کیا ہے' انہوں نے فرمایا کہ قرآن مجید میں "ریح" کا لفظ ہر جگہ عذاب کے معنوں میں آیا ہے۔

ابومالک سے روایت ہے کہ قرآن مجید میں "وراء" کا لفظ ہر جگہ "امام" یعنی آگے اور سامنے کے معنی میں آیا ہے' مگر دو مقام پر یہ لفظ "سِوا" کے معنی میں استعمال ہوا' وہ دو مقام یہ ہیں:

اوّل: "فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ" (المؤمنون: ۷) "اور جو ان دو کے سوا کچھ اور چاہے"۔ "یعنی سِوٰی ذٰلِكَ" دوم: "وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ" (النساء: ۲۴) "اور ان کے سوا جو ہیں وہ تمہیں حلال ہیں"۔ "یعنی سِوٰی ذٰلِكُمْ"۔

ابوبکر بن عیاش بیان کرتے ہیں:

قرآن مجید میں جہاں "كِسْفًا" آیا ہے' اس سے مراد عذاب ہوتا ہے اور جہاں کہیں "كِسَفًا" آیا' اس سے مراد بادل کا ٹکڑا ہے۔

ابن جریر نے ابوورق سے روایت کیا ہے کہ قرآن مجید میں صیغہ "جَعَلَ" بہ معنی "خَلَقَ" استعمال ہوا ہے۔

صحیح بخاری میں سفیان بن عیینہ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جہاں کہیں "مطر" کا نام لیا ہے' اس سے عذاب مراد ہے اور اہل عرب بارش کو "غیث" کہتے ہیں۔

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ نے کہا ہے کہ ایک مقام مذکورہ بالا قاعدہ سے مستثنیٰ ہے کہ وہاں "مطر" سے بارش ہی مراد ہے' وہ مقام یہ ہے: "اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ" (النساء: ۱۰۲) "اگر تمہیں بارش کے سبب تکلیف ہو" کیونکہ اس میں مطر سے مراد بارش ہے۔

ابوعبیدہ نے کہا کہ جہاں پر مطر سے مراد عذاب لیا گیا ہے' وہاں بہ صیغہ "اَمْطَرْتُ" استعمال ہوا ہے اور جہاں اس سے مراد رحمت ہوتی ہے' وہاں "مَطَرْتُ" کے صیغہ کے ساتھ آتا ہے۔

سفیان بن عیینہ سے مروی ہے کہ قرآن مجید میں جس جگہ ''وَمَا يُدْرِيكَ'' (العبس:۳) ''اور تمہیں کیا معلوم'' آیا ہے' وہاں اللہ تعالیٰ نے کوئی خبر نہیں دی ہوتی اور جہاں پر فرمایا: ''وَمَا أَدْرَاكَ'' (المطففین:۸) ''اور تو کیا جانے'' وہاں بتا بھی دیا کہ وہ کیا چیز ہے۔

نوٹ: مذکورہ بالا مسائل میں زیادہ تر مقامات پر بیان کرنے والوں نے کسی لفظ کا معنی بیان کرتے ہوئے ''كُلُّ شَيْءٍ فِي الْقُرْآنِ كَذَا وَكَذَا'' کے قول کے ساتھ بیان کیا ہے تو واضح رہے کہ لفظ ''کل'' سے ان کی مراد ہوتی ہے' اکثر و بیشتر اور غالب طور پر' ورنہ بہت سی جگہوں پر بعض امور مستثنیٰ بھی ضرور ہیں۔

اعراب قرآن کی پہچان

ابوعبید نے اپنی کتاب ''فضائل'' میں امیر المومنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے' انہوں نے فرمایا: ''تَعَلَّمُوا اللَّحْنَ وَالْفَرَائِضَ وَالسُّنَنَ كَمَا تَعَلَّمُونَ الْقُرْآنَ'' ''تم ''لحن'' (لب ولہجہ اور تلفظ کی درستی) فرائض اور سنن کو اسی طرح سیکھو' جس طرح قرآن پاک کو سیکھتے ہو۔

یحییٰ بن عتیق کا بیان ہے کہ میں نے حسن سے کہا: اے ابوسعید! کیا عربی زبان کی تعلیم آدمی محض اس لیے حاصل کرتا ہے کہ اس کے ذریعے اپنا لب ولہجہ خوبصورت بنائے اور قرآن پاک کو صحیح طرح سے پڑھ سکے۔ حسن رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا: اے بھتیجے! تم اس کو ضرور سیکھو کیونکہ اگر ایک شخص کسی آیت کو پڑھتا ہو' مگر اس کی وجہ کے نہ معلوم ہونے سے عاجز رہ جائے تو غلطی میں پڑ کر اس کے ہلاک ہونے کا اندیشہ ہے۔ جو شخص قرآن پاک کا مطالعہ کرتا ہے اور اس کے اسرار کو معلوم کرنا چاہتا ہے' اس پر لازم ہے کہ وہ ہر کلمہ میں نظر و فکر کرے' صیغہ کی شناخت اور اس کے استعمال کا موقع محل جاننے کی کوشش کرے اور یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ یہ مبتداء ہے یا خبر' فاعل ہے یا مفعول ہے کلام ابتدائی ہے یا کسی سابق کلام کا جواب ہے اور اسی طرح کی دیگر باتوں کو معلوم کرنے کی جدوجہد کرے' جو لوگ قرآن مجید کے مفاہیم اور معانی ومطالب جاننا چاہتے ہیں' ان پر حسب ذیل امور کی رعایت رکھنا واجب ہے۔

اوّل: سب سے پہلے تو اس شخص کے لیے جس کلمہ کو وہ مفرد یا مرکب قرار دے کر اعراب دینا

چاہتا ہے' اعراب دینے سے پہلے اس کا معنی سمجھنا ضروری ہے کیونکہ اعراب معنی کی فرع ہے' اسی وجہ سے سورتوں کے فواتح (آغاز کے الفاظ) پر اعراب دینا جائز نہیں کیونکہ ان کے معنی معلوم نہیں اور یہ بات ہم پہلے بیان کر چکے ہیں' ان کا تعلق متشابہات کی اس قسم سے ہے' جس کا حقیقی علم اللہ تعالیٰ نے صرف اپنے لیے مخصوص رکھا ہے۔

ابن ہشام کا قول ہے:

بہت سے معربین (یعنی اعراب دینے والے یا علم اعراب کے عالموں) سے اس لیے لغزش ہوئی کہ انہوں نے اعراب دینے میں محض ظاہر لفظ کی رعایت کی اور معنی کے موجب کا خیال نہیں کیا۔

اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: ''أَصَلَوٰتُكَ تَأْمُرُكَ أَن نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا أَوْ أَن نَّفْعَلَ فِي أَمْوَالِنَا مَا نَشَاءُ'' (هود:۸۷) ''کیا تمہاری نماز تمہیں یہ حکم دیتی ہے کہ اپنے باپ دادا کے خداؤں کو چھوڑ دیں اور اپنے مال میں جو چاہیں کریں'' کہ اس آیت کے الفاظ سے بہ ظاہر ذہن پہلے اسی طرف جاتا ہے کہ ''ان نفعل'' کا عطف ''ان نترك'' ہی پر ہے' حالانکہ یہ بات غلط ہے کیونکہ انہوں (حضرت شعیب علیہ السلام) نے ان لوگوں کو ہرگز یہ ہدایت نہیں کی تھی کہ وہ اپنے اموال میں جو چاہیں کرتے پھریں' بلکہ وہ تو صرف ''ما'' پر عطف ہے' جس کے لحاظ سے وہ ''ترک'' کا معمول ہے اور کلام کے معنی ہیں: ''ان نترك ان نفعل'' یعنی کیا ہم اس بات کو ترک کر دیں کہ اپنے مال کو حسب منشاء صرف کریں؟ مذکورہ بالا وہم کا منشاء اور اس کے پیدا ہونے کا سبب یہ ہے کہ اعراب دینے والا بہ ظاہر ''ان'' اور ''فعل'' کو دو مرتبہ مذکور دیکھتا ہے اور ان کے درمیان حرف عطف بھی پاتا ہے' لہٰذا وہ غلطی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

دوم: مقتضائے صناعت کی رعایت رکھنا بھی ضروری ہے کیونکہ بعض اوقات معرب کسی صحیح وجہ کو ملحوظ رکھنے کے ساتھ صناعت کی صحت پر غور نہیں کرتا اور اس طرح وہ غلطی کا شکار ہو جاتا ہے' اس قسم کی مثالوں میں سے اللہ تعالیٰ کا قول ''وَثَمُودَا فَمَا أَبْقَىٰ'' (النجم:۵۱) ''اور ثمود کو تو کوئی باقی نہ چھوڑا'' ہے کہ بعض علماء نے ''ثمود'' کو مفعول مقدم بتایا ہے' مگر یہ بات ممتنع ہے کیونکہ ''ما'' نافیہ صدارت کلام کو چاہتا ہے' لہٰذا اس کا مابعد اس کے ماقبل میں کوئی عمل نہیں کرتا'

بلکہ یہاں ''ثمود'' کے منصوب ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اپنے ماقبل قول ''وَاَنَّهٗۤ اَهْلَكَ عَادَا ۨالْاُوْلٰى'' (النجم:۵۰) ''اور یہ کہ اس نے پہلے عاد کو ہلاک فرمایا'' کے ''عادا'' پر معطوف ہے یا دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ''ثمود'' فعل مقدر کی بناء پر منصوب ہو تقدیر عبارت یوں ہو گی: ''واھلك ثمود''۔

اسی طرح کسی دوسرے شخص کا قول آیت مبارکہ ''مَلْعُوْنِيْنَ اَيْنَمَا ثُقِفُوْا'' (الاحزاب:۶۱) ''پھٹکارے ہوئے جہاں ملیں پکڑے جائیں'' کے بارے میں کہ ''ملعونین'' ''ثقفوا'' یا ''اخذوا'' فعل کے معمول سے حال واقع ہونے کی بناء پر منصوب ہے لیکن یہ باطل ہے کیونکہ حال کے عامل کے لیے شرط ہے کہ وہ مقدم ہو صحیح بات یہ ہے کہ ''ملعونین'' فعل ذم مقدر کی وجہ سے منصوب ہے۔

سوم: معرب کو دور از کار امور کمزور توجیہات اور لغات شاذہ سے اجتناب کرنا چاہیے اسے چاہیے کہ قریب قوی اور فصیح طریقے پر اعراب کا اخراج کرے البتہ اگر اس پر وجہ بعید کے سوا کوئی وجہ ظاہر ہی نہ ہو تو پھر وہ معذور سمجھا جائے گا۔ اگر تمام وجوہ محتملہ کو بایں ارادہ ذکر کیا جائے کہ اس سے عجیب اور نادر وجوہ کا اظہار ہو گا اور تکثیر کا فائدہ حاصل ہو گا تو یہ سخت مشکل طریقہ ہے۔

یا محتمل وجہ کے بیان کرنے اور طالب العلم کی تربیت اور مشق کے لیے ایسا کیا تو یہ اچھی بات ہے مگر ایسا کرنا قرآن پاک کے علاوہ عبارات میں روا ہے الفاظ قرآن میں یہ جائز نہیں ہے کیونکہ قرآن مجید کو بجز اس وجہ کے جس کا ارادہ ظن غالب کے لحاظ سے پایا جائے کسی دوسری وجہ پر روایت کرنا درست نہیں ہے۔

ہاں! اگر کسی خاص وجہ کا گمان غالب حاصل نہ ہو تو پھر احتمالی وجوہ کو بغیر کسی بناوٹ اور تکلفات کے ذکر کیا جا سکتا ہے۔

چنانچہ اسی وجہ سے جس شخص نے اللہ تعالیٰ کے قول ''فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ'' (البقرۃ:۱۵۸) ''اس پر کوئی گناہ نہیں کہ دونوں کے چکر لگائے'' میں ''جناح'' اور ''علیہ'' پر اغراء قرار دے کر وقف کیا ہے اس کے قول کو غلط قرار دیا گیا ہے اس لیے کہ غائب کا اغراء ضعیف ہے۔

اور جس شخص نے اللہ تعالیٰ کے قول ''تَمَامًا عَلَى الَّذِيْٓ اَحْسَنُ'' (الانعام:۱۵۴) ''پورا احسان کرنے کو اس پر جو نیکوکار ہے'' میں ''احسن'' کو رفع کے ساتھ پڑھنے کی وجہ یہ بتلائی کہ یہ دراصل ''احسنوا'' تھا پھر واؤ کو حذف کر دیا اور اس کے بدلہ میں ضمہ کو (واؤ محذوف پر دلالت کے لیے) کافی سمجھا کہ اشعار میں ایسا جائز ہوتا ہے اس کا قول غلط اور مردود قرار دیا گیا ہے۔

''اَحْسَنُ'' کے مرفوع ہونے کی صحیح وجہ یہ ہے کہ یہ مبتداء محذوف کی خبر ہے تقدیر کلام اس طرح ہے: ''هُوَ اَحْسَنُ''۔

اسی طرح آیت کریمہ ''لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ'' (الاحزاب:۳۳) ''اے نبی کے گھر والو! کہ تم سے ہر ناپاکی کو دور فرما دے'' میں ''اھل'' کو اختصاص کی بناء پر منصوب قرار دینا غلط ہے۔

کیونکہ ضمیر مخاطب کے بعد اختصاص کا آنا ایک امر ضعیف ہے رہا یہ امر کہ پھر اہل کو نصب کس لحاظ سے آیا؟ تو درست بات یہ ہے کہ منادی مضاف ہے۔

چہارم: اعراب دینے والے شخص کو چاہیے کہ ظاہری طور پر لفظ جتنی بھی وجوہ کا احتمال رکھتا ہو وہ ان تمام وجوہ کا احاطہ کرے چنانچہ وہ ''سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى'' (الاعلیٰ:۱) ''اپنے رب کے نام کی تسبیح کرو جو سب سے بلند ہے'' ایسی مثال میں بیان کرے کہ اس میں لفظ ''الاعلی'' لفظ ''اسم'' اور لفظ ''رب'' دونوں کی صفت واقع ہو سکتا ہے۔

اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا قول ''هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ'' (البقرۃ:۳-۲) ''ہدایت ہے پرہیزگاروں کے لیے'' ''اَلَّذِيْنَ'' میں تین صورتیں جائز ہیں: (۱) تابع ہو (۲) مقطوع ہو اور فعل مقدر ''اَعْنِي'' یا ''اَمْدَحُ'' کی وجہ سے منصوب ہو (۳) اسی طرح مبتداء مقدر ''هُوَ'' کی خبر ہونے کی بناء پر مرفوع (محلا) ہو۔

پنجم: مُعرِب پر لازم ہے کہ وہ رسم الخط کی رعایت بھی کرے یہی وجہ ہے کہ جس شخص نے ''سَلْسَبِيْلًا'' کو ''جملہ امریہ'' قرار دیتے ہوئے کہا کہ اس کا معنی ہے: ''سَلْ طَرِيْقًا مُّوْصِلَةً اِلَيْهَا'' ''کوئی ایسا راستہ دریافت کرو جو منزل تک پہنچانے والا ہو'' اس شخص کو خطا کار قرار دیا گیا ہے اور اس کا قول مردود ہے کیونکہ اگر فی الواقع یہی بات ہوتی تو لکھنے میں ''سَلْ سَبِيْلًا''

جدا جدا کر کے لکھا جاتا' موجودہ رسم الخط کو نہ اختیار کیا جاتا اور وہ شخص بھی غلطی پر ہے' جو کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قول ''اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ'' (طٰہٰ:۶۳) ''یہ دونوں جادوگر ہیں'' میں ''ان'' دراصل ''اِنَّ'' ہے اور ''ھا'' ضمیر اس کا اسم ہے یعنی ''اِنَّ الْقِصَّةَ'' قصہ یہ ہے ''ذٰنِ'' مبتداء اور ''لَسٰحِرٰنِ'' اس کی خبر دونوں مل کر پورا جملہ ''اِنَّ'' کی خبر واقع ہے۔ یہ اس لیے باطل ہے کہ ان کو منفصلہ اور ''ھذان'' کو متصلہ لکھا گیا ہے' ورنہ اس شخص کے قول کے مطابق جملہ اس رسم الخط میں نہ لکھا ہوتا۔

اسی طرح ''اَيُّهُمْ اَشَدُّ'' میں ''هُمْ'' اور ''اَشَدُّ'' کو مبتداء اور خبر کہنا اور ''اَيٌّ'' کو مقطوع عن الاضافۃ قرار دینا بھی اسی لیے درست نہیں ہے کہ رسم الخط اس قول کی تردید و تکذیب کر رہا ہے کیونکہ ''اَيُّهُمْ مُتَّصِلَةٌ'' کر کے کتابت شدہ ہے۔

اور آیت کریمہ ''وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ O'' (المطففین:۳) ''اور جب انہیں ماپ تول کر دیں' تو کم کر دیں'' کے متعلق یہ بیان کرنا کہ ''ھم'' اس میں ضمیر رفع اور واؤ جمع کی تاکید ہے' یہ بات بھی غلط ہے' اس لیے کہ اس آیت میں دو مقام پر واؤ کے بعد الف نہیں لکھا گیا' ایسا رسم الخط قول مذکور کی تکذیب کرتا ہے اور درست بات یہ ہے کہ ''ھم'' مفعول واقع ہے۔

ششم: کتاب اللہ میں لفظ زائد کا اطلاق کرنے سے بچنا چاہیے کیونکہ زائد لفظ کا بسا اوقات یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ اس کا کوئی معنی ہی نہیں ہے اور قرآن پاک اس بات سے منزہ ہے۔

اسی بات سے گریز کرتے ہوئے بعض علماء نے قرآن حکیم میں کسی حرف کو زائد کہنے کے بجائے ایسے مواقع پر زائد حرف کی تعبیر تاکید صلہ اور متمم ایسے لفظوں سے فرمائی ہے۔

ابن الخشاب نے کہا ہے کہ قرآن مجید میں لفظ زائد کے اطلاق کے جواز یا عدم جواز کی بابت علماء کا اختلاف ہے۔

جمہور علماء کا قول جواز کا ہے' اس لیے کہ قرآن مجید کا نزول اہل عرب کی زبان' ان کے محاورہ اور بول چال کے مطابق ہوا ہے اور عربی کلام میں حروف کی زیادتی حذف کے مقابلہ میں مسلّم ہے' لہٰذا جس طرح حذف کو اختصار اور تخفیف کی غرض سے جائز خیال کیا جاتا ہے' ویسے ہی زیادتی کو تاکید اور تمہید کے لیے درست اور جائز مانا جائے گا۔

اور بعض لوگوں نے قرآن مجید میں زائد حرف کے جواز کا انکار کیا ہے' وہ یہ کہتے ہیں کہ جن الفاظ کو زائد کہا گیا ہے' وہ بھی کچھ خاص معانی اور فوائد کے لیے آئے ہیں' اس لیے ان پر زائد ہونے کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا۔

ابن الخشاب نے مزید کہا کہ تحقیق یہ ہے کہ اگر حرف کی زیادتی سے کسی ایسے معنی کا ثبوت مقصود ہے' جس کی کوئی حاجت نہیں ہے تو یہ زیادتی باطل ہے کیونکہ ایسی زیادتی عبث اور فضول ہوتی ہے' پس یہ بات طے ہو گئی کہ ہمیں اس زیادتی کی حاجت ضرور ہے' یہ الگ بات ہے کہ تمام اشیاء کی طرف ضرورت ایک جیسی اور برابر نہیں ہوتی' بلکہ مقاصد کے مختلف ہونے سے کم و بیش ہو سکتی ہے' لہٰذا وہ لفظ جس کو یہ لوگ زائد شمار کرتے ہیں' اس کی حاجت تو ہے مگر اتنی نہیں ہے جتنی اس کی ہے' جس پر زیادتی کی گئی ہے۔ یعنی مزید علیہ کی بہ نسبت مزید کم ضروری ہے۔

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

اگر مقتضائے فصاحت و بلاغت کو دیکھا جائے تو اس کے پیش نظر ثابت ہو گا کہ مزید اور مزید علیہ دونوں لفظوں کی ایک جیسی حاجت ہوتی ہے۔

تنبیہ: ابوعبید نے فضائل القرآن میں کہا ہے کہ ہم سے ابومعاویہ نے ہشام ابن عروہ کے واسطہ سے یہ بیان کیا ہے کہ حضرت عروہ نے کہا: میں نے ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اللہ تعالیٰ کے قول ''وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ'' (النساء:۱۶۲) ''اور نماز قائم رکھنے والے اور زکوٰۃ دینے والے'' اور اللہ تعالیٰ کے قول ''اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصَّابِئِيْنَ'' (البقرہ:۶۲) ''بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور جو یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابئین'' کی بابت دریافت کیا کہ ان میں لحن قرآن (لوگوں کو غلطی) کیوں کر واقع ہوئی۔

تو ام المومنین نے فرمایا:

اے بھانجے! یہ کتابت کا معاملہ ہے اور یہ سب کچھ کاتب حضرات کی کارگزاری ہے کہ انہوں نے لکھنے میں غلطی کی ہے' اس حدیث کی اسناد شیخین کی شرط پر صحیح ہے۔

ابوعبید ہی کا قول ہے کہ ہم سے حجاج نے ہارون ابن موسیٰ کے واسطہ سے بیان کیا ہے

کہ مجھے زبیر ابن الحریث نے حضرت عکرمہ کے واسطہ سے خبر دی کہ عکرمہ نے فرمایا:

جس وقت مصاحف کتابت کے بعد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پیش کیے گئے تو حضرت عثمان نے کچھ حروف کی ان میں غلطی پائی' فرمایا: ان میں تبدیلی کی ضرورت نہیں کیونکہ اہل عرب خود ہی ان کو بدل لیں گے اور تصحیح کر لیں گے یا انہوں نے فرمایا کہ عرب اپنی زبانوں سے ان کے اعراب کی اصلاح کر لیں گے۔

اس روایت کو ابن الانباری نے اپنی کتاب ''الرد علی من خالف مصحف عثمان'' میں اور ابن اشتہ نے ''کتاب المصاحف'' میں بھی درج کیا ہے۔

پھر ابن الانباری اسی طرح کی روایت عبدالاعلیٰ ابن عبداللہ ابن عامر کے طریق سے اور ابن اشتہ نے بھی ایسی روایت یحییٰ ابن یعمر کے طریق سے بیان کی ہے۔

ابوعبید' ابوبشر کے طریقے سے سعید ابن جبیر سے روایت کرتے ہیں کہ وہ ''المقیمین الصلوٰۃ'' پڑھتے اور فرماتے تھے کہ ''ھو لحن الکتاب'' یہ کتابت کی غلطی ہے۔

یہ آثار اور اقوال کئی وجہ سے آدمی کو عجیب شش و پنج اور مشکل میں ڈال دیتے ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ بھلا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق کیونکر یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ وہ فصحاء عرب ہو کر روزمرہ گفتگو میں لحن کے مرتکب ہوں گے' چہ جائے کہ قرآن پاک میں۔

دوسرے ان کی نسبت یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ جنہوں نے قرآن کو خود نبی ﷺ سے اس کے نزول کے مطابق سیکھا' اسے یاد رکھا' اس کے ایک ایک شوشہ تک کو بڑی مضبوطی کے ساتھ محفوظ رکھا' اس کی مشق کی اور زبانوں پر جاری کیا' اس میں ان سے تلفظ کی غلطی واقع ہونا بالکل قرین قیاس نہیں ہے' تیسرے یہ کیونکر گمان کر سکتے ہیں کہ وہ پڑھنے اور لکھنے میں اسی لفظی خطا پر سب کے سب قائم رہے۔

چوتھے یہ امر بھی بعید از عقل ہے کہ ان کو اس غلطی پر آگاہی کیوں نہ ہوئی اور پھر انہوں نے اس غلطی سے رجوع کیوں نہ کیا۔ پھر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ گمان کیسے کر سکتے ہیں کہ انہوں نے غلطی پر متنبہ ہو کر بھی اس کو درست کرنے سے منع کر دیا ہو اور اس پر طرہ یہ کہ پھر اسی غلطی پر قراءت کو جاری و ساری رکھا گیا' حالانکہ قرآن سلف سے خلف تک بہ طریق تواتر مروی آ رہا ہے۔

غرضیکہ یہ بات عقل' شرع اور عادت ہر ایک حیثیت سے محال نظر آتی ہے۔

علماء نے اس اشکال کے کئی حل بتائے اور جواب دیئے ہیں۔

اول: یہ کہ اس روایت کی صحت حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہوتی' اس کے اسناد ضعیف' مضطرب اور منقطع ہیں۔

اور پھر سوچنے کی بات یہ ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے لوگوں کے لیے ایک واجب الاقتداء امام (قرآن مجید کا سرکاری نسخہ) تیار کیا تھا' لہٰذا یہ کیسے ہو سکتا تھا' وہ دیدہ دانستہ غلطی کو محض اس وجہ سے باقی رہنے دیتے کہ اہل عرب خود ہی اس کو درست کر لیں گے۔

بہرحال جب ان لوگوں نے جن کو قرآن پاک کی جمع و تدوین کا کام سپرد کیا گیا تھا اور وہ منتخب اور اعلیٰ درجہ کے فصیح اللسان اور ماہر تھے' اس غلطی کی اصلاح نہیں کی اور اسے جوں کا توں رہنے دیا تو اور لوگوں کی کیا مجال تھی کہ وہ اس غلطی کو درست کرتے۔

اور علاوہ ازیں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد میں ایک ہی مصحف تو نہیں لکھا گیا تھا' بلکہ متعدد مصاحف لکھے جانے کے بعد منظر عام پر آئے' پھر اگر یہ کہا جائے کہ ان تمام نسخوں میں لفظی غلطی واقع ہوئی تو عقل اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں کہ تمام کاتبوں نے لکیر کے فقیر بن کر اس غلطی پر اتفاق کر لیا ہو۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ بعض مصاحف میں غلطی رہ گئی تھی' تمام میں یہ نقص نہ تھا تو اس دوسرے مصاحف کی صحت و درستی کا اعتراف پایا جاتا ہے حالانکہ ایسا قول کسی سے منقول نہیں ہوا کہ غلطی کسی ایک مصحف میں تھی اور دوسرے مصاحف میں نہ تھی بلکہ مصاحف میں تو سوائے وجوہ قراءت کے اختلاف کے اور کوئی اختلاف کبھی آیا ہی نہیں اور یہ بات سب کو معلوم ہے کہ وجوہ قراءت کا اختلاف کسی کے نزدیک بھی لحن اور لفظی غلطی شمار نہیں ہوتا۔

اور سب سے عمدہ اور خوبصورت جواب یہ ہے کہ سابق کے تمام وہ آثار اور اقوال جو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے روایت کئے گئے ہیں' ان میں تحریف کی گئی ہے یعنی بیان کرنے والوں سے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے الفاظ من و عن بیان نہیں ہو سکے' جس طرح انہوں نے ادا کیے' لہٰذا مذکورہ اشکال لازم آ گیا۔

اس بات کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے' جس کو ابن اشتہ نے سوار ابن سبشہ سے

روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ حضرت ابن الزبیر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:

ایک شخص نے حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے عرض کیا: اے امیر المومنین! بے شک لوگوں میں قرآن مجید کے بارے میں بہت اختلاف پیدا ہوگیا ہے' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر ارادہ کیا تھا کہ وہ قرآن کو ایک ہی قراءت پر جمع کردیں گے' مگر اسی دوران میں ان کے خنجر کا زخم آگیا اور اس سے آپ کا وصال ہوگیا اور یہ کام ادھورا رہ گیا۔

اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد جب عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا دور خلافت آیا تو اسی شخص نے (جس نے خلیفہ دوم کو قرآن پاک کا اختلاف ختم کرنے کے لیے عرض کیا تھا) حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے بھی اس امر کی یاد دہانی کرائی' چنانچہ آپ نے تمام مصاحف کو جمع کیا اور مجھے (ابن زبیر کو) ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت اقدس میں بھیجا' چنانچہ میں ان کے پاس سے مصحف لے کر آیا اور ہم نے دوسرے تمام مصاحف کا ام المومنین کے مصحف کے ساتھ مقابلہ کیا اور اس کے مطابق درست کر کے ایک صحیح مصحف تیار کرلیا تو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ تمام دوسرے مصاحف جو اس کے علاوہ ہیں' سب پھاڑ ڈالو چنانچہ اس حکم پر عمل کرتے ہوئے تمام مصاحف پھاڑ دیئے گئے۔

پھر ابن اشتہ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے' وہ بیان کرتے ہیں:

جب مصحف کی تیاری سے فراغت ہوگئی تو اسے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو انہوں نے دیکھنے کے بعد فرمایا: ''اَحْسَنْتُمْ وَاَجْمَلْتُمْ'' تم نے بہت اچھا اور عمدہ کام کیا ہے' میں اس میں کچھ چیزیں دیکھتا ہوں کہ قابل اصلاح ہیں' جس کو ہم اپنی زبانوں کے ساتھ درست کرلیں گے۔

فائدہ

ان حروف کا بیان جو تین وجوہ سے پڑھے گئے ہیں۔

اعراب' بناء یا اس کی مانند کسی تیسری وجہ سے اس کی قراءت کی گئی ہے۔

اس موضوع پر احمد بن یوسف بن مالک الرعینی کی ایک نہایت عمدہ تالیف ہے' اس

کتاب کا نام ''تُحْفَةُ الْاَقْرَانِ فِيْمَا قُرِئَ بِالتَّثْلِيْثِ مِنْ حُرُوْفِ الْقُرْاٰنِ'' ہے۔

مثالیں

''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' (الفاتحہ:۱) ''سب خوبیاں اللہ کو'' میں ''حمد'' کے دال کو ابتداء (مبتداء ہونے) کے لحاظ سے رفع' مصدر (مفعول مطلق) کی بناء پر نصب دیا جاتا ہے اور ''للّٰہ'' کے لام کی حرکت کی اتباع میں دال کے کسرہ کے ساتھ بھی قراءت کی جاتی ہے۔

''رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ'' (الفاتحہ:۱) ''مالک سارے جہان والوں کا'' لفظ ''رب'' کو اسم جلالت ''اللّٰہ'' کی صفت قرار دے کر مجرور پڑھ سکتے ہیں اور اس سے قطع کرتے ہوئے مبتداء مقدر کی خبر مان لیں تو مرفوع اور فعل مقدر کا معمول یا منادی قرار دے کر نصب بھی آسکتا ہے۔

''الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' ان دونوں لفظوں کی قراءت تینوں وجوہ اعراب سے کی گئی ہے۔

''اِثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا'' (البقرہ:۶۰) ''بارہ چشمے'': ''ش'' کے سکون کے ساتھ اور یہ تمیم کی لغت ہے' اس کے کسرہ کے ساتھ اور یہ حجاز کی لغت ہے اور ''ش'' کے فتحہ کے ساتھ جو کہ قبیلہ ''بلی'' کی لغت ہے۔

''بین المرء'' میں میم کو تین حرکتوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے' اس میں اتنی ہی لغات آتی ہیں۔

''ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ'' (آل عمران:۳۴) ''یہ ایک نسل ہے ایک دوسرے سے'' ذال کو تینوں حرکتوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔

''وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ'' (النساء:۱) ''اللہ سے ڈرو جس کے نام پر مانگتے ہو اور رشتوں کا لحاظ رکھو'' میں ''الارحام'' کی میم کو اسم جلالت ''اللّٰہ'' پر عطف کی وجہ سے منصوب پڑھا گیا ہے اور ''بہ'' کی ضمیر پر عطف ڈال کر مجرور قراءت بھی آئی ہے اور مبتداء قرار دے کر مرفوع بھی پڑھا گیا ہے اور اس کی خبر محذوف مانی گئی ہے۔ یعنی ''والارحام مما یجب ان تتقوہ وان تحتاطوا لانفسکم فیہ'' ارحام بھی ان چیزوں میں سے ہیں' جن کے حق میں خدا ترسی اور اپنے آپ کو محتاط بنانا واجب ہے۔

''لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ'' (النساء:۹۵) ''برابر نہیں وہ مسلمان کہ بے عذر جہاد سے بیٹھ رہیں'' میں ''غیر'' کو ''القاعدون'' کی صفت بنا

کر مرفوع اور ''المومنین'' کی صفت بنا کر مجرور اور استثناء کی بناء پر منصوب پڑھا گیا ہے۔

''وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ'' (المائدہ:٦) ''اور اپنے منہ اور ہاتھوں کا مسح کرو'' میں ''وارجلکم'' کے لام کو ''ایدی'' پر عطف کے لحاظ سے نصب اور جوار وغیرہ کی وجہ سے جر اور مبتداء ہونے کی وجہ سے رفع کے ساتھ پڑھا گیا ہے' مبتداء کی صورت میں اس کی خبر محذوف مانی جائے گی' جس پر قرینہ اس کا ماقبل ہے۔

محکم اور متشابہ

ارشاد ربانی ہے:

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ. (آل عمران:٧)

وہی ہے جس نے آپ پر یہ کتاب اتاری' اس کی کچھ آیتیں محکم ہیں (جن کے معنی صاف اور واضح ہیں) وہ کتاب کی اصل ہیں اور دوسری متشابہ ہیں (جن کے معنی میں اشتباہ ہے)۔

قرآن محکم ہے یا متشابہ؟

ابن حبیب نیشاپوری نے اس مسئلہ میں تین قول ذکر کیے ہیں:

اوّل: تمام قرآن محکم ہے' جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ'' (ھود:١) ''یہ ایک کتاب ہے جس کی آیتیں محکم ہیں''۔

دوم: سارا قرآن متشابہ ہے' اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: ''كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ'' (الزمر:٢٣) ''ایسی کتاب کہ اوّل سے آخر تک ایک سی ہے'' (اور متشابہ ہے)۔

سوم: تیسرا اور صحیح قول یہی ہے کہ قرآن کی تقسیم محکم اور متشابہ ان دو قسموں کی طرف کی جاتی ہے' اس کی دلیل مذکورۃ الصدر آیت کریمہ ہے اور اوّل اور دوم قول میں بہ طور دلیل جن دو آیتوں کو پیش کیا گیا ہے' ان کا جواب یہ ہے کہ قرآن پاک کے محکم ہونے کا یہ مطلب ہے' وہ اتنا پختہ کلام ہے کہ اس پر نہ کوئی نقض وارد ہوسکتا ہے اور نہ ہی اس میں اختلاف راہ پاسکتا ہے۔

اور دوسری آیت کریمہ میں جو قرآن کریم کو متشابہ کہا ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ قرآن پاک کی آیات حق وصداقت اور اعجاز میں باہم ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں اور مشابہ ہیں۔

محکم اور متشابہ کی تعیین میں مختلف اقوال ہیں:

(١) محکم وہ کلام ہے' جس کی مراد اپنے ظہور کی بناء پر یا تاویل کے ذریعے معلوم ہو جائے اور متشابہ اس کلام کو کہیں گے' جس کا علمِ حقیقی اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے مخصوص کیا ہے۔ مثلاً قیامت کے واقع ہونے کا وقت' دجال کا خروج اور سورتوں کے اوائل میں حروف مقطعات' ان تمام امور کا ذاتی طور پر علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔

(٢) محکم وہ کلام ہے' جس کے معنی واضح ہوں اور جو اس کے برعکس ہے' اس کو متشابہ کہتے ہیں۔

(٣) جس کلام میں صرف ایک ہی وجہ پر تاویل کا احتمال ہو' وہ محکم ہے اور جس میں کئی وجوہ سے تاویل ہو سکے' وہ متشابہ کہلاتا ہے۔

(٤) محکم وہ کلام ہے کہ عقل جس کے معنی کا ادراک کر سکے اور متشابہ اس کے برعکس ہے' مثلاً نمازوں کی تعداد اور روزوں کا ماہ رمضان مبارک کے ساتھ ہی خاص ہونا اور شعبان میں نہ ہونا' یہ ماوردی رحمۃ اللہ کا قول ہے۔

(٥) محکم وہ ہے' جو مستقل بنفسہٖ ہو' اور متشابہ وہ ہے جو مستقل بنفسہٖ نہ ہو اور اپنے معنی پر دلالت کرنے میں غیر کا محتاج ہو۔

(٦) محکم وہ ہے جس کی تاویل خود اس کی تنزیل ہے اور متشابہ وہ ہے جو تاویل کے بغیر سمجھ میں نہ آئے۔

(٧) محکم وہ ہے جس کے الفاظ میں تکرار نہ آئی ہو اور متشابہ اس کے برعکس ہے۔

(٨) محکم عبارت ہے فرائض' وعد اور وعید سے اور متشابہ سے مراد قصص اور امثال ہیں۔

(٩) ابن ابی حاتم نے علی ابن ابی طلحہ کے طریق سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ

محکمات' قرآن مجید کے ناسخ' حلال' حرام' حدود' فرائض اور ان امور کا نام ہے' جن پر ایمان لایا جاتا ہے اور جن پر عمل کیا جاتا ہے اور متشابہات' قرآن کے منسوخ' مقدم

موخر' امثال' اقسام اور ان چیزوں کو کہتے ہیں جن پر ایمان تو لایا جاتا ہے مگر عمل نہیں کیا جاتا۔

(۱۰) عبد ابن حمید نے ضحاک سے روایت کی ہے' وہ بیان کرتے ہیں:

محکمات وہ (آیات) ہیں' جو قرآن پاک میں سے منسوخ نہیں ہوئیں' اور متشابہ وہ ہیں جو منسوخ کر دی گئی ہیں۔

(۱۱) ابن ابی حاتم مقاتل ابن حبان سے روایت کرتے ہیں' انہوں نے بیان کیا ہے: ہمیں جو بات پہنچی ہے اس کے مطابق متشابہات ''الم' المص' المر'' اور ''الر'' ہیں۔

(۱۲) ابن ابی حاتم نے کہا کہ عکرمہ' حضرت قتادہ اور دیگر محدثین سے مروی ہے کہ محکم وہ کلام ہے جس پر عمل کیا جاتا ہے اور متشابہ وہ حصہ قرآن ہے' جس پر ایمان تو لایا جاتا ہے' مگر وہ معمول بہا نہیں ہے۔

فصل

یہ امر بھی مختلف فیہ ہے کہ قرآن پاک کے متشابہات کے علم پر مطلع ہونا ممکن ہے؟ یا اللہ تعالیٰ کے سوا اس کا علم کسی کو نہیں ہے؟

ان ہر دو اقوال کا منشاء دراصل ایک اور اختلاف پر مبنی ہے' جو اللہ تعالیٰ کے قول ''وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ'' (آل عمران: ۷) ''اور پختہ علم والے'' کے بارے میں واقع ہوا ہے' کیونکہ اس آیت مبارکہ کی ترکیب نحوی میں دو مختلف خیال پائے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ ''وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ'' ''یقولون'' اس کا حال واقع ہوا ہے اور دوسرا خیال یہ ہے کہ ''وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ'' مبتداء ہے اور ''یقولون'' اس کی خبر اور ''والراسخون'' میں جو واؤ ہے جو استینافیہ ہے' واؤ عاطفہ نہیں۔

پہلی رائے گنتی کے چند علماء کی ہے' جن میں سے ایک مجاہد بھی ہیں اور یہ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

چنانچہ ابن المنذر' مجاہد کے طریق سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے آیت کریمہ ''وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ'' (آل عمران: ۷) ''اور ان کی اصل مراد اللہ

کے سوا کوئی نہیں جانتا اور جو لوگ علم میں پختہ ہیں'' کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ ''اَنَا مِمَّنْ یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗ'' یعنی میں ان لوگوں میں سے ہوں جن کو متشابہات قرآن کی تاویل کا علم ہے۔

مگر صحابہ کرام' تابعین' تبع تابعین' ان کے بعد والے علماء مفسرین خصوصاً اہل سنت میں بہ کثرت علماء دوسرے قول کی طرف گئے ہیں اور یہ دوسرا قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول اقوال میں سے سب سے زیادہ صحیح ہے۔

علامہ حافظ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

جمہور علماء کے مذہب کی صحت پر وہ روایت بھی دلالت کرتی ہے' جس کو عبدالرزاق نے اپنی تفسیر میں اور حاکم نے اپنی مستدرک میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ وہ یوں قراءت کرتے تھے:

وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ

اور جو لوگ علم میں پختہ ہیں' وہ کہتے ہیں: ہم اس پر ایمان لائے۔

(آل عمران: ۷)

اور ان کی اصل مراد اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ پس یہ قراءت دلالت کرتی ہے کہ واؤ استینافیہ ہے' اگرچہ اس روایت کا قراءت ہونا ثابت نہیں ہوا' لیکن پھر بھی کم از کم اس کو یہ درجہ تو حاصل ہے کہ یہ صحیح اسناد کے ساتھ ترجمان القرآن (حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما) سے مروی ہے اور ان کا قول ہے' بہر حال ان کا قول دوسروں کے اقوال پر مقدم ہوگا۔

پھر اس کی تائید یوں بھی ہوتی ہے کہ خود آیت مبارکہ نے متشابہات کے پیچھے پڑنے والوں کی مذمت کی ہے اور ان کو کج رو اور فتنہ پرداز کے وصف سے موصوف گردانا ہے اور دوسری طرف جن لوگوں نے متشابہ کا علم اللہ تعالیٰ کی طرف تفویض کیا ہے اور اس کو بطیب خاطر' بسر و چشم تسلیم کیا ہے' ان کی اس طرح تعریف فرمائی ہے' جیسے غیب پر ایمان لانے والوں کی ستائش کی ہے اور امام فراء بیان کرتے ہیں کہ:

بے شک ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی قراءت بھی ''ویقول الراسخون'' ابن ابی داؤد ''المصاحف'' میں اعمش کے طریق سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ حضرت عبداللہ

بن مسعود رضی اللہ عنہما کی قراءت میں اس طرح ہے:'' وان تاویلہ الا عند اللہ والراسخون فی العلم یقولون امنا بہ''۔

امام بخاری‘ مسلم اور دوسرے محدثین نے ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے‘ وہ بیان فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت کریمہ'' ہُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ '' تا'' اُولُوا الْاَلْبَابِ'' (آل عمران:۷) تک تلاوت فرمائی۔ ام المومنین بیان کرتی ہیں کہ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے:'' فَاِذَا رَاَیْتَ الَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَہَ مِنْہُ فَاُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ سَمَّی اللّٰہُ فَاحْذَرْہُمْ ''یعنی پس جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو قرآن مجید کے متشابہات کے پیچھے پڑے رہتے ہیں تو (یاد رکھو) یہی وہ لوگ ہیں‘ جن کا نام اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں لیا ہے‘ ان لوگوں سے بچنا۔

طبرانی‘ الکبیر میں ابو مالک اشعری سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بیان فرماتے سنا کہ مجھے اپنی امت میں تین عادتوں کے پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے‘ ایک تو یہ کہ ان کے پاس مال کی کثرت کا ہو جانا اور اس کی وجہ سے آپس میں حسد کرنا اور ایک دوسرے کو قتل کرنا اور دوسرے یہ کہ'' وان یفتح لھم الکتاب '' تو مومن اس کو لے کر اس کی تاویل کرنے لگے‘ حالانکہ اللہ تعالیٰ کے سوا اس کی تاویل کو کوئی نہیں جانتا۔ (الحدیث)

امام دارمی نے اپنی مسند میں سلیمان بن یسار سے روایت کی ہے کہ صبیغ نامی ایک مرد مدینہ منورہ آیا اور اس نے قرآن کے متشابہ کے بارے میں سوالات کرنا شروع دیئے‘ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو پتا چلا تو آپ نے اس شخص کو بلا بھیجا اور آپ نے اس کو سزا دینے کے لیے کھجور کی خشک شاخیں منگوا کر رکھیں تھیں (جب وہ حاضر ہوا) تو آپ نے دریافت فرمایا: تو کون ہوتا ہے؟ اس شخص نے کہا کہ میں عبد اللہ بن صبیغ ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کھجور کی ایک شاخ اٹھا کر اس کے سر پر ماری‘ جس سے اس کا سر لہولہان ہو گیا۔ اسی راوی سے دوسری روایت میں اس طرح منقول ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو کھجور کی شاخ سے مارا‘ حتیٰ کہ اس کی پشت کو زخمی کر کے چھوڑا اور جب وہ ٹھیک ہو گیا تو دوبارہ اسی طرح سزا دی اور جب اس دفعہ بھی اس کی چوٹیں صحیح ہو گئیں تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس کو تیسری بار سزا دینا چاہی تو وہ شخص کہنے لگا:

اگر تم مجھے جان سے ہی ختم کرنا چاہتے ہو تو اچھے طریقے سے مار دو‘ اس روز روز کے سیاپے سے تو جان چھوٹے۔ یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے حکم دیا کہ اپنے وطن واپس چلا جائے۔

اور ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ اس شخص (صبیغ) کی مجلس میں کوئی مسلمان ہرگز نہ بیٹھے۔

غرضیکہ ان تمام احادیث اور آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ متشابہ قرآن کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے‘ اس کے سوا اسے (از خود) کوئی نہیں جان سکتا اور اس میں غور وخوض کرنا اچھا وطیرہ نہیں ہے۔

متشابہات کی حکمت

جب متشابہ کی معرفت سے انسان کو عاجز رکھا گیا ہے‘ پھر اس کو قرآن مجید میں نازل کرنے کی حکمت کیا ہے؟

متشابہ کے علم سے عجز کے باوجود قرآن پاک میں اس کو اتارنے کی حکمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بعض علماء نے لکھا ہے:

متشابہ کے حق ہونے کا اعتقاد رکھنے پر عقل انسانی کو اسی طرح آزمائش میں ڈالا گیا ہے‘ جس طرح کہ بدن کو ادائے عبادت کی آزمائش اور امتحان میں مبتلا کیا گیا ہے۔ اس کی مثال اس طرح ہے کہ ایک حکیم (دانش مند) جس وقت کوئی کتاب تصنیف کرتا ہے تو بسا اوقات اس میں کچھ مقام مجمل رہنے دیتا ہے تا کہ وہ مقام طالب علم اور شاگرد کے لیے اپنے استاذ کے سامنے عاجز ومغلوب رہنے اور اس کے ادب واحترام کا سبب بنے‘ یا مثلاً جیسے بادشاہ کوئی خاص علامت اختیار کرتا ہے اور اس کے ساتھ اپنے معتمد علیہ اور خاص رازدار کو ہی مطلع کرتا ہے‘ ہر کس وناکس کو اس سے آگاہ نہیں کرتا ہے اور اس سے مقصود ان لوگوں کو اعزاز وشرف بخشنا ہوتا ہے کہ یہ اس راز کو جاننے کی وجہ سے دوسروں سے ممتاز ہیں۔

کہا گیا ہے کہ اگر عقل جو سارے جسم میں معزز ترین ہے‘ کو ابتلاء وامتحان میں نہ ڈالا جاتا‘ عالم شخص کبھی بھی تکبر وغرور اور نخوت وسرکشی سے باز نہ آتا‘ پس اسی بے بسی کی وجہ سے تو وہ اللہ رب العزت کی بارگاہ جلال میں سر جھکاتا ہے‘ متشابہ قرآن ہی وہ مقام ہے جہاں عقلوں

کو اپنے قصور کم مائیگی کا اعتراف کرتے ہوئے باری تعالیٰ کے حضور سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے اور وہ جھکتی اور سرنگوں ہوتی ہیں۔

پھر آیت کے خاتمہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے قول ''وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ'' (آل عمران:۷) ''اور نصیحت نہیں مانتے مگر عقل والے'' کے ساتھ کجرووں گمراہوں کی برائی کی ہے ''راسخون فی العلم'' کی تعریف بیان فرمائی ہے۔ یعنی جو لوگ نصیحت نہیں پکڑتے اور ان کے دلوں میں ڈر خوف نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ نفس کی خواہشاتِ بے جا کی مخالفت کرتے ہیں' وہ عقل والے نہیں ہیں۔

اور اسی وجہ سے مضبوط علم والے بارگاہ ایزدی میں یوں دست بدعا رہتے ہیں کہ ''رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا'' (آل عمران:۸) ''اے رب! ہمارے دل ٹیڑھے نہ کر'' آیت اور ''وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ'' (آل عمران:۷) ''اور پختہ علم والے'' اپنے خالق کے ساتھ ''علم لدنی'' کے نزول کی استدعا کرتے ہیں اور نفسانی کجروی اور گمراہی سے اس کی پناہ میں رہنے کی دعا مانگتے ہیں۔

جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ متشابہ قرآن میں خواہ مخواہ غور وخوض کرنا اچھا نہیں ہے تو پھر متشابہ کی تعریف اور اس کی تعیین سے واقفیت ضروری ہے' کیونکہ بہتر یہی ہے کہ جس چیز کو شارع نے پسند نہیں فرمایا' اس کا انسان کو علم ہو' تاکہ اس سے بچ سکے۔

علامہ خطابی بیان کرتے ہیں:

متشابہ کی دو قسمیں ہیں' پہلی قسم یہ ہے کہ اگر اس کو محکم کے ساتھ ملا کر اور اس کی طرف راجع کر کے دیکھا جائے تو اس کا معنی معلوم ہو جائے اور دوسری قسم وہ ہے جس کی حقیقت کے معلوم ہونے کی کوئی سبیل نہیں ہے' اس قسم کے متشابہ کی پیروی کرنا کجرو اور ٹیڑھے دل و دماغ والوں کا شیوہ رہا ہے کہ وہ اس کی تاویل کی ٹوہ اور کھوج میں لگے رہتے ہیں اور اس کی تہ تک رسائی حاصل نہ کر سکنے کی وجہ سے شک و ارتیاب میں مبتلا ہو کر فتنہ کی دلدل میں پھنس جاتے ہیں۔

فصل

متشابہ کی قسم میں سے آیات صفات ہیں۔

ابن اللبان نے اس موضوع پر الگ ایک مستقل کتاب تصنیف کی ہے۔

آیات صفات کی مثالیں یہ ہیں:

(۱) اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى O (طٰہٰ:۵) — رحمٰن نے عرش پر استویٰ فرمایا۔

(۲) كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ. (القصص:۸۸) — ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے اس کی ذات کے سوا۔

(۳) وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ. (الرحمٰن:۲۷) — اور باقی ہے آپ کے رب کی ذات۔

(۴) وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ. (طٰہٰ:۳۹) — اور تاکہ ہماری نگرانی میں آپ کی پرورش کی جائے۔

(۵) يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ. (الفتح:۱۰) — ان کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ ہے۔

(۶) وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌ بِيَمِيْنِهٖ. (۳۹۔۶۷) — اور سب آسمان اسی کے دائیں دست قدرت سے لپیٹے ہوئے ہوں گے۔

جمہور اہل سنت جن میں سلف صالحین بھی ہیں اور تمام محدثین اس امر پر متفق ہیں کہ ان آیتوں پر ایمان رکھنا فرض ہے اور ان سے جو بھی معنی مراد ہے' وہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دینا چاہیے' ہم باوجودیکہ ان آیات کے ظاہری معانی سے اللہ تعالیٰ کو پاک اور منزہ مانتے ہیں' پھر بھی ان کی تفسیر نہیں کرتے۔

اہل سنت کے ایک گروہ کا مذہب یہ ہے کہ ہم متشابہات کی تاویل ایسے امور کے ساتھ کرتے ہیں' جو اللہ تعالیٰ کے جلال اور عظمت کے شایان شان ہے اور یہ خلف کا مذہب ہے۔ امام الحرمین بھی پہلے یہی مذہب رکھتے تھے' بعد میں اس سے رجوع کر لیا اور سلف کا مذہب اختیار کر لیا' چنانچہ وہ ''الرسالۃ النظامیہ'' میں لکھتے ہیں:

جس چیز کو دین بنانے پر ہم راضی ہیں اور جس چیز کے ساتھ ہم اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا عہد و پیمان باندھتے ہیں' وہ اسلاف کی اتباع ہے اور اسلاف کا طریقہ یہ رہا ہے کہ وہ آیات صفات کے معانی بیان کرنے کے درپے نہیں ہوئے۔

ابن الصلاح لکھتے ہیں:

اسلاف امت اور پیشوایان ملت نے یہی مذہب اختیار کیا' جلیل القدر ائمہ فقہاء اور

عظیم المرتبت محدثین نے بھی اسی طریق کو پسند کیا اور متکلمین میں سے کسی نے بھی اس کا انکار نہیں کیا۔

ابن دقیق العید نے افراط وتفریط کو چھوڑ کر درمیانی راہ اختیار کی ہے وہ کہتے ہیں:

اگر تاویل ایسی کی جو اہل عرب کی زبان سے قریب ہے اور اس کو منکر نہیں ٹھہرایا گیا یا وہ تاویل بعید ہے بہرصورت ہم توقف کریں گے اور اگر روایت مل گئی تو اس کے معنی پر اسی طریق سے ایمان لائیں گے جس کا اس لفظ سے ارادہ کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی تنزیہ باری تعالیٰ کا بھی ضرور لحاظ رکھیں گے۔

اور اگر ایسے الفاظ کے معانی اہل عرب کے طرز تخاطب اور عام بول چال کے لحاظ سے ظاہر اور معلوم ہوں گے تو ہم ان کو بغیر کسی توقیف کے تسلیم کرلیں گے اور ان کے قائل ہو جائیں گے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے قول "يَا حَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْبِ اللّٰهِ" (الزمر:۵۶) "ہائے افسوس! ان تقصیروں میں جو میں نے اللہ کے بارے میں کیں" میں لفظ "جنب" کو ہم اس معنی پر محمول کرتے ہیں کہ اس سے مراد ہے: اللہ تعالیٰ کا حق اور جو چیزیں اس کی طرف سے واجب ہیں۔

متشابہ کی دوسری قسم سورتوں کے اوائل ہیں (یعنی حروف مقطعات) ان کے بارے میں بھی مختار مذہب یہ ہے کہ وہ ایسے اسرار ہیں جن کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔

چنانچہ ابن المنذر اور دیگر محدثین نے شعبی سے روایت بیان کی ہے کہ ان سے سورتوں کے فواتح کی بابت دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا: ہر کتاب کا کوئی راز ہوتا ہے اور قرآن حکیم کا راز سورتوں کے فواتح ہیں۔

بعض مفسرین نے سورتوں کے فواتح کے معانی میں غور وخوض بھی کیا ہے چنانچہ ابن ابی حاتم اور دیگر محدثین نے ابو الضحیٰ کے طریق سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اللہ تعالیٰ کے قول "الم" کے متعلق روایت کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا ہے کہ اس کا معنی ہے: "انا اللہ اعلم" یعنی میں اللہ ہوں خوب جانتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کے قول "المص" کے بارے میں کہا: "انا اللہ افصل" "میں اللہ ہوں فیصلہ کرتا ہوں اور قول باری تعالیٰ "الر" کے متعلق بیان کیا کہ "انا اللہ اری" "میں اللہ ہوں دیکھتا ہوں۔

قرآن کے مقدم اور مؤخر مقامات

قرآن مجید کی جن آیات میں کلام کے اندر تقدیم وتاخیر واقع ہوئی ہے ان کی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم وہ ہے جس کے معنی میں ظاہر کے اعتبار سے اشکال واقع ہوتا ہے لیکن جب معلوم ہو جائے کہ یہ تقدیم وتاخیر کے باب سے ہے تو اس کا معنی واضح ہو جاتا ہے۔ یہ قسم اس قابل ہے کہ اس کے متعلق الگ ایک کتاب لکھی جائے اور سلف نے بھی کچھ آیات میں اس کا ذکر کیا ہے۔

چنانچہ ابن ابی حاتم نے اللہ تعالیٰ کے اس قول "وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَاَوْلَادُهُمْ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا" (التوبہ:۸۵) "اور ان کے مال اور اولاد پر تعجب نہ کرنا اللہ ہی چاہتا ہے کہ اسے دنیا میں ان پر وبال کرے" کے متعلق بیان کیا ہے کہ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ آیت تقدیم کلام کی قسم سے ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَاَوْلَادُهُمْ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ" "بِهَا اَیْ فِي الْاٰخِرَةِ" (التوبہ:۸۵) "یعنی آخرت میں"۔

قتادہ ہی سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قول "لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّاَجَلٌ مُّسَمًّى" (طٰہٰ:۱۲۹) "اور اگر تمہارے رب کی ایک بات نہ گزر چکی ہوتی تو ضرور عذاب انہیں لپٹ جاتا اور اگر نہ ہوتا ایک وعدہ ٹھہرا ہوا" میں بھی تقدیم وتاخیر کلام ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "لو لا كلمة واجل مسمى لكان لزاما"۔

اور مجاہد سے روایت ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے قول "اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۝ قَيِّمًا" (الکہف:۲۔۱) "(اللہ نے) اپنے بندے پر کتاب اتاری اور اس میں اصلاً کجی نہ رکھی ۝ عدل والی کتاب" کے بارے میں فرمایا: یہ بھی تقدیم وتاخیر کے باب سے ہے۔ اصل میں یوں ہے: "اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ قَيِّمًا وَّلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا" اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قول "اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ" (آل عمران:۵۵) "میں تجھے پوری عمر تک پہنچاؤں گا اور تجھے اپنی طرف اٹھاؤں گا" میں

بھی تقدیم وتاخیر واقع ہے۔ اور بیان کیا کہ تقدیر عبارت یوں ہے: ''رَافِعُكَ اِلَیَّ وَمُتَوَفِّيْكَ''۔

حضرت عکرمہ بیان کرتے ہیں:

آیت کریمہ ''لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ'' (ص:۲۶) ''ان کے لیے سخت عذاب ہے اس پر کہ وہ حساب کے دن کو بھول بیٹھے'' میں بھی تقدیم وتاخیر واقع ہے' تقدیر عبارت اس طرح ہے: ''لَهُمْ يَوْمَ الْحِسَابِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ بِمَا نَسُوْا'' ابن جریر ابن زید سے روایت کرتے ہیں کہ آیت ''وَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَا تَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًاO'' (النساء:۸۳) ''اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو ضرور تم شیطان کے پیچھے لگ جاتے'' بھی اسی قبیل سے ہے' اس میں تقدیم وتاخیر کی صورت اس طرح ہے: ''اذاعوا به الا قليلا منهم ولو لا فضل الله عليكم ورحمته لم ينج قليل ولا كثير''۔

پھر اسی راوی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اللہ تعالیٰ کے قول ''فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً'' (النساء:۱۵۳) ''بولے: ہمیں اللہ کو اعلانیہ دکھادو'' کے بارے میں نقل کیا ہے کہ ان لوگوں (بنی اسرائیل) نے جب اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کا کہا تھا تو ''جهرة'' دیکھنے کو کہا تھا یعنی ان کا سوال ''جهرة'' دیکھنے کے بارے میں تھا' تقدیر عبارت یوں ہے: ''قالوا جهرة ارنا الله'' تو اس آیت میں بھی تقدیم وتاخیر واقع ہے' ابن جریر نے کہا کہ ان کا سوال شور وغل کے ساتھ تھا۔

اور اسی قبیل سے ہے' اللہ تعالیٰ کا یہ قول ''اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ'' (الجاثیہ:۲۳) ''بھلا دیکھو تو وہ جس نے اپنی خواہش کو اپنا خدا ٹھہرالیا'' کہ اس کی اصل ''هواه الهه'' ہے یعنی جس شخص نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا معبود بنالیا ہے' اس لیے کہ جو شخص اپنے معبود ہی کو اپنا دلی خواہش بنائے تو اس کا یہ عمل قابل مذمت نہیں ہے' مگر اس آیت کریمہ میں مفعول ثانی ''اِلٰهَهٗ'' مقدم کردیا گیا ہے کیونکہ اس کی طرف خاص توجہ دلانا مقصود تھی اور ارشادِ باری تعالیٰ ''وَالَّذِيْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰىO فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰىO'' (الاعلیٰ:۵۔۴) ''اور جس نے چارا نکالاO پھر اسے خشک سیاہ کردیاO'' پس ''غثاء'' کا معنی ہے: خشک بھوسا اور ''احوى'' کا اطلاق سبز مائل بہ سیاہی پر ہوتا ہے اور وہ خشک بھوسا تو بعد کو ہوتا ہے' پہلے سبز اور ہرا ہوگا۔ لہٰذا

سیاق عبارت اور اصل تقدیر یوں ہوگی: ''اخرج المرعى اخضر شديد الخضرة فجعله جانا هشيما'' اور اس میں تقدیم وتاخیر یوں ہوئی ہے کہ رعایت فاصلہ (آیت کے آخر کی موافقت) کے لیے مرعیٰ کی صفت ''احوى'' کو مؤخر کردیا اور ''غثاء'' کو مقدم کردیا گیا ہے۔

اور آیت کریمہ ''وغرابيب سود'' کہ اصل سود غرابیب ہے' کیونکہ غربیب کا معنی سیاہ فام ہے اور ارشادِ باری تعالیٰ ''فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا'' (ھود:۷۱) ''وہ ہنسنے لگی تو ہم نے اسے خوش خبری دی'' کی اصل ''فبشرناها فضحكت''، ''پس ہم نے اسے خوش خبری دی تو ہنسنے لگی'' ہے۔

اور قول باری تعالیٰ ''وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْ لَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ'' (یوسف:۲۴) ''بے شک عورت نے اس کا ارادہ کیا اور وہ بھی عورت کا ارادہ کرتا اگر اپنے رب کی دلیل نہ دیکھ لیتا'' اس آیت میں بھی تقدیم وتاخیر واقع ہوئی ہے' اصل یوں ہے: ''لو لا ان راى برهان ربه لهم بها'' اس تقدیر پر ''هم'' یعنی ارادہ برائی کی حضرت یوسف علیہ السلام سے نفی کردی گئی ہے۔

اور دوسری قسم کی آیات وہ ہیں' جن میں کلام کی تقدیم وتاخیر تو واقع ہے مگر اس کی وجہ سے معنی میں کوئی مشکل اور دقت پیدا نہیں ہوتی ہے۔

علامہ شمس الدین بن الصائغ نے اس قسم کی آیات کے بیان میں ایک کتاب ''المقدمه فی سر الالفاظ المقدمة'' نامی تالیف کی ہے' جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ تقدیم وتاخیر کلام کی نسبت جو حکمت عام طور پر مشہور ہے' وہ اہتمام کا اظہار ہے' جیسا کہ امام سیبویہ نے اپنی کتاب میں بیان کیا ہے کہ اہل زبان کے نزدیک جو بات بہت زیادہ اہم اور توجہ طلب ہوتی ہے' اسے وہ مقدم کردیتے ہیں۔

اور پھر سیبویہ نے اپنے اس قول کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ حکمت تو اجمالی ہے' ورنہ یوں کلام کے مقدم ومؤخر کرنے کی وجوہ اسباب اور اسرار وحکمتیں تفصیلی طور پر لکھی جائیں تو بہت ہیں۔

امام سیبویہ بیان کرتے ہیں کہ تقدیم وتاخیر کلام کے اسرار اور حکمتوں کو تلاش کیا تو خود میں نے قرآن حکیم میں اس کی دس انواع پائی ہیں اور حسب ذیل ہیں:

اوّل تبرک: (حصول برکت کے لیے) مثلاً اہم اور ذیشان امور میں اللہ تعالیٰ کے نام کو مقدم کرنا' جیسے آیت کریمہ: ''شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ'' (آل عمران:١٨) ''اللہ نے گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتوں اور عالموں نے'' اور قول باری تعالیٰ: ''وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ'' (الانفال:٤١) ''اور جان لو کہ جو کچھ غنیمت لو تو اس کا پانچواں حصہ خاص اللہ اور رسول کے لیے''۔

دوم تعظیم: مثلاً اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ. اور جو اللہ اور (اس کے) رسول کی فرماں برداری کرے۔ (النساء:٦٩)

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ. بے شک اللہ اور اس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں۔ (الاحزاب:٥٦)

''وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ''۔

سوم تشریف: (عزت بخشا) اس کی مثال مذکر مونث پر مقدم کرنا ہے جیسے

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ. بے شک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں۔ (الاحزاب:٣٥)

○ آزاد کو غلام پر مقدم کرنا' جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى'' (البقرہ:١٧٨) ''آزاد کے بدلے آزاد اور غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت''۔

○ اور زندہ کو میت پر مقدم کرنا' جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ'' (الانعام:٩٥) ''زندہ کو مردہ سے نکالنے والا'' اور ''وَمَا يَسْتَوِي الْاَحْيَآءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ'' (فاطر:٢٢) ''اور برابر نہیں زندے اور مردے''۔

○ گھوڑے کو دوسری سواری کے جانوروں پر مقدم کرنا' جیسے آیت ''وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا'' (النحل:٨) ''اور گھوڑے اور خچر اور گدھے کہ ان پر سوار ہو''۔

○ اور سماعت کو بصارت پر مقدم کرنا' جیسے ان آیتوں میں ہے: ''وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ'' (البقرہ:٧) ''اور کانوں پر مہر کردی اور ان کی آنکھوں پر گھٹا ٹوپ ہے''۔ ''اِنَّ

السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ'' (بنی اسرائیل:٣٦) ''بے شک کان اور آنکھ اور دل''۔ ''اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَاَبْصَارَكُمْ'' (الانعام:٤٦) ''اور اگر اللہ تمہارے کان اور آنکھ لے لے''۔

ابن عطیہ نے نقاش کے متعلق نقل کیا ہے کہ انہوں نے اسی آیت سے استدلال کیا تھا کہ ''سمع' بصر'' سے افضل ہے' اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی صفت میں ''سمیع بصیر'' یعنی ''سمیع' بصیر'' پر تقدم کے ساتھ وارد ہے۔

○ اور اسی تشریف کے لیے حضور ﷺ کا ذکر دیگر انبیاء کرام علیہم السلام پر مقدم کرنے کی مثال ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ قول ''وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ'' (الاحزاب:٧) ''اور اے محبوب! یاد کرو جب ہم نے نبیوں سے عہد لیا اور تم سے اور نوح سے''۔

○ رسول کو نبی پر مقدم رکھنے کی مثال ''مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ'' (الحج:٥٢) ''رسول یا نبی میں سے''۔

○ مہاجرین کی انصار پر تقدیم کی مثال' اللہ تعالیٰ کا یہ قول ''اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ'' ہے (التوبہ:١٠٠) اور مہاجرین اور انصار میں سے سبقت کرنے والے سب سے پہلے ایمان لانے والے۔

○ انسان کی جن پر تقدیم' جہاں بھی قرآن پاک میں انسان اور جن کا ذکر آیا' انسان کا ذکر اس میں جن سے پہلے آیا ہے۔

○ سورت نساء کی آیت میں پہلے انبیاء کرام کا ذکر ہے' ان کے بعد صدیقین کا اور پھر شہیدوں کا اور اس کے بعد صالحین کا ذکر فرمایا ہے۔

○ حضرت اسماعیل علیہ السلام کو حضرت اسحاق علیہ السلام پر مقدم رکھا ہے' اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کو حضرت اسحاق علیہ السلام پر ایک تو اس وجہ سے زیادہ بزرگی اور شرف حاصل ہے کہ حضور ﷺ ان کی اولاد سے ہیں' دوسرے وہ عمر میں بھی حضرت اسحاق علیہ السلام سے بڑے تھے۔

○ سورہ بقرہ کی آیت میں حضرت جبرائیل علیہ السلام کو حضرت میکائیل علیہ السلام پر مقدم کیا ہے'

کیونکہ حضرت جبریل علیہ السلام میکائیل سے افضل ہیں۔

O ذوی العقول کی غیر ذوی العقول پر تقدیم اس کی مثالیں یہ ہیں:

(۱) ''مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ'' (النزعات:۳۳) تمہارے اور تمہارے چوپاؤں کے فائدہ کو۔

(۲) ''يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ'' (النور:۴۱) ''اللہ کی تسبیح کرتے ہیں جو کوئی آسمان اور زمین میں ہیں اور پرندے پر پھیلائے''۔

چہارم مناسبت: یہ یا تو سیاق کلام کے لیے مقدم کی مناسبت ہوتی ہے' جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے:

وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ — اور ان میں تمہارے لیے زینت ہے جب شام کو (چرا کر) انہیں واپس لاتے ہو

وَحِينَ تَسْرَحُونَ O (النحل:۶) — اور جب (چراگاہ) میں انہیں چھوڑ جاتے ہو O

کیونکہ اونٹوں کے ذریعے خوبصورتی اور خوش نمائی کا حصول اگرچہ سراح (جانور کو چرنے کے لیے چھوڑنا) اور اراحت (جانور کا شام کو چراگاہ سے واپس آنا) ہر دو حالت میں ثابت ہے' مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ حالت اراحت میں ان جمال (اونٹوں) میں جو جمال وخوش نمائی ہوتی ہے کہ جب وہ چراگاہ سے شکم سیر ہو کر اور کوکھیں کس کر سر شام واپس لوٹتے ہیں تو زیادہ قابل فخر ہوتی ہے کیونکہ وہ شکم سیری کی وجہ سے موٹے اور فربہ نظر آتے ہیں اور سراح یعنی صبح چراگاہ جانے کے وقت تہی شکم ہونے کی وجہ سے چونکہ ان کا پیٹ اندر کو دھنسا ہوتا ہے اور کوکھوں میں گڑھے پڑے ہوتے ہیں' اس لیے اس وقت ان کا حسن و جمال دوسری حالت کی بہ نسبت کم درجہ ہوتا ہے اور اسی کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ قول ''وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا'' (الفرقان:۶۷) ''اور وہ کہ جب خرچ کرتے ہیں نہ حد سے بڑھیں نہ تنگی کریں'' بھی ہے کہ اس میں اسراف (فضول خرچی) کی نفی مقدم ہے۔

کیونکہ یہ اسراف مصارف ہی میں ہوتا ہے اور انفاق میں بزرگی ہے۔

O اور اللہ تعالیٰ کے قول ''يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا'' (الرعد:۱۲) ''تمہیں بجلی دکھاتا

ہے ڈر کو اور امید کو'' میں خوف کا ذکر پہلے ہے کیونکہ بجلیاں پہلی چمک کے ساتھ ہی گرا کرتی ہیں جب کہ بارش پے در پے بجلیوں کے چمکنے کے بعد برسا کرتی ہے۔

یا مناسبت ایسے الفاظ میں مطلوب ہوتی ہے' جو تقدم اور تاخر ہی کے لیے وضع ہوتے ہیں' جیسے ''الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ'' (الحدید:۳) ''اوّل اور آخر''۔ ''بما قدم واخر'' اور ''لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَ O'' (المدثر:۳۷) ''اسے جو تم میں سے چاہے کہ آگے آئے یا پیچھے رہے'' وغیرہ مثالوں میں ہے۔

پنجم: ترغیب دلانے اور برانگیختہ کرنے کے لیے تقدیم و تاخیر واقع ہوتی ہے تاکہ سستی اور کاہلی سے بچے' اس کی مثال دین (قرض) کو وصیت پر مقدم کرنا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ'' (النساء:۱۲) ''جو وصیت وہ کر گئیں اور قرض نکال کر'' اس آیت کریمہ میں وصیت کا ذکر پہلے فرمایا ہے حالانکہ شرعی لحاظ سے قرض کی ادائیگی وصیت پر مقدم ہے۔ لیکن ترغیب دلانے کی غرض سے وصیت کا ذکر مقدم کیا تاکہ لوگ اس کی تعمیل سے کاہلی نہ برتیں۔

ششم سبقت: اس تقدم سبقت کی کئی صورتیں ہیں:

(۱) زمانی باعتبار ایجاد کے' جیسے دن کو رات پر' تاریکی کو روشنی پر' آدم علیہ السلام کو نوح علیہ السلام پر اور نوح علیہ السلام کو ابراہیم علیہ السلام پر اور ابراہیم علیہ السلام کو موسیٰ علیہ السلام پر اور ہود علیہ السلام کو عیسیٰ علیہ السلام پر اور داؤد علیہ السلام کو سلیمان علیہ السلام پر اور فرشتوں کو انسان پر پیدائش کے اعتبار سے تقدم حاصل ہے اور ارشاد باری تعالیٰ: ''اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ'' (الحج:۷۵) ''اللہ چن لیتا ہے فرشتوں میں سے رسول اور آدمیوں میں سے'' میں فرشتوں کا ذکر انسان سے پہلے کیا گیا ہے اور عاد کا ثمود پر مقدم ہے۔

اور آیت کریمہ ''قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ'' (الاحزاب:۵۹) ''اے نبی! اپنی بیبیوں اور صاحبزادیوں سے فرما دو'' میں ازواج کو اولاد و ذریت پر مقدم رکھا ہے۔

اور اونگھ کو نیند پر مقدم کرنے کی مثال اس آیت میں ہے: ''لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ'' (البقرۃ:۲۵۵) ''اسے نہ اونگھ آئے نہ نیند''۔

(۲) ایک چیز کو دوسری شے سے نازل کیے جانے کے اعتبار سے تقدم حاصل ہو' جیسے اللہ تعالیٰ کے قول "صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى O" (الاعلیٰ:۱۹) "ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں" میں ہے اور اس کی دوسری مثال یہ آیت ہے: "وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ O مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ" (آل عمران:۳-۴) "اور اس نے اس سے پہلے تورات اور انجیل اتاری لوگوں کو راہ دکھائی اور فیصلہ اتارا"۔

(۳) یا وہ سبقت و تقدم وجوب اور تکلیف کے اعتبار سے ہو' اس کی مثال حسب ذیل ہیں' ارشاد باری تعالیٰ ہے: "اِرْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا" (الحج:۷۷) "رکوع کرو اور سجدہ کرو"۔

اور ایک مقام پر فرمایا: "فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ" (المائدہ:۶) "تو اپنا منہ اور ہاتھ دھوؤ"۔

ایک اور آیت میں یوں ہے: "اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ" (البقرہ:۱۵۸) "بے شک صفا اور مروہ اللہ کے نشانوں سے ہیں" اسی وجہ سے حضور نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: "نبداء بما بدا الله به" "ہم اسی چیز سے شروع کرتے ہیں' جس کے ساتھ اللہ نے (اپنے کلام میں) آغاز فرمایا۔

(۴) یا وہ سبقت اور تقدم بالذات ہوگا' جیسے اللہ تعالیٰ کے قول "مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ" (النساء:۳) "دو دو اور تین تین اور چار چار"۔

ہفتم: سببیت جیسے عزیز کا تقدم حکیم پر کیونکہ اللہ تعالیٰ کی صفت عزت و غلبہ حکم پر مقدم ہے۔

اور علیم کو حکیم پر تقدم کا سبب یہ ہے کہ احکام (مضبوط و مستحکم کرنا) اور اتقان (پختہ بنانا) کا منشاء علم ہے' لہٰذا علم پہلے ہوا۔

اور سورہ الانعام میں حکیم کے علیم پر تقدم کی وجہ یہ ہے کہ وہ تشریع احکام کا مقام اور سورہ الفاتحہ میں عبادات کو استعانت پر مقدم کی وجہ یہ ہے کہ عبادت حصول اعانت کا ذریعہ اور وسیلہ ہے۔

اسی طرح آیت کریمہ "يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ" (البقرہ:۲۲۲) "بے شک اللہ پسند کرتا ہے بہت توبہ کرنے والوں کو اور پسند کرتا ہے ستھروں کو" میں توبہ کرنے والوں کو اس وجہ سے مقدم کیا ہے کہ توبہ ہی طہارت کا سبب ہے۔

اور پھر آیت "لِكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ" (الجاثیہ:۷) "ہر بڑے بہتان ہائے گناہ گار کے لیے" میں "افك" (بہتان تراشی) کو گناہ پر مقدم کیا کیونکہ "افك" گناہ کا باعث بنتا ہے۔

اور "يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ" (النور:۳۰) "اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں" کی آیت میں غض بصر (آنکھ نیچی رکھنا) کا حکم دیا گیا ہے کیونکہ نگاہ ہی بہکتی ہے تو بدی ہوتی ہے۔

ہشتم کثرت: جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ" (التغابن:۲) "تو تم میں کوئی کافر اور تم میں کوئی مسلمان" اس آیت میں کافروں کی کثرت کی وجہ سے ان کا ذکر مومن سے پہلے فرمایا ہے' اسی کی ایک مثال اللہ تعالیٰ کا یہ قول کہ "فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ" (الفاطر:۳۲) "تو ان میں کوئی اپنی جان پر ظلم کرتا ہے" اس آیت میں ظالموں کی کثرت اور بہتات کی وجہ سے ان کا ذکر پہلے کیا ہے' پھر مقتصد کا ذکر کیا اور اس کے بعد سابق کا ذکر ہے اور اسی وجہ سے سارق (چور مرد) کے سارقہ (چور عورت) پر مقدم کیا کیونکہ چور اکثر مرد ہی ہوتے ہیں۔

اور زانیہ (بدکار عوت) کو زانی (بدکار مرد) پر مقدم اس وجہ سے کیا ہے کہ زنا کی کثرت عورتوں میں نسبتاً زیادہ ہوتی ہے کیونکہ وہ زنا کا سبب بنتی ہے۔ قرآن پاک میں بیشتر مقامات پر رحمت کو عذاب پر مقدم کیا گیا ہے کیونکہ رحمت خداوندی عذاب کے مقابلہ میں غالب اور اکثر ہے' اسی وجہ سے حدیث قدسی میں آیا ہے کہ "ان رحمتي غلبت غضبي" "بے شک میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے"۔

نہم: ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی' جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَآ اَمْ لَهُمْ اَيْدٍ يَّبْطِشُوْنَ بِهَآ" (الاعراف:۱۹۵) "کیا ان کے پاؤں ہیں جن سے چلیں' کیا ان کے ہاتھ ہیں جن سے پکڑیں"۔

اس آیت میں ترقی کی غرض سے ابتداء ادنیٰ سے کی' کیونکہ "ید" (ہاتھ) "رجل" (پاؤں) سے "عین" (آنکھ) "ید" سے اور "سمع" (کان) "بصر" (نگاہ) سے اشرف و اعلیٰ ہے اور اسی قبیل سے ابلغ زیادہ بلیغ کو موخر کرنا بھی ہے' جس کی مثال وہ آیت ہے' جس میں رحمٰن کو رحیم پر اور رؤف کو رحیم پر اور رسول کو نبی پر مقدم کیا ہے' ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا O" (مریم:۵۱)۔

اس آخری مثال کی نسبت بہت سے اور بھی نکات بیان کیے گئے ہیں' جن میں سے سب سے مشہور نکتہ رعایت فاصلہ ہے۔

دہم: اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف تنزل۔ اس کی مثالیں یہ ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ. نہ اسے اونگھ آئے اور نہ نیند۔
(البقرہ:۲۵۵)

لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً. اس نے کوئی چھوٹا (گناہ) چھوڑا اور نہ بڑا (مگر سب کو گھیر لیا)۔ (الکہف:۴۹)

قرآن کے عام اور خاص کا بیان

عام وہ لفظ ہے' جو بغیر حصر کے اپنے لائق اور مناسب معانی کا احاطہ کرتا ہو۔

صیغہ ہائے عموم کا بیان

لفظ "کل" جب مبتدا ہو جیسے "كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ" (الرحمٰن:۲۶) یا تابع ہو (برائے تاکید) جیسے "فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ O" (الحجر:۳۰) "تو جتنے فرشتے تھے سب کے سب سجدے میں گرے O"۔

اسم موصول: "الذی ' التی" اور ان دونوں کے تثنیہ اور جمع کے صیغے بھی عموم کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

مثالیں:

وَالَّذِيْ قَالَ لِوَالِدَيْهِ اُفٍّ لَّكُمَآ. وہ جس نے اپنے ماں باپ سے کہا: اف (یعنی تم دونوں پر افسوس ہے!)۔ (الاحقاف:۱۷)

کیونکہ اس سے مراد ہر وہ شخص ہے جس سے یہ فعل صادر ہوا اس کی دلیل یہ ہے کہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا قول ہے:

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ. یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کی

بات پوری ہو کر رہی۔ (الاحقاف:۱۸)

اس میں بھی ایسی ہی تعمیم مراد ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ. (البقرہ:۸۲) اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے' وہ جنتی ہیں۔

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ. (یونس:۲۶) جن لوگوں نے نیک کام کیے' ان کے لیے اچھی جزا ہے۔

اور اس سے بھی زیادہ "لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ" (آل عمران:۱۵) "پرہیزگاروں کے لیے ان کے رب کے ہاں جنتیں ہیں"۔

وَالّٰٓـئِيْ يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ. (الطلاق:۴) اور جو حیض سے مایوس ہو چکی ہوں۔

وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا. (النساء:۱۵) اور جو بدکاری کریں تمہاری عورتوں میں سے تو گواہی طلب کرو۔

وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا. (النساء:۱۶) اور جو دو آدمی برائی کا ارتکاب کریں تم میں سے تو انہیں اذیت پہنچاؤ۔

O "ای ما" اور "من" یہ الفاظ ہر حالت میں عموم کے لیے آتے ہیں' چاہے شرطیہ ہوں' استفہامیہ ہوں یا موصولہ ہوں۔

ان کی مثالیں حسب ذیل ہیں:

"ای" کی مثال جیسے "اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى" (بنی اسرائیل:۱۱۰)

"جس نام سے بھی پکارو' سب اسی کے اچھے نام ہیں"۔

"ما" کی مثال جیسے "اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ" (الانبیاء:۹۸)

"بے شک تم اللہ کے سوا جن بتوں کی تم عبادت کرتے ہو' سب جہنم کا ایندھن ہیں"۔

"من" کی مثال جیسے "مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ" (النساء:۱۲۳) جو برائی کرے گا' اس کا بدلہ دیا جائے گا۔

O اور صیغہ جمع جب مضاف ہو تو وہ عموم پر دلالت کرتا ہے' جیسے اس آیت میں ہے:

"یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ فِیْٓ اَوْلَادِکُمْ" (النساء:١١) "حکم دیتا ہے تمہیں اللہ تعالیٰ تمہاری اولاد کے (حصوں) کے بارے میں"۔

○ معرف باللام بھی عام کی قسم سے ہے، جیسے "قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ" (المؤمنون:١) "بے شک مراد کو پہنچے ایمان والے" اور "فَاقْتُلُوا الْمُشْرِکِیْنَ" (التوبہ:٥) "تو مشرکوں کو مارو" کی مثالوں میں ہے۔

○ اور اسم جنس جس وقت مضاف ہو تو وہ بھی مفید عموم ہوتا ہے، جیسے مثلاً آیت "فَلْیَحْذَرِ الَّذِیْنَ یُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِہٖ" (النور:٦٣) "تو وہ لوگ ڈریں جو رسول کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہیں" میں ہے کہ اس سے مراد تمام احکام خداوندی ہیں۔

○ اور معرف بالف ولام بھی اسی معنی میں آتا ہے، مثلاً "وَاَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ" (البقرہ:٢٧٥) "اور اللہ نے حلال کیا بیع کو"، یعنی (کل بیع) اسی طرح "اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝" (العصر:٢) "بے شک آدمی ضرور نقصان میں ہے" میں کل انسان مراد ہیں، اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ قول "اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" (العصر:٣) "مگر جو ایمان لائے" ہے۔

○ ایسے ہی اسم نکرہ سیاق نفی اور نہی میں واقع ہو تو عموم کا فائدہ دیتا ہے، جیسے ارشاد خداوند تعالیٰ ہے: "فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ" (بنی اسرائیل:٢٣) تو (اے مخاطب!) انہیں اف (تک) نہ کہنا۔

اور آیت کریمہ:

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ۔ (الحجر:٢١)
اور کوئی چیز نہیں لیکن ہمارے پاس اس کے خزانے ہیں۔

اور آیت:

ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ۔ (البقرہ:٢)
یہ عالی شان کتاب اس میں کوئی شک نہیں۔

اور قول باری تعالیٰ:

فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِی الْحَجِّ۔ (البقرہ:١٩٧)
تو نہ عورتوں سے مباشرت کی باتیں اور نہ گناہ اور نہ جھگڑا حج میں۔

○ اسی طرح نکرہ جب سیاق شرط میں واقع ہو تو مفید عموم ہوتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کے اس قول میں ہے: "وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ اسْتَجَارَکَ فَاَجِرْهُ حَتّٰی یَسْمَعَ کَلٰمَ اللّٰهِ" (التوبہ:٦) اور اگر مشرکین میں سے کوئی شخص آپ سے پناہ مانگے تو اسے پناہ دیجئے یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سنے۔

اسی طرح سیاق امتنان (احسان رکھنا) میں بھی، جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے: "وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا" (الفرقان:٤٨) "اور ہم نے آسمانوں سے پاک کرنے والا پانی اتارا"۔

قرآن مجید کے ذریعہ جن احکام کی تخصیص کی گئی ہے، اس کی مثالوں میں سے چند حسب ذیل ہیں:

وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ۔ (البقرہ:٢٢٨)
اور طلاق پانے والی عورتیں روکے رکھیں اپنی جانوں کو تین حیض (تک)۔

اس کی مخصص یہ آیت ہے، جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِذَا نَکَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَکُمْ عَلَیْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ۔ (الاحزاب:٤٩)
جب تم مسلمان عورتوں سے نکاح کرو، پھر ہاتھ لگانے سے پہلے انہیں طلاق دے دو تو تمہارے لیے ان پر کچھ عدت نہیں۔

اور دوسرے اس آیت:

وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ یَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ۔ (الطلاق:٤)
اور حاملہ عورتوں کی عدت ان کا وضع حمل ہے۔

اس سے بھی عام حکم کی تخصیص ہو گئی ہے۔

اور قول باری تعالیٰ "حُرِّمَتْ عَلَیْکُمُ الْمَیْتَةُ وَالدَّمُ" (المائدہ:٣) "حرام کیا گیا تم پر مردار (اور رگوں کا بہا ہوا) خون"۔ اس میں "میتہ" سے "سمك" (مچھلی) کی تخصیص کر دی گئی ہے کہ مردہ مچھلی اس حرمت سے مستثنیٰ ہے، جیسا کہ خود ارشاد خداوندی ہے کہ "اُحِلَّ لَکُمْ صَیْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهٗ مَتَاعًا لَّکُمْ وَلِلسَّیَّارَةِ" (المائدہ:٩٦) "دریا میں شکار کرنا (نیز پکڑی ہوئی مچھلی) اور دریا کا طعام (اس کی پھینکی ہوئی مچھلی) تمہارے لیے حلال ہے، تمہارے اور مسافروں کے فائدہ کے لیے" اور "دم" سے جامد خون کو خاص کر دیا۔ اس کی تصریح "او دما

مسفوحًا ‘‘ پھر آیت کریمہ ’’ وَاٰتَيْتُمْ اِحْدٰهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا ‘‘ (النساء:۲۰)
’’ اور اسے ڈھیروں مال دے چکے ہو تو اس میں کچھ واپس نہ لو‘ (الایہ) کی تعمیم کو اللہ تعالیٰ نے اپنے قول ’’ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ‘‘ (البقرہ:۲۲۹) ’’ تو ان پر کچھ گناہ نہیں جو عورت نے (خلاصی پانے کا) بدلہ دیا‘‘ سے خاص فرمادیا ہے۔

اور قول باری تعالیٰ ہے: ’’ اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ‘‘ (النور:۲) ’’ جو عورت بدکار ہو اور جو مرد بدکار ہو تو لگاؤ ہر ایک کو ان دونوں میں سے سو سو دُرے‘‘ میں جو عموم تھا‘ اسے بھی خاص کر دیا‘ چنانچہ ارشاد فرمایا کہ ’’ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ‘‘ (النساء:۲۵) ’’ تو ان پر آدھی سزا ہے جو آزاد عورتوں پر ہے‘‘۔

اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کے قول ’’ فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ ‘‘ (النساء:۳) ’’ تو نکاح میں لاؤ جو عورتیں تمہیں خوش آئیں‘‘ میں عام حکم کی تخصیص آیت کریمہ ’’ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ ‘‘ (النساء:۲۳) ’’ حرام ہوئیں تم پر تمہاری مائیں‘‘ سے کردی گئی ہے۔

احادیث مبارکہ کے ذریعہ تخصیص کی مثالیں یہ ہیں

اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ’’ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ ‘‘ (البقرہ:۲۷۵) اللہ نے بیع یعنی خرید وفروخت کو جائز فرمایا ہے‘ مگر بیع فاسدہ جو بہ کثرت ہیں‘ اس عام حکم سے حدیث کے ذریعے خارج کر دی گئی ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ’’ رِبٰوا ‘‘ سود کو حرام فرمایا اور اس سے عرایا کو حدیث کے ذریعہ خاص کر دیا گیا ہے۔

○ آیت میراث کے عموم میں حدیث کے ذریعہ تخصیص کر کے قاتل اور مخالف فی الدین شخص کو وراثت سے محروم قرار دے دیا گیا۔

اور تحریم ’’ میتۃ ‘‘ (مردار حرام ہے) کی آیت میں حدیث نے تخصیص کر کے جراد یعنی ٹڈی کو اس حکم سے مستثنیٰ کیا ہے۔

○ اور ’’ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ‘‘ (البقرہ:۲۲۸) ’’ تین حیض‘‘ کی آیت میں سے لونڈی کی تخصیص بھی بہ ذریعہ حدیث ہوئی ہے اور اللہ تعالیٰ کے قول ’’ ماء طهورا ‘‘ سے وہ پانی جس کے اوصاف (رنگ‘ بو‘ ذائقہ) بدل گئے ہوں‘ کو حدیث کے ذریعے مخصوص کر دیا گیا ہے اور ’’ السارق

والسارقہ ‘‘ کا حکم ہر چور کے لیے تھا‘ مگر حدیث نے چار دینار سے کم چوری کرنے والے کو ہاتھ کاٹے جانے کے حکم سے خارج کر دیا ہے۔

○ اجماع کے ذریعہ تخصیص کی مثال درج ذیل ہے:

’’ رقیق ‘‘ (غلام) کو آیت میراث کے حکم سے خارج کر دیا گیا ہے‘ لہٰذا رقیق کبھی وارث نہیں ہوگا‘ علامہ مکی نے ذکر کیا ہے کہ اس پر تمام علماء کا اجماع ہے۔

○ قیاس سے تخصیص پیدا ہونے والی مثال آیت زنا ’’ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ‘‘ (النور:۲) ’’ اور ان میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو‘‘۔

اس میں سے ’’ عباد ‘‘ کو ’’ اَمۃ ‘‘ (لونڈی) پر قیاس کر کے خاص کیا ہے اور لونڈی کے بارے میں یہ حکم نص سے ثابت ہے‘ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ’’ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ‘‘ (النساء:۲۵) ’’ ان پر اس کی آدھی سزا ہے جو آزاد (کنواری) عورتوں پر ہے‘‘۔ چنانچہ اس آیت نے آیت کے عام حکم کو خاص کر ڈالا ہے‘ یہ قول علامہ مکی سے منقول ہے۔

فصل

قرآن مجید میں بعض خاص نصوص ایسی بھی ہیں‘ جو سنت نبوی ﷺ ’’ علی صاحبہا التحیہ والسلام ‘‘ کے عموم کے لیے مخصص ہیں‘ لیکن اس کی مثالیں کم ہیں‘ منجملہ ان امثلہ کی ایک مثال اللہ تعالیٰ کا قول ’’ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ ‘‘ (التوبہ:۲۹) ’’ جب تک اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں‘‘ ہے کہ اس نے نبی کریم ﷺ کے ارشادِ گرامی ’’ امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا الہ الا اللہ ‘‘، ’’ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے لڑوں یہاں تک کہ وہ لا الہ الا اللہ کا اقرار کر لیں‘‘ کے عموم کی تخصیص کر دی ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ’’ حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ‘‘ (البقرہ:۲۳۸) ’’ نگہبانی کرو سب نمازوں کی اور بیچ کی نماز کی ‘‘ مخصوص ہے‘ اس نہی کے عموم کے لیے حضور ﷺ نے اوقات مکروہ میں نماز کی ادائیگی کے سلسلہ میں فرمائی ہے‘ فرائض کو نکال کر۔

اور اللہ تعالیٰ کا قول ’’ وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا ‘‘ (الایہ) رسول کریم ﷺ کے

ارشاد "ما ابین من حیی فهو میت" کی تخصیص کر دیتا ہے۔

اور آیت کریمہ "وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ" (التوبہ:۶۰) "اور جو اسے تحصیل کر کے لائیں اور جن کے دلوں کو اسلام سے الفت دی جائے" نے حضور ﷺ کی حدیث مبارک "لا تحل الصدقه یلغنی ولا الذی مره سوی" کے عموم کی تخصیص کر دی ہے اور آیت کریمہ "فقاتلوا التی تبغی" نے نبی ﷺ کے قول "اذا التقی المسلمان فالقاتل والمقتول فی النار" کے عموم کو خاص کر دیا۔

عموم وخصوص ہی کے متعلق چند متفرق ذیلی مسائل کا بیان

اول: یہ کہ جب لفظ عام مدح یا ذم کے لیے وارد ہو تو آیا وہ اس صورت میں اپنے عموم پر باقی رہتا ہے یا نہیں؟ اس کے بارے میں کئی مذاہب ہیں:

○ ایک مذہب یہ ہے کہ وہ اپنے عموم پر باقی رہتا ہے کیونکہ اس میں نہ کوئی قرینہ صارفہ عن العموم پایا جاتا ہے اور نہ ہی مدح و ذم اور عموم کے درمیان کسی قسم کی کوئی منافات ہے کہ ان میں اجتماع نہ ہو سکے۔

○ دوسرا مذہب یہ ہے کہ وہ اپنے عموم پر نہیں رہے گا' کیونکہ اسے تعمیم کے لیے نہیں لایا گیا' بلکہ مدح و ذم کے لیے استعمال ہوا ہے' پس وہ اسی کا فائدہ دے گا اور بس!

○ تیسرا جو کہ زیادہ صحیح مذہب ہے' وہ یہ ہے کہ تفصیل سے کام لیا جائے گا چنانچہ اگر کوئی اور عام اس کا معارض نہ ہو اور نہ عام اس غرض کے لیے استعمال ہوا ہو تو پھر وہ عام اپنے عموم پر باقی رہتا ہے۔

لیکن اگر کوئی دوسرا عام اس کے معارض پایا جائے تو پھر عموم مراد نہیں ہوگا کیونکہ ایسے میں دونوں کے مابین جمع اور توافق پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے۔

اس عام کی مثال کہ اس کا معارض کوئی نہیں ہے' اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: "اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ○ وَّاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ○" (الانفطار:۱۴-۱۳) "بے شک نیکی کرنے والے راحت میں ہیں○ اور یقیناً بدکار لوگ ضرور دوزخ میں ہیں○"۔

اور معارض ہونے کی مثال' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ○

اِلَّا عَلٰٓی اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ" (المؤمنون:۶-۵) "اور جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں○ مگر اپنی (منکوحہ) بیویوں پر یا (مملوکہ) باندیوں پر"۔ کہ اس آیت میں عام کو بیان مدح کے لیے لایا گیا ہے اور اس کے ظاہری الفاظ سے اس بات کا عموم بھی پایا جاتا ہے کہ ملک یمین (لونڈیوں) کی صورت میں دو بہنوں کو ایک ساتھ جمع بھی کیا جا سکتا ہے' مگر اس "جمع بین الاختین" کے مفہوم سے اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: "وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ" (النساء:۲۳) اور یہ کہ تم جمع کرو دو بہنوں کو معارضہ کر رہا ہے' کیونکہ یہ حکم ملک یمین کے ذریعے سے بھی دو بہنوں کو جمع کرنے کو شامل ہے اور یہ مدح کے لیے نہیں لایا گیا' لہٰذا اوّل کے عموم کو اس بات کے سوا دیگر امور پر محمول کیا جائے گا اور یہ مانا جائے گا کہ پہلے عام نے دوسرے عام کو اپنے دائرہ اثر میں شامل کرنے کا ہرگز ارادہ نہیں کیا۔

○ اور عام کے سیاق "ذم" میں واقع ہونے کی مثال' آیت کریمہ "وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ" (التوبہ:۳۴) "اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں" بیان مذمت کے لیے لائی گئی ہے اور اس کا ظاہری حکم زیورات کو بھی عام اور شامل ہے' حالانکہ زیورات کا استعمال مباح ہے۔

اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ حدیث "لیس فی الحلی زکاة"، "زیور میں زکوٰۃ نہیں" اس کے معارض ہے' لہٰذا پہلے عام کو اس کے ماسوا پر محمول کیا جائے گا۔

ثانی: دوسرے یہ کہ وہ خطاب جو حضور ﷺ کے ساتھ خاص ہے' مثلاً "یایها النبی" اور "یایها الرسول" تو اس میں اختلاف ہے کہ آیا یہ امت کو بھی شامل ہے یا کہ امت اس میں حضور ﷺ کے ساتھ شریک نہیں ہے' اس کے جواب میں کہا گیا ہے کہ بے شک امت بھی اس خطاب میں شریک ہے کیونکہ پیشوا کو جو حکم دیا جاتا ہے تو عرفاً وہ اس کے پیروکاروں اور اتباع کرنے والوں کو بھی حکم ہوتا ہے' مگر علم اصول میں صحیح تر قول یہ ہے کہ اس خطاب میں امت کی شرکت کا ہونا درست نہیں' کیونکہ صیغہ خطاب نبی کریم ﷺ کی ذات اقدس کے ساتھ خاص ہے۔

ثالث: تیسرے "یایها الناس" کے خطاب میں اختلاف ہے کہ آیا یہ خطاب رسول پاک ﷺ کو بھی شامل ہے یا نہیں؟

○ اگرچہ اس اختلاف میں بھی کئی مذاہب ہیں، لیکن صحیح ترین مذہب جس کے قائل اکثر علماء ہیں' یہ ہے کہ صیغہ کے عموم کی وجہ سے وہ خطاب رسول کریم ﷺ کو بھی شامل ہے۔

ابن ابی حاتم' زہری سے روایت کرتے ہیں' انہوں نے بیان کیا ہے کہ جس وقت اللہ تعالیٰ ''یا ایھا الذین امنوا افعلوا'' ارشاد فرماتا ہے' اس وقت نبی کریم ﷺ بھی مؤمنین کے ساتھ شریک خطاب ہوتے ہیں۔

○ دوسرا مذہب یہ ہے کہ نہیں وہ خطاب حضور ﷺ کو شامل نہیں ہوتا کیونکہ وہ خطاب خود رسول اکرم ﷺ ہی کی زبان سے دوسروں کو تبلیغ کے لیے ادا کرایا گیا ہے اور یہ مناسب معلوم نہیں ہوتا کہ آپ خود بھی اس میں شریک خطاب ہوں' جو بات کہ آپ کی معرفت دوسروں کو پہنچائی گئی ہے' علاوہ ازیں آپ کی خصوصیات بھی آپ کو اس تعظیم میں شامل قرار نہیں دیتیں۔

○ تیسرا مذہب یہ ہے کہ اگر وہ خطاب لفظ ''قل'' (صیغہ امر) کے ساتھ مقترن ہوتو پھر اس وجہ سے کہ وہ تبلیغ کے باب میں ظاہر اور نمایاں حکم ہو جاتا ہے' کبھی رسول اکرم ﷺ کو شامل نہ ہوگا اور یہی امر اس کے عدم شمول کا قرینہ ہے لیکن اگر وہ ''قل'' کے ساتھ مقترن نہ ہوتو پھر البتہ شامل ہوگا۔

○ چوتھا مذہب جو کہ اصل میں درست ترین مذہب ہے' وہ یہ ہے کہ ''یا ایھا الناس'' کے خطاب میں ''کافر'' اور ''عبد'' (مومن غلام) دونوں شریک ہوتے ہیں' کیونکہ لفظ ''الناس'' عام ہے' اس میں سب انسان شریک ہیں۔

○ اور ایک کے مطابق یہ کافر کو شامل نہیں ہے کیونکہ وہ فروعات کا مکلف نہیں ہوتا اور اسی طرح ''عبد'' کو بھی شامل نہیں کیونکہ اس کے تمام منافع شرعی لحاظ سے اس کے آقا کو پہنچتے ہیں۔

○ پانچواں اختلاف یہ ہے کہ آیا لفظ ''من'' مونث کو بھی شامل ہوتا ہے یا نہیں؟ صحیح ترین رائے یہ ہے کہ یہ مونث اور مذکر دونوں کے لیے آتا ہے' مگر احناف اس کے خلاف ہیں اور ہماری دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ

اَوْ اُنْثٰى'' (النساء:۱۲۴) ''اور جو کچھ بھلے کام کرے گا مرد ہو یا عورت'' اس میں مذکر اور مونث دونوں کے ذکر کے ساتھ نیک عمل کرنے والوں کی تفسیر بیان کی گئی ہے اور یہ اس امر پر دلیل ہے کہ لفظ ''من'' مذکر و مونث دونوں کو شامل ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا قول ''وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ'' (الاحزاب:۳۱) ''اور جو تم میں اللہ کا فرماں بردار رہے'' بھی ہے۔ جمع مذکر سالم کے بارے میں بھی یہ اختلاف ہے کہ آیا وہ مونث کو شامل ہوتا ہے یا نہیں؟

صحیح ترین قول یہ ہے کہ شامل نہیں ہوتا اور اگر جمع مذکر سالم میں کوئی مونث داخل بھی ہوتو کسی قرینہ کی وجہ سے ایسا ہوگا' البتہ جمع مکسر میں مونث بالاتفاق داخل ہے۔

○ چھٹے اس میں اختلاف ہے کہ آیا ''یا اھل الکتاب'' کے خطاب میں مومنین بھی شامل ہیں یا نہیں؟ صحیح یہ ہے کہ نہیں کیونکہ لفظ کا اختصاص صرف انہی لوگوں کے ساتھ ہے' جن کا اس خطاب میں ذکر آیا ہے اور ایک رائے یہ ہے کہ اگر اہل کتاب کے ساتھ مومنین کی شرکت معنوی اعتبار سے ہوتو پھر یہ خطاب ان کو بھی شامل ہوگا ورنہ نہیں۔

اور یہ بھی مختلف فیہ امر ہے کہ ''یایھا الذین امنوا'' کے خطاب میں اہل کتاب شریک ہیں یا نہیں؟

ایک قول یہ ہے کہ نہیں اس لیے کہ وہ فروعی احکام کے مخاطب نہیں ہیں اور دوسرا قول یہ ہے کہ وہ شریک خطاب ہیں۔

ابن السمعانی رحمۃ اللہ کا مختار یہی ہے' وہ لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ''یایھا الذین امنوا'' خطاب تشریف ہے' تخصیص کے لیے نہیں ہے۔

قرآن مجید کے مجمل اور مبین کا بیان

مجمل: مجمل اس کلام کو کہتے ہیں جو واضح طور پر (اپنے معنی پر) دلالت نہ کرے' قرآن مجید میں اس کی مثالیں موجود ہیں' مگر داؤد ظاہری (فرقہ ظاہریہ کا امام) اس کا قائل نہیں۔

قرآن مجید کا مجمل باقی رہنے کے جواز میں کثیر اقوال ہیں' جن میں سے زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ مجمل پر عمل کرنے کے لیے کوئی شخص مکلف نہیں' بہ خلاف غیر مجمل کے کہ اس پر عمل

ضروری ہوتا ہے۔

چند آیات کے بارے میں یہ اختلاف ہے کہ آیا از قبیل مجمل ہیں یا نہیں؟ ان جملہ آیات میں سے ایک آیت سرقہ ہے' کہا گیا ہے کہ یہ آیت ''یـد'' (ہاتھ) کے بارے میں مجمل ہے کیونکہ ''ید'' کا اطلاق کلائی' کہنی اور کندھا تک ہر سہ حصص کے مجموعہ پر ہوتا ہے۔

اور پھر ''قطع'' (کاٹنے) کے بارے میں بھی اجمال ہے' کیونکہ قطع کا استعمال جدا کرنا اور زخمی کرنا' دونوں معنوں کے لیے ہوتا ہے اور یہاں کسی امر کی بھی وضاحت نہیں ہے' ہاں شارع علیہ السلام کا یہ بیان فرمانا کہ ہاتھ کو کلائی کے قریب سے کاٹا جائے' اس کی مراد کو ظاہر کرتا ہے۔

اور ایک قول یہ ہے کہ اس آیت میں کوئی اجمال ہے ہی نہیں' اس کی وجہ یہ ہے کہ قطع کا استعمال ابانت (جدا کرنے) کے معنی میں ظاہر ہے۔

اور اسی طرح آیت کریمہ ''وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ'' (المائدہ:٦) ''اور سروں کا مسح کرو'' بھی از قسم مبین ہے' اس میں اجمال یوں بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے تردد پیدا کر دیا ہے کہ پورے سر کا مسح کرنا ہے یا بعض حصہ سر کا مسح کرنا ہے اور شارع علیہ السلام کا مقدار ناصیہ (پیشانی کی مقدار) سر کا مسح فرمانے کا عمل اس اجمال کی تفصیل اور بیان بنتا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ نہیں یہاں پر ''وامسحوا'' مطلق مسح پر دلالت کرتا ہے اور اس کا اطلاق مسح کے واقع ہونے والی شے کے قلیل حصہ پر بھی صادق آتا ہے' زیادہ سے زیادہ پر بھی اور ان آیات میں جن کے مجمل یا مفصل ہونے میں اختلاف ہے' وہ آیات بھی ہیں' جن میں شرعی اسماء واقع ہیں' مثلاً:

اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ. (البقرہ:۴۳) — نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ. (البقرہ:۱۸۵) — تو تم میں سے جو اس مہینہ میں موجود ہو تو وہ ضرور اس کے روزے رکھے۔

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ. (آل عمران:۹۷) — اور اللہ کے لیے لوگوں پر اس کے گھر کا حج کرنا ہے۔

کہا گیا ہے کہ یہ آیات بھی مجمل ہیں کیونکہ لفظ ''صلوۃ'' ہر ایک دعا کا اور لفظ ''صوم'' ہر ایک قسم کے امساک (رک جانے) اور لفظ ''حج'' ہر ایک قصد کرنے کا احتمال رکھتا ہے اور ان الفاظ کی خاص مراد پر لغت سے کوئی استدلال نہیں ہو سکتا' لہٰذا ان کے لیے بیان کی حاجت پڑی' اور ایک قول یہ ہے کہ ان میں اجمال کا احتمال نہیں ہے' بلکہ ان الفاظ کو تمام مذکورہ معانی محتملہ پر محمول کیا جائے گا' سوائے اس تخصیص کے جو کسی دلیل سے ثابت ہو جائے۔

قرآن حکیم کے ناسخ اور منسوخ کا بیان

نسخ کے معنی کی لغوی تحقیق

نسخ کا لفظ زائل کرنے (مٹانے) کے معنی کے لیے استعمال ہوا ہے' جیسے قرآن مجید میں ارشاد ہوا: ''فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ'' (الحج:۵۲) تو اللہ مٹا دیتا ہے' شیطان کے ڈالے ہوئے کو' پھر اپنی آیتیں خوب پکی کر دیتا ہے۔ اور تبدیل کے معنی میں بھی آتا ہے' جیسے اس آیت میں ہے: ''وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ'' (النحل:۱۰۰) اور جب ہم ایک آیت کو بدل کر اس کی جگہ دوسری آیت لاتے ہیں اور تحویل کے معنی میں بھی آتا ہے۔ مثلاً موارث کا تناسخ ایک شخص سے دوسرے شخص کی جانب تحویل میراث کے معنی میں ہے۔

اور ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل کرنے کے لیے بھی لفظ نسخ آتا ہے' جیسے کہا جاتا ہے: ''نسخت الکتاب'' یہ محاورہ اس وقت بولا جاتا ہے' جب قرآن کے لفظ اور طرز خط دونوں کو من و عن نقل اور حکایت کر دیا جائے۔

مسئلہ دوم: یہ ہے کہ ''نسخ'' منجملہ ان امور کے ہے' جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اس امت مسلمہ کو خاص اور ممتاز فرمایا ہے۔ نسخ کی بے شمار حکمتیں ہیں' ان میں سے ایک حکمت ''تیسیر'' یعنی احکام میں آسانی اور سہولت فراہم کرنا ہے اور نسخ کے جواز پر امت مسلمہ کا اجماع ہے۔ جب کہ یہودیوں کا خیال یہ ہے کہ نسخ سے معاذ اللہ' اللہ تعالیٰ کی شان میں ''بداء'' کی خرابی اور قباحت لازم آتی ہے' لہٰذا اس کے جواز کا قول نہیں کیا جا سکتا اور ''بداء'' کی تعریف یہ ہے کہ کسی کے خیال میں ایک بات آئے اور پھر وہ اس کو چھوڑ کر دوسری رائے قائم

کرے' جو اس پر بعد میں ظاہر ہو' یعنی بداء تلون مزاجی کا نام ہے اور یہود کا یہ اعتراض اس لیے باطل ہے کہ نسخ اسی طرح احکام کی مدت بیان کرنے کی غرض سے ہوتا ہے' جیسے موت سے دوچار کرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنا اور اس کے برعکس بیماری کے بعد تندرست کرنا' یا اس کا عکس مالدار کرنے کے بعد مفلس و نادار کر دینا یا عکس' تو جس طرح یہ سب امور جائز ہیں اور ان میں کسی چیز کو بھی ''بداء'' نہیں کہا جا سکتا اور امر اور نہی کی بھی یہی صورت حال ہے۔

ناسخ قرآن کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے' بعض علماء فرماتے ہیں کہ قرآن کا ناسخ صرف قرآن ہی ہو سکتا ہے' جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ''مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا'' (البقرہ:۱۰۶) ''جو آیت ہم منسوخ کر دیتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں (تو) اس سے بہتر یا اس جیسی لے آتے ہیں''۔

علماء مفسرین فرماتے ہیں:

قرآن مجید کی مثل اور اس سے بہتر قرآن ہی ہو سکتا ہے نہ کہ کوئی دوسری چیز۔

دوسرا قول یہ ہے کہ قرآن کا نسخ حدیث سے بھی ہو سکتا ہے کیونکہ سنت کا ثبوت بھی منجانب اللہ ہے' لہٰذا وہ بھی قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے' حدیث کے اللہ کی جانب سے ہونے پر دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد ''وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی'' (النجم:۳) ہے یعنی ''رسول اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتے'' اور وصیت کی آیت جو آگے آ رہی ہے' اس کا تعلق اسی قسم سے ہے۔

مسئلہ سوم: یہ ہے کہ نسخ فقط امر اور نہی میں واقع ہوتا ہے' عام ازیں کہ وہ اوامر و نواہی لفظ خبر (جملہ خبریہ) کے ساتھ وارد ہوں یا صیغہ امر و نہی (جملہ انشائیہ) کے ساتھ' مگر جو خبر (جملہ خبریہ) طلب اور انشاء کے لیے نہ ہو' اس میں نسخ راہ نہیں پاتا' اسی طرح وعد اور وعید بھی اسی قبیل سے ہیں کہ ان کو میں بھی نسخ کو دخل نہیں ہے۔

لہٰذا اس وضاحت کے بعد یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ جو علماء اخبار' وعد اور وعید کی آیات کو کتاب النسخ میں لائے ہیں' وہ ٹھیک نہیں ہے۔

مسئلہ چہارم: یہ ہے کہ نسخ کی کئی قسمیں ہیں۔

نسخ کی پہلی قسم وہ ہے کہ جس میں مامور بہ پر عمل درآمد سے پہلے ہی اس کو منسوخ کر دیا گیا ہو' اس کی مثال ''آیت نجویٰ'' ہے اور یہی حقیقی نسخ ہے' دوسرا نسخ وہ منسوخ شدہ حکم ہے' جو

ہم سے پہلی امتوں پر نافذ اور مشروع تھا' جیسے مشروعیت قصاص اور دیت کی آیت ہے۔

یا پھر کسی چیز کا حکم مجمل طور پر دیا گیا تھا' مثلاً بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرنا پہلے مشروع تھا' پھر یہ منسوخ کر کے خانہ کعبہ کی طرف رخ کرنے کا حکم دے دیا' اسی طرح عاشورہ کے روزہ کا حکم ماہ رمضان المبارک کے روزوں کے ساتھ منسوخ کیا گیا اور اس قسم پر مجازی طور پر نسخ کا اطلاق کیا جاتا ہے۔

تیسرا نسخ وہ ہے' جس کا حکم کسی سبب کی بناء پر دیا گیا تھا' مگر بعد میں سبب زائل ہو گیا' جیسے مثلاً مسلمانوں کی کمزوری اور کمی کے وقت میں صبر اور عفو و درگزر سے کام لینے کا حکم دیا گیا تھا' مگر بعد میں یہ وجہ جاتی رہی تو سبب کے زائل ہونے پر جہاد فرض کر کے اسے منسوخ کر دیا گیا' یہ نسخ درحقیقت نسخ نہیں ہے بلکہ از قسم ''منساء'' (یعنی فراموش کر دینے کے) ہے' جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''او ننسها'' ہم اس حکم کو نسیان و فراموشی کی نذر کر ڈالتے ہیں۔ چنانچہ مسلمانوں کے قوت حاصل کرنے تک قتال کا حکم اٹھائے رکھا گیا اور جب تک اسلام کو غلبہ حاصل نہیں ہوا اور مسلمان کمزوری کی حالت میں تھے انہیں اذیت پر صبر کرنے کا حکم تھا۔

بیان مذکور سے اکثر لوگوں کی اس ہرزہ سرائی کا زور ٹوٹ جاتا ہے کہ اس بارے میں جو آیت نازل ہوئی تھی' وہ آیت سیف کے نزول سے منسوخ ہو گئی ہے' بات یہ نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ آیت ''منساء'' کے قبیل سے ہے' جس کے معنی یہ ہیں کہ ہر ایک امر جو وارد ہوا ہے' اس پر عمل درآمد کرنا کسی نہ کسی وقت ضرور واجب ہو جاتا ہے یعنی جس وقت اس حکم کا کوئی مقتضی پیدا ہوتا ہے اور پھر اس علت کے منتقل ہوتے ہی کسی دوسرے حکم کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور یہ نسخ ہرگز نہیں ہے' کیونکہ نسخ کہتے ہیں حکم کو اس طرح زائل کر دینا اور مٹا دینا کہ پھر اس کی تعمیل اور بجا آوری جائز ہی نہ رہے۔

مسئلہ پنجم: بعض علماء مفسرین نے بیان کیا ہے کہ ناسخ اور منسوخ کے اعتبار سے قرآن مجید کی سورتوں کی کئی قسمیں ہیں' پہلی قسم وہ سورتیں ہیں جن میں ناسخ اور منسوخ کا وجود نہیں ہے اور ایسی سورتیں کل تینتالیس (۴۳) ہیں' جن کے اسماء حسب ذیل ہیں:

فاتحہ' یوسف' یٰسین' الحجرات' الرحمٰن' الحدید' الصف' الجمعہ' التحریم' الملک' الحاقہ' الجن' المرسلات' عم' النازعات' الانفطار اور اس کے بعد کی تین سورتیں۔

اور الفجر' پھر اس کے بعد سے التین' العصر اور الکافرون تین سورتوں کے علاوہ ختم قرآن تک تمام سورتوں میں کوئی ناسخ اور منسوخ موجود نہیں ہے۔

قسم دوم: قرآن پاک کی وہ سورتیں جن میں ناسخ اور منسوخ موجود ہیں اور ایسی کل پچیس (۲۵) سورتیں ہیں' جن کے نام درج ذیل ہیں:

البقرہ اور اس کے بعد مسلسل تین سورتیں' الحج' النور اور اس کے بعد کی دو سورتیں' الاحزاب' سبا' المومن' شوریٰ' الذاریات' الطور' الواقعہ' المجادلہ' المزمل' المدثر' التکویر اور العصر۔

قسم سوم: وہ سورتیں جن میں فقط ناسخ آیات ہیں اور منسوخ کا وجود نہیں وہ کل چھ سورتیں ہیں' جن کے نام الفتح' الحشر' المنافقون' التغابن' الطلاق اور الاعلیٰ ہیں۔

قسم چہارم: وہ قسم ہے جن سورتوں میں صرف بعض منسوخ آیات پائی جاتی ہیں اور ناسخ موجود نہیں ہیں اور وہ باقی چالیس (۴۰) سورتیں ہیں اور یہ اس بناء پر ہے۔ جب منساء اور مخصوص کو بھی منسوخ کی قسم سے شمار کیا جائے۔

مسئلہ ششم: قرآن مجید میں نسخ کی تین قسمیں ہیں۔

قسم اوّل: وہ نسخ ہے جس میں تلاوت اور اس کا حکم دونوں ایک ساتھ منسوخ ہو گئے ہیں۔

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

''کان فیما انزل عشر رضعات معلومات فنسخن بخمس معلومات فتوفی رسول اللہ ﷺ وھن مما یقراء من القرآن رواہ الشیخان''۔

محدثین نے اس روایت میں کلام کیا ہے کیونکہ اس میں 'وھن مما یقراء من القرآن'' کے قول سے بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تلاوت منسوخ نہیں ہوئی تھی' صرف حکم منسوخ ہوا تھا' جب کہ صورت واقعہ اس کے برعکس ہے۔

چنانچہ اس اعتراض کا جواب یہ دیا گیا کہ ام المومنین رضی اللہ عنہا کی مراد 'فتوفی'' سے یہ ہے کہ حضور ﷺ کا وقت وصال قریب آ گیا تھا' یا یہ کہ تلاوت بھی منسوخ ہو گئی تھی' مگر تمام صحابہ کرام تک اس کی خبر نہ پہنچی اور وہ لاعلمی کی وجہ سے اس کی تلاوت کرتے رہے اور انہیں حضور ﷺ کے وصال کے بعد اس کی تلاوت کے بھی منسوخ ہونے کا علم ہوا۔

قسم دوم: وہ ہے جس کا حکم منسوخ ہو گیا ہے' مگر اس کی تلاوت باقی ہے' منسوخ کی اس قسم کے بیان میں علماء نے کئی کتابیں تالیف کی ہیں' درحقیقت اس نوعیت کی آیات بہت کم پائی گئی ہے اور گو کہ بعض علماء نے اس کے ضمن میں بہ کثرت آیات گنوا دی ہیں' لیکن محققین نے (جیسے کہ قاضی ابوبکر ابن عربی ہیں) اس کو بڑی شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا اور مسئلہ کی اصل صورتِ حال کو واضح کرتے ہوئے پایۂ ثبوت تک پہنچایا ہے۔

چنانچہ ان آیات میں سے ایک سورہ بقرہ کی آیت ''كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ'' (البقرہ:۱۸۰) بھی ہے'' تم پر فرض کیا گیا جب تم میں کسی کو موت آئے''۔ اس آیت کی نسبت کہا گیا ہے کہ یہ آیت میراث سے منسوخ ہو گئی ہے اور دوسرا قول یہ ہے کہ نہیں بلکہ اس آیت کا ناسخ حدیث ''الا لا وصیۃ لوارث''، ''سنو! وارث کے لیے وصیت نہیں'' سے ہوا ہے۔

اور تیسرا قول یہ ہے کہ اس کا ناسخ اجماع امت ہے' جیسا کہ ابن العربی نے بیان کیا ہے۔

(۲) آیت ''وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ'' (البقرہ:۱۸۴) ''اور جنہیں اس کی طاقت نہ ہو وہ بدلہ دیں'' کو اللہ تعالیٰ کے قول ''فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ'' (البقرہ:۱۸۵) ''تو تم میں جو کوئی یہ مہینہ پائے تو وہ ضرور اس کے روزے رکھے'' نے منسوخ کر دیا ہے' دوسری رائے یہ ہے کہ نہیں یہ آیت محکم ہے اور اس میں ''لا'' نافیہ مقدر ہے یعنی اصل میں ''لایطیقونہ'' ہے۔

(۳) اللہ تعالیٰ کا قول ''أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ'' (البقرہ:۱۸۷) ''روزوں کی راتوں میں اپنی عورتوں کے پاس جانا تمہارے لیے حلال ہو' ناسخ ہے اور اس نے آیت ''كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ'' (البقرہ:۱۸۳) ''جیسے اگلوں پر فرض ہوئے تھے'' کو منسوخ کر دیا ہے' کیونکہ اس کا مقتضی یہ ہے کہ جس طرح سابقہ امتوں پر روزوں میں سو جانے کے بعد دوبارہ رات میں اٹھ کر کھانا پینا اور ہم بستری کرنا حرام تھا' ویسے ہی اس امت مصطفویہ پر بھی یہ چیزیں حرام ہیں' اس بات کو ابن العربی نے بیان کیا ہے اور ساتھ ہی ابن العربی نے ایک قول یہ بھی نقل کیا ہے کہ یہ آیت حدیث سے منسوخ ہوئی

ہے۔

(۴) اور آیت ''يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ'' (البقرہ:۲۱۷) ''تم سے پوچھتے ہیں شہر حرام کے بارے'' منسوخ ہے' اس کی تنسیخ اللہ تعالیٰ کے ارشاد'' وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً'' (التوبہ:۳۶) ''اور جنگ کرو تمام مشرکوں سے'' سے ہوئی ہے' یہ قول ابن جریر نے عطاء بن میسرہ سے روایت کیا ہے۔

(۵) اور ''وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ'' تا قولہ تعالیٰ ''مَتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ'' (البقرہ:۲۴۰) ''اور جو تم میں مریں اور بیبیاں چھوڑ جائیں وہ اپنی عورتوں کے لیے وصیت کر جائیں سال بھر تک نان نفقہ کی'' کی آیت منسوخ ہے' اس کی ناسخ آیت ''اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا'' (البقرہ:۲۳۴) ''چار ماہ دس دن'' ہے اور وصیت کی آیت' آیت میراث سے منسوخ ہو گئی ہے اور ''سکنی'' ایک گروہ کے نزدیک ثابت ہے اور بعض دوسرے حضرات اس کو منسوخ مانتے ہیں اور حدیث'' ولا سکنی '' کو اس کا ناسخ قرار دیتے ہیں۔

(۶) ارشاد ربانی ''وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ'' (البقرہ:۲۸۴) ''اور اگر تم ظاہر کرو جو کچھ تمہارے جی میں آئے یا چھپاؤ اللہ تم سے اس کا حساب لے گا'' اس کے بعد والے قول باری تعالیٰ ''لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا'' (البقرہ:۲۸۶) ''اللہ کسی جان پر بوجھ نہیں ڈالتا مگر اس کی طاقت بھر'' سے منسوخ ہے۔

(۷) سورہ آل عمران میں سے آیت ''اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ'' (آل عمران:۱۰۲) ''اللہ سے ڈرو جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے'' کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ اس کو ''فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ'' (التغابن:۱۶) ''تو اللہ سے ڈرو جہاں تک ہو سکے'' نے منسوخ کر دیا ہے اور لیکن یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ منسوخ نہیں بلکہ محکم ہے۔

سورہ آل عمران میں آیت مذکورہ بالا کے سوا اور کوئی ایسی آیت نہیں ہے' جس کے بارے میں نسخ کا دعویٰ کرنا صحیح ہو۔

(۸) سورہ الاحزاب میں سے ''لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ'' (الاحزاب:۵۲) ''ان کے بعد اور عورتیں تمہارے لیے حلال نہیں'' کا حکم منسوخ ہے' اس سورہ الاحزاب کو'' اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ'' (الاحزاب:۵۰) ''ہم نے تمہارے لیے حلال فرمائیں تمہاری بیبیاں'' کے

قول خداوندی نے منسوخ کر دیا ہے۔

(۹) اور سورہ مجادلہ کی آیت ''اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا'' (المجادلہ:۱۲) ''جب تم رسول سے تنہائی میں کوئی بات کرنا چاہو تو آگے پیش کرو'' اپنے مابعد آنے والی آیت سے منسوخ ہو گئی ہے۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ کسی آیت کا حکم اٹھا لینے اور اس کی تلاوت کو باقی رکھنے میں کیا حکمت ہے؟

تو اس کا جواب دو طریقوں سے دیا جا سکتا ہے:

پہلا طریقہ یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ قرآن مجید کی تلاوت جس طرح اس سے حکم معلوم کر کے اس پر عمل کرنے کی غرض سے کی جاتی ہے' اسی طرح اس کے کلام الٰہی ہونے کی وجہ سے اس کی تلاوت کر کے محض ثواب حاصل کرنا بھی مقصود ہوتا ہے' لہٰذا اس حکمت کی بناء پر تلاوت کو باقی رکھا گیا ہے۔

اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ نسخ غالب طور پر تخفیف کے لیے ہوتا ہے اور تلاوت کو اس سبب سے باقی رکھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور نوازشوں کی یاد دلاتی رہے کہ بندو! یاد کرو اللہ تعالیٰ نے تم پر اپنا لطف و کرم کر کے تمہیں محنتوں اور مشقتوں سے نجات دی ہے۔

قرآن پاک میں جس قدر آیات دورِ جاہلیت کے قوانین' ہم سے پہلی شریعتوں کے احکام یا اسلام کے ابتدائی دور کے احکام کو منسوخ کرنے کے لیے وارد ہوئی ہیں' وہ بھی بہت کم تعداد میں ہیں اور اس کی مثال ہے: آیت قبلہ سے بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرنے کا منسوخ ہونا' اور رمضان کے روزوں سے عاشورہ کے روزوں کا منسوخ ہونا۔

قسم سوم: منسوخ کی تیسری قسم یہ ہے کہ صرف تلاوت منسوخ ہوئی ہے مگر حکم باقی ہے یعنی نسخ کا تعلق محض تلاوت سے ہے' چنانچہ اس کا قرآن ہونا ثابت نہ ہو گا اور اس کی تلاوت کرنے سے قرآن پڑھنے کا ثواب نہیں ملے گا' باقی رہا اس کا حکم تو وہ باقی رکھا گیا ہے اور اس پر عمل کیا جائے گا' اس تیسری قسم کے منسوخ کی مثالیں بہ کثرت ملتی ہیں۔

ابوعبید نے زر ابن حبش سے روایت کیا' وہ بیان کرتے ہیں کہ مجھ سے حضرت ابی ابن

کعب رضی اللہ عنہما نے دریافت فرمایا کہ تم ''سورہ الاحزاب'' کی کتنی آیتیں شمار کرتے ہو؟

زر ابن حبش کہتے ہیں: میں نے جواب دیا: بہتر یا تہتر آیتیں۔

ابی بن کعب فرمانے لگے: یہ سورت (سورہ الاحزاب) سورہ بقرہ کے برابر تھی اور ہم اس میں آیت رجم کی قراءت کیا کرتے تھے۔

زر ابن حبش کہتے ہیں: میں نے پوچھا کہ آیت رجم کیا تھی؟

حضرت ابی ابن کعب نے فرمایا:

''اذا زنا الشیخ والشیخة فارجموها البتته نکالا من اللہ واللہ عزیز حکیم''، ''شادی شدہ مرد وعورت جب زنا کرلیں تو انہیں سنگسار کرو اللہ کی طرف سے سزا ہے اور اللہ غالب حکمت والا ہے''۔

ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

ایک سورت سورہ براۃ کے مثل نازل ہوئی تھی، مگر بعد میں وہ اٹھالی گئی اور اس کا صرف یہ اتنا حصہ محفوظ رکھا گیا ''ان اللہ سیوید ھذا الدین باقوام لا خلاق لھم ولو ان لابن آدم وادیین من مال لتمنی وادیا ثالثا ولا یملا جوف ابن آدم الا التراب ویتوب اللہ علی من تاب'' اگر یہ سوال کیا جائے کہ منسوخ کی اس قسم یعنی حکم کو باقی رکھتے ہوئے تلاوت کو منسوخ کردینے میں کیا حکمت ہے؟

علماء نے اس کی حکمت یہ بیان کی ہے کہ اس طریقہ سے امت مصطفویہ علی صاحبہ التحیۃ والثناء کی اطاعت شعاری اور فرماں برداری کا اظہار مقصود تھا، کہ کس طرح اس امت کے لوگ صرف ظن کی بنیاد پر بغیر کوئی دلیل اور تفصیل طلب کیے اللہ تعالیٰ کی راہ میں جان دینے کے لیے منتظر رہتے ہیں اور اپنا مال جان اور سب کچھ اس کے راستے میں قربان کردینے کے لیے اسی طرح تیار ہوتے ہیں، جس طرح حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام اپنے لخت جگر، نور چشم کو خواب میں اشارہ پاکر فوراً ذبح اور قربان کرنے کو تیار ہوگئے تھے حالانکہ خواب وحی کا ادنیٰ درجہ ہے۔

متفرق فوائد

بعض علماء کا قول ہے کہ قرآن پاک میں کوئی ناسخ ایسا نہیں کہ منسوخ ترتیب میں اس

سے پہلے نہ آیا ہو، مگر دو آیتیں اس قاعدہ سے مستثنیٰ ہیں، ایک سورہ بقرہ کی آیت عدیت اور دوسری آیت ''لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَاءُ'' (الاحزاب:۵۲) ''اور بیبیاں تمہارے لیے حلال نہیں'' ہے۔

اور بعض علماء نے اسی طرح کی مثال میں تیسری آیت سورہ حشر کی وہ آیت پیش کی ہے جو ''فیئ'' کے بیان میں وارد ہوئی ہے اور یہ اس شخص کی رائے کے مطابق ہوگی جو آیت حشر کو آیت الانفال ''وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ'' (الانفال:۴۱) ''اور جان لو کہ جو کچھ غنیمت لو'' سے منسوخ مانتا ہے۔

ابن العربی کا قول ہے کہ قرآن مجید میں جہاں بھی کہیں کافروں سے درگزر کرنے اور انہیں معاف کردینے کا ذکر آیا، وہ سب احکام آیت سیف کے نزول سے منسوخ ہوگئے ہیں اور آیت سیف یہ ہے:

''فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ'' (التوبہ:۵) ''پھر جب حرمت کے مہینے نکل جائیں تو مشرکوں کو مارو''۔

اس مذکورہ بالا آیت کریمہ نے ایک سو چوبیس آیات منسوخ کی ہیں، پھر اس کے آخری حصہ نے اس کے اوّل حصہ کو بھی منسوخ کردیا اور اس آیت میں جو ایک اہم بات تھی، وہ پہلے ذکر ہوچکی ہے۔

ابن العربی نے ایک اور بات یہ بیان کی ہے کہ آیت ''خُذِ الْعَفْوَ'' (الاعراف:۱۹۹) ''معاف کرنا اختیار کرو'' منسوخ کی ایک عجیب وغریب مثال ہے، کیونکہ اس کا مذکورہ بالا اوّل حصہ اور اخیر حصہ یعنی ''وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ'' (الاعراف:۱۹۹) ''اور جاہلوں سے منہ پھیر لو'' یہ دونوں منسوخ ہیں، مگر اس کا وسط یعنی ''وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ'' (الاعراف:۱۹۹) ''اور بھلائی کا حکم دو''، محکم ہے۔

اور اسی کی مثل ایک اور آیت بھی عجیب وغریب ہے، جس کا اوّل حصہ منسوخ اور آخری حصہ ناسخ ہے اور اس آیت کی اور کوئی نظیر نہیں ملتی، صرف ایک ہی مثال ہے، جو اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے:

''عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ'' (المائدہ:۱۰۵) ''تم اپنی فکر

رکھو تمہارا کچھ نہ بگاڑے گا جو گمراہ ہوا جب کہ تم راہ پر ہو" یعنی جب کہ تم نے نیک کاموں کا حکم دینے اور بُری باتوں سے منع کرنے کے ساتھ ہدایت پائی تو پھر کسی اور شخص کا گمراہ ہونا تمہارے لیے کچھ بھی مضر نہیں ہو سکتا۔ آیت کا آخری حصہ شروع والے حصہ یعنی "عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ"، "تم اپنی فکر رکھو" کا ناسخ ہے۔

تنبیہ: ابن الحصار کا قول ہے کہ نسخ میں یہ امر ضروری ہے کہ محض کسی ایسی صریح نقل کی طرف رجوع کیا جائے جو رسول اللہ ﷺ یا کسی صحابی رضی اللہ عنہ سے منقول ہو کہ فلاں آیت نے فلاں آیت کو منسوخ کیا ہے۔

مزید فرماتے ہیں کہ اور کبھی کوئی قطعی اور یقینی تعارض پائے جانے کی صورت میں تاریخ کا علم ہوتے ہوئے بھی نسخ کا حکم لگا دیا جاتا ہے۔ تاکہ متقدم اور متاخر کا علم اور معرفت ہو سکے لیکن نسخ کے بارے میں عام مفسرین کا قول بلکہ مجتہدین کا اجتہاد بھی بغیر صحیح نقل اور بلا کسی واضح معارضہ کا قابل اعتماد نہیں ہوگا' کیونکہ نسخ کسی ایسے حکم کے اٹھا لیے جانے اور اس طرح ایک اور حکم کے ثابت کرنے کو متضمن ہوتا ہے' جس کا تقرر حضور نبی کریم ﷺ کے عہد مبارک میں ہو چکا ہے اور اس میں نقل اور تاریخ ہی پر اعتماد کیا جا سکتا ہے' رائے اور قیاس و اجتہاد لائق اعتماد نہیں ہوگا۔

متشابہ اور بہ ظاہر متضاد و متناقض آیات کا بیان

اللہ تعالیٰ کا کلام اس عیب سے پاک ہے کہ اس میں اختلاف اور تناقض پایا جائے' اس بارے میں خود اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ○ (النساء:۸۲)

اگر یہ قرآن پاک اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ نہ ہوتا تو لوگ اس میں بہت سا اختلاف پاتے ○

لیکن مبتدی شخص کو بعض اوقات اس میں اختلاف کا وہم سا پیش آتا ہے' حالانکہ حقیقت میں اس کے اندر کوئی اختلاف نہیں ہوتا' لہٰذا حاجت پڑی کہ اس وہم کا ازالہ کیا جائے اور اس سلسلہ میں تحقیقی کام ہو' جس طرح باہم (بہ ظاہر) متعارض اور متناقض احادیث میں جمع اور تطبیق

پیدا کرنے کے لیے باقاعدہ اس موضوع پر کتابیں تصنیف کی گئی ہیں۔ چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس موضوع پر کچھ کلام بھی منقول ہے اور بعض مواقع پر انہوں نے مشکلات قرآن کی نسبت توقف بھی فرمایا ہے۔ عبدالرزاق اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں: معمر نے ایک شخص کے حوالہ سے خبر دی ہے کہ منہال ابن عمرو نے سعید ابن جبیر سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ ایک شخص نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: میں قرآن پاک میں بعض ایسی چیزیں پاتا ہوں' جو مجھے آپس میں متعارض معلوم ہوتی ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ کیا ہیں؟ کیا کوئی شک پڑ گیا ہے؟ سائل نے عرض کیا: شک کی کوئی بات نہیں' لیکن اختلاف و تعارض کا وہم گزرتا ہے' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

اچھا تو پھر بیان کرو تم کو قرآن میں کہاں اختلاف نظر آتا ہے' سائل کہنے لگا: سنیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: (میں اللہ تعالیٰ کو یہ فرماتے ہوئے سنتا ہوں) "ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ" (الانعام:۲۳) "پھر ان کا کوئی بہانا نہ ہوگا یہ کہ وہ کہیں گے: ہمیں اپنے پروردگار اللہ کی قسم کہ ہم مشرک نہ تھے"۔

اور فرمایا: "وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا" (النساء:۴۲) "اور اللہ سے وہ کوئی بات نہ چھپا سکیں گے"۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے کتمان کیا تھا اور بات چھپائی تھی' اسی طرح ایک مقام پر اللہ تعالیٰ کو قرآن میں یہ فرماتے ہوئے سنتا ہوں:

"فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ" (المومنون:۱۰۱) "تو ان کے درمیان اس دن رشتے (باقی) نہ رہیں گے اور نہ ہی ایک دوسرے کا حال پوچھ سکیں گے" اور پھر دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ○" (الصّٰفّٰت:۲۷) "اور وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر آپس میں ایک دوسرے کا حال پوچھیں گے" اور اللہ تعالیٰ کا قول ہے: "قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ" (حٰمٓ السجدہ:۹) "تا قوله تعالٰی: طائبین"، "فرمائے کیا یقیناً تم ضرور کفر کرتے ہو اس (اللہ) کے ساتھ' جس نے دو دن میں زمین بنائی"۔ پھر دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

"اَمِ السَّمَآءُ بَنٰهَا" (النزعات:۲۷) "یا آسمانوں کا بنانا" اور فرمایا: "وَالْاَرْضَ بَعْدَ

ذٰلِكَ دَحٰىهَا '' (النزعت: ۳۰) '' اور زمین اس کے بعد پھیلائی''۔ اور میں یہ آیت بھی لیتا ہوں ''کان اللّٰہ'' حالانکہ اللہ تعالیٰ کی شان تو ''کان اللّٰہ'' فرمانے سے بلند و بالا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس شخص کی ساری گفتگو کے بعد ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ کا فرمان '' ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ '' (الانعام: ۲۳) '' پھر ان کا کوئی بہانا نہ ہوگا مگر یہ کہ وہ کہیں گے: ہمیں اپنے پروردگار اللہ کی قسم ہے کہ ہم مشرک نہ تھے'' بالکل بجا ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ قیامت کے دن جب مشرکین دیکھیں گے کہ اللہ تعالیٰ اہل اسلام کے تمام گناہوں کو بخش رہا ہے' صرف شرک کو نہیں بخشتا' شرک کے علاوہ کسی بھی گناہ کو بخش دینا اللہ تعالیٰ کے لیے گراں نہیں' تو وہ یہ منظر رحمت دیکھ کر کہیں گے کہ یا اللہ ہم نے شرک نہیں کیا تھا یعنی وہ مغفرت کی امید میں جان بوجھ کر اپنے شرک کا انکاری ہو جائیں گے اور کہیں گے: '' وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ '' (الانعام: ۲۳) '' اے ہمارے رب! تیری ذات کی قسم! ہم شرک کرنے والے نہیں تھے''۔

فختم اللّٰه علی افواھم وتکلمت ایدیھم وارجلھم بما کانوا یعملون.

پس اللہ ان کے مونہوں پر مہر لگا دے گا اور ان کے ہاتھ پاؤں کلام کرنے لگیں گے کہ وہ کیا کرتوتیں کرتے تھے۔

تو اس موقع پر کافروں اور منکرین رسالت کے دل یہ چاہیں گے کہ کاش! ان کو زمین نگل جاتی اور وہ اللہ تعالیٰ سے کچھ بھی تو چھپا نہیں سکیں گے۔

'' يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا '' (النساء: ۴۲) '' تمنا کریں گے وہ جنہوں نے کفر کیا اور رسول کی نافرمانی کی' کاش! انہیں مٹی میں دبا کر برابر کر دیا جائے اور کوئی بات اللہ سے نہ چھپا سکیں گے'' اور اللہ تعالیٰ کا قول '' فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ O '' (المؤمنون: ۱۰۱) '' تو نہ ان میں رشتے رہیں گے اور نہ ایک دوسرے کی بات پوچھیں گے''۔ تو اس کا بیان اور سیاق کلام یہ ہے:

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ

اور صور پھونکا جائے گا تو بے ہوش ہو جائیں گے جو آسمانوں میں ہیں اور جتنے زمینوں میں مگر جسے اللہ چاہے' پھر وہ دوبارہ پھونکا جائے

قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ (الزمر: ۶۸)

گا' جبھی وہ دیکھتے ہوئے کھڑے ہو جائیں گے۔

وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ. (الصّٰفّٰت: ۲۷)

اور ان میں ایک نے دوسرے کی طرف منہ کیا آپس میں پوچھتے ہوئے۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: '' خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ '' (حم السجدہ: ۹) جس نے دو دن میں زمین بنائی' اس کے بارے میں معلوم ہونا چاہیے کہ زمین آسمان سے پہلے پیدا کی گئی اور آسمان اس وقت دھواں تھا' پھر اللہ تعالیٰ کے آسمانوں کے سات طبق دو دن میں' زمین کی تخلیق کے بعد بنائے اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: '' وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا O '' (النزعات: ۳۰) '' اور زمین اس کے بعد پھیلائی''۔

اس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس نے زمین میں پہاڑ' دریا' درخت اور سمندر بنائے اور ارشاد ربانی '' کان اللّٰہ '' کے متعلق یہ امر ملحوظ رہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا' وہ اسی طرح ازل سے عزیز' حکیم اور قدیر ہے اور یوں ہی ہمیشہ رہے گا۔

پس قرآن مجید میں جو کچھ تجھے اختلاف نظر آتا ہے' وہ اختلاف ایسا ہے جیسا کہ میں نے بتایا ہے اور اللہ تعالیٰ نے قرآن میں جو کچھ بھی نازل فرمایا' اس کی مراد واضح ہے اور حق صواب ہے' لیکن قلت تدبر کی وجہ سے چونکہ اکثر لوگ اس کی حقیقی مراد تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے اور انہیں اس میں تعارض اور اختلاف نظر آنے لگتا ہے۔ جب کہ حقیقت میں اس میں کوئی تعارض نہیں ہوتا' حاکم نے مستدرک میں اس روایت کو پوری تفصیل سے ذکر کیا ہے اور اس کو صحیح قرار دیا ہے' اس حدیث کی اصل صحیح (صحیحین) میں بھی موجود ہے۔ علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ اپنی شرح میں لکھتے ہیں:

اس حدیث پاک کا ماحصل چار باتوں کے متعلق سوال ہے:

اوّل: قیامت کے دن لوگوں کے باہم سوال کرنے کی نفی اور اس کا ثبوت۔

دوم: مشرکین کا اپنے حال کو چھپانا اور پھر اس کو ظاہر کرنا۔

سوم: یہ سوال کہ آسمان کی تخلیق پہلے ہوئی یا زمین کی؟

چہارم: لفظ '' کان '' جو گزشتہ زمانہ پر دلالت کرتا ہے' اس کا استعمال اللہ کے لیے کیونکر درست

ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ تو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا؟

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے پہلے سوال کا جو جواب دیا، اس کا حاصل یہ ہے کہ دوسری مرتبہ صور پھونکے جانے سے قبل لوگوں کے سوال کرنے کی نفی ہے اور اس کے بعد دوبارہ صور جب پھونکا جائے گا تو اس کے بعد لوگ باہم سوال وغیرہ کریں گے۔

اور دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ وہ (مشرک) اپنی زبانوں سے (گناہوں کو) چھپائیں گے اور ان کے ہاتھ اور دیگر اعضائے بدن قدرت خداوندی سے گفتگو کرنے لگیں گے اور تیسرے سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے زمین کو دو دن میں پیدا کیا لیکن ابھی اس کو بچھایا نہیں، پھر دو دن میں آسمان بنائے اور ان کو ہموار کیا، پھر اس کے بعد زمین کو بچھایا اور اس میں پہاڑوں وغیرہ کے لنگر ڈالے، اس میں بھی دو دن لگے، اس طرح زمین کو تخلیق کرنے میں چار دن صرف ہوئے اور سوال چہارم کا جواب یہ ہے کہ لفظ ''کان'' اگرچہ زمانہ ماضی پر دلالت کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ مگر اس کو انقطاع لازم نہیں ہے بلکہ یہ دوام اور ہمیشگی کے معنی کے لیے بھی آتا ہے اور مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ ایسا ہی رہے گا۔

قرآن مجید کے مشکل اور متشابہ کا ایک مقام کہ جس میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی توقف فرمایا ہے۔

ابوعبید اپنی سند کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ کسی شخص نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اللہ تعالیٰ کا قول ''فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُهٗ اَلْفَ سَنَةٍ'' (السجدہ:۵) ''اس دن میں جس کی مقدار ایک ہزار سال ہے'' اور قول باری تعالیٰ ''فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِیْنَ اَلْفَ سَنَةٍ'' (المعارج:۴) ''اس دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار برس ہے'' کا مطلب دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا: وہ دونوں دو دن ہیں، جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا اور اللہ تعالیٰ ان کو خوب جانتا ہے۔

اسباب الاختلاف کا بیان

علامہ زرکشی نے ''البرہان'' میں اختلاف آیات کے کئی اسباب بیان کیے ہیں، ان میں

سے ایک سبب یہ ہے:

کہ مخبر بہ (جس کی خبر دی گئی) کا وقوع مختلف احوال اور متعدد اطوار پر ہوا ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے بارے میں ایک جگہ ارشاد فرماتا ہے: ''مِنْ تُرَابٍ'' (آل عمران:۵۹) ''مٹی سے'' اور دوسری جگہ فرمایا: ''مِنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ'' (الحجر:۳۳) ''جو سیاہ بودار گارے سے تھی'' اور کہیں ''مِنْ طِیْنٍ لَّازِبٍ'' (الصّٰفّٰت:۱۱) ''لیس دار مٹی سے'' اور ایک جگہ فرمایا: ''مِنْ صَلْصَالٍ کَالْفَخَّارِ'' (الرحمٰن:۱۴) ''ٹھیکری کی طرح بجتی سوکھی مٹی سے''، پس یہ الفاظ بھی مختلف ہیں اور ان کے معانی بھی مختلف صورتیں رکھتے ہیں کیونکہ لفظ ''صلصال'' ''حما'' سے الگ ایک چیز ہے اور ''حما'' اور ''تراب'' بھی ایک دوسرے کے غیر غیر ہیں، مگر ان سب کی اصل ایک ہے اور وہ جوہر اور اصل تراب (مٹی) ہے، درجہ بدرجہ یہ سب حالتیں ہوتی گئیں۔

دوسرا سبب: موضع کا اختلاف ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ''وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْئُوْلُوْنَ'' (الصّٰفّٰت:۲۴) ''اور (ذرا) انہیں ٹھہراؤ بے شک ان سے پوچھا جائے گا''۔

اور قول باری تعالیٰ ہے:

''فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِیْنَ اُرْسِلَ اِلَیْهِمْ وَلَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِیْنَ'' (الاعراف:۶) ''تو بے شک ہم ان لوگوں سے ضرور پوچھیں گے، جن کی طرف رسول بھیجے گئے اور بے شک ہم رسولوں سے ضرور پوچھیں گے''۔

باوجود اس کے کہ اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''فَیَوْمَئِذٍ لَّا یُسْئَلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖۤ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ'' (الرحمٰن:۳۹) ''تو اس دن کسی گنہگار کے گناہوں کے بارے میں (تحقیق کے لیے) کسی انسان اور جن سے نہ پوچھا جائے گا''۔

علامہ حلیمی رحمۃ اللہ تعالیٰ بیان کرتے ہیں:

کہ ان مقامات پر پہلی آیت کو توحید اور تصدیق انبیاء کرام علیہم السلام کے سوال پر محمول کیا جائے گا۔

اور دوسری آیت کو محمول کیا جائے گا ان اُمور کے بارے سوال پر جو کہ شرائع اور احکام کے بارے میں ہوں گے، جن کو اقرار نبوت مستلزم ہے اور بعض علماء نے دوسری آیت کو مقامات

کے مختلف ہونے پر محمول کیا ہے۔ کیونکہ قیامت میں مختلف مقامات ہوں گے کہ ان میں سے کسی مقام پر لوگوں سے سوال ہوگا اور کسی مقام پر نہیں ہوگا۔

اور ایک قول یہ بھی ہے کہ مثبت سوال شرم دلانے اور ڈانٹ ڈپٹ کے لیے ہوگا اور منفی' عذر خواہی اور بیان حاجت کے لیے ہوگا۔

تیسرا سبب: دو ذاتوں کا فعل' فعل کی دو مختلف جہتوں کے لحاظ سے مختلف ہوتا ہے' جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: ''فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ'' (الانفال:۱۷) ''(تو اے مسلمانو!) تم نے انہیں قتل نہیں کیا لیکن اللہ نے انہیں قتل کیا ہے''۔

اور قول باری تعالیٰ ''وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى'' (الانفال:۱۷) ''اور (اے محبوب!) آپ نے (خاک) نہیں پھینکی' جس وقت آپ نے پھینکی لیکن اللہ تعالیٰ نے پھینکی''۔

کہ آیتوں میں قتل کی نسبت کافروں کی طرف اور رمی یعنی پھینکنے کی اضافت رسول کریم ﷺ کی طرف کی گئی ہے' کسب مباشرت اور تاثیر ہر دو لحاظ سے اور پھر کفار اور رسول کریم ﷺ دونوں سے تاثیر کے اعتبار سے ان افعال کی نفی کر دی ہے۔

چوتھا سبب: یہ ہے کہ دو باتیں حقیقت و مجاز میں مختلف ہوں' جیسے اس آیت میں ہے: ''وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى'' (الحج:۲) ''اور تو دیکھے گا کہ لوگ نشہ میں ہیں اور وہ نشہ میں نہ ہوں گے''۔

یعنی قیامت کے ہولناک احوال کی وجہ سے ان کو مجازاً نشہ میں چور کہا گیا ہے اور حقیقت میں شراب کے نشہ میں چور نہیں ہوں گے۔

پانچواں سبب: وہ اختلاف ہے جو کہ دو اعتبار سے ہو' جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ'' (الرعد:۲۹) ''یہ وہ لوگ (ہیں) جو ایمان لائے اور ان کے دل اللہ کے ذکر سے مطمئن ہوتے ہیں' اسی کے ساتھ یہ ارشاد بھی ہے: ''اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ'' (الانفال:۲) ''ایمان والے وہی ہیں کہ جب اللہ یاد کیا جائے تو ان کے دل ڈر جائیں' ان دونوں آیت کو دیکھنے سے خیال ہوتا ہے کہ ''وجل'' ڈرنا' طمانیت (سکون قلب) کے خلاف ہے' اس کا جواب یہ ہے کہ طمانیت اور تسکین قلب معرفت توحید کے ساتھ انشراح صدر سے حاصل ہوتی ہے اور ''وجل'' ''ڈر'' لغزش کے اندیشہ

کے وقت راہِ ہدایت سے بھٹک جانے کے خیال سے پیدا ہوتا ہے۔

اور قلوب لرز جاتے ہیں اور ایک آیت میں تو یہ دونوں باتیں جمع ہو گئی ہیں' وہ آیت کریمہ یہ ہے: ''تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ'' (الزمر:۲۳) ''اس سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں' ان لوگوں کے جسموں پر جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں پھر ان کی کھالیں اور ان کے دل نرم ہو جاتے ہیں اللہ کے ذکر کی طرف''۔ اسی طرح قول خداوندی: ''وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا'' (الانعام:۲۱) ''اور اس سے بڑھ کر ظالم کون جس نے اللہ پر جھوٹ باندھا'' اور ''فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَبَ عَلَى اللّٰهِ'' (الزمر:۳۲) ''تو اس سے بڑھ کر ظالم کون جو اللہ پر جھوٹ باندھے'' کو اللہ تعالیٰ کے قول ''وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ'' (البقرہ:۱۱۴) ''اور اس سے بڑھ کر ظالم کون جو اللہ کی مسجدوں سے روکے'' اور قول باری تعالیٰ ''وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا وَنَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ'' (الکہف:۵۷) ''اور اس سے بڑھ کر ظالم کون جسے اس کے رب کی آیتیں یاد دلائی جاتی ہے تو وہ ان سے منہ پھیر لے اور اس کے ہاتھ جو آگے بھیج چکے اسے بھول جائے'' وغیرہ آیتوں کے ساتھ تقابل کر کے دیکھا جائے تو اشکال پیدا ہوتا ہے' وہ یہ کہ اس جگہ استفہام انکاری مراد ہے اور معنی یہ ہوئے ''لا احد اظلم'' پس یہ جملہ معنی کے لحاظ سے جملہ خبریہ بنے گا اور جب خبریہ ہو اور آیات کو ان کے ظاہر پر لیا جائے تو ان کے اندر تناقض ہوگا' اس اشکال کا جواب کئی طریقوں سے دیا گیا ہے۔

ان جوابات میں سے ایک جواب یہ ہے کہ ہر مقام پر لفظ اپنے صلہ کے ساتھ مخصوص ہے' یعنی مقصد یہ ہے کہ منع کرنے والوں میں کوئی شخص اس سے بڑا ظالم نہیں' جو اللہ تعالیٰ کے ذکر سے مسجدوں میں منع کرنے والا ہو اور افتراء باندھنے والوں میں اس سے بڑھ کر کوئی برا نہیں' جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ تراشتے ہیں اور جس وقت ان میں صلات (صلہ کی جمع) کی خصوصیت کا لحاظ کیا جائے تو پھر یہ تناقض بھی خود رفع ہو جائے گا۔

قرآن مجید کی مطلق اور مقید آیات کا بیان

مطلق: وہ کلام ہے جو کسی قید کے بغیر ماہیت پر دلالت کرتا ہو اور مطلق کے ساتھ جب قید کا

بھی لحاظ ہو تو اس کا حکم وہی ہوتا ہے' جو عام کا خاص کے ساتھ ہوتا ہے' علماء بیان کرتے ہیں:

کہ اگر مطلق کی تقیید پر کوئی دلیل موجود ہو تو اس کو مقید کریں گے' ورنہ نہیں بلکہ مطلق کو اس کے اطلاق پر چھوڑ دیں گے اور مقید کو اس کی تقیید پر باقی رہنے دیا جائے گا' یہ اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں لغت عرب کے ساتھ خطاب فرمایا ہے' اس سلسلے میں ضابطہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے کسی چیز کا حکم صفت یا شرط کے ساتھ مقید کر کے دیا ہو اور پھر اس کے بعد ایک اور حکم مطلق طور پر وارد ہوا ہو تو اس صورت میں غور کیا جائے گا کہ آیا اس حکم مطلق کی کوئی ایسی اصل بھی ہے' جس کی طرف وہ راجع ہو سکے یا نہیں؟

اگر اس دوسرے مقید حکم کے سوا اس کی ایسی کوئی اصل نہیں ہے کہ جس کی طرف حکم مطلق کو پھیر سکیں' تو اب اسی قید کے ساتھ اس حکم مطلق کو مقید کرنا ضروری ہوگا اور اگر اس کی کوئی اور اصل اس حکم مقید کے علاوہ بھی ہو تو اس صورت میں حکم مطلق کو دو اصولوں میں سے ایک چھوڑ کر دوسرے کی طرف راجع کرنا افضل اور بہتر نہ ہوگا کیونکہ دونوں برابر ہیں۔ اوّل کی مثال رجعت' فراق اور وصیت پر گواہوں میں عدالت کا شرط قرار دینا ہے۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ'' (الطلاق:٢) ''اور اپنے دو ثقہ کو گواہ کرلو'' اور قول باری تعالیٰ ''شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِيْنَ الْوَصِيَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ'' (المائدہ:١٠٦) ''جب تم میں سے کسی کو موت آئے تو وصیت کے وقت تمہاری آپس کی گواہی (اس طرح ہو) کہ تم میں سے دو معتبر شخص ہوں''۔

اور بیع کے معاملات میں مطلق شہادت کا حکم وارد ہے۔

ارشاد خداوندی ہے:

''وَاَشْهِدُوْا اِذَا تَبَايَعْتُمْ'' (البقرہ:٢٨٢) ''اور گواہ بنالو جب خرید و فروخت کرو''۔

اور دوسری جگہ فرمایا: ''فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ'' (النساء:٦) ''پھر جب تم ان کے مال ان کے سپرد کرنے لگو تو ان پر گواہ بنالو''۔

بہر حال ان سب احکام مذکور میں گواہوں کے لیے شرط ہے کہ عادل ہوں' ایسے ہی کفارہ قتل میں مومن غلام آزاد کرنے کی شرط ہے جب کہ کفارہ یمین اور کفارہ ظہار میں مطلق حکم ہے اور وصف رقبہ میں مطلق اور مقید دونوں یکساں ہوں گے۔

اور اسی طرح آیت وضو میں ہاتھوں کو مرافق (کہنیوں) تک مقید کرنا اور تیمم میں مطلق رکھنا بھی اس کی مثال ہے۔ اور آیت ''وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ'' (البقرہ:٢١٧) ''اور تم میں سے جو مرتد ہو جائے اپنے دین سے' پھر وہ کافر ہونے کی صورت میں مر جائے'' میں اعمال کے اکارت جانے کو اسلام سے مرتد ہو کر بہ حالت کفر مر جانے کے ساتھ مقید کیا ہے' پھر دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ'' (المائدہ:٥) ''اور جس نے ایمان لانے سے انکار کیا تو بے شک اس کا عمل ضائع ہو گیا'' اس آیت میں اعمال کے ضائع ہونے اور رائیگاں جانے کو مطلق رکھا گیا ہے۔

اور سورہ الانعام میں خون کے حرام ہونے کو صفت مسفوح (بہنے) کے ساتھ مقید کیا گیا ہے اور دوسری جگہوں پر اس قید کے بغیر مطلق ذکر کیا ہے۔ چنانچہ امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ کا مذہب یہ ہے کہ تمام صورتوں میں مطلق کو مقید ہی پر محمول کرنا چاہیے' لیکن کچھ علماء اس قید کے قائل نہیں ہیں اور وہ ظہار اور یمین کے کفارہ میں کافر غلام کا آزاد کرنا بھی جائز قرار دیتے ہیں اور تیمم کے سلسلہ میں صرف دونوں کلائیوں تک مسح کو کافی قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ محض ردت (اسلام سے برگشتہ ہونا) ہی اعمال کے اکارت اور بیکار ہو جانے کا باعث ہے۔

قسم ثانی: یعنی مقید احکام کی مثال یہ ہے کہ کفارہ قتل اور کفارہ ظہار کے روزوں کو مسلسل رکھنے کی قید کے ساتھ مقید کیا گیا ہے اور تمتع کے روزوں میں تفریق کر کے رکھنے کی قید لگائی ہے اور کفارہ یمین اور قضاء رمضان میں مطلق حکم ہے یعنی ان کو متواتر اور متفرق دونوں طرح رکھنا جائز رہے گا۔

قرآن مجید کے منطوق اور مفہوم کا بیان

منطوق: وہ معنی جس پر لفظ کی دلالت میں محل نطق میں ہوتی ہے' پھر اگر لفظ ایسے معنی کا فائدہ دے کہ اس کے سوا اور معنی کا وہ لفظ احتمال ہی نہ رکھتا ہو تو اسے نص کہتے ہیں' جیسے اس کی مثال ہے:

''فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِى الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ''

(البقرہ:۱۹۶) ''پھر جسے قربانی کی قدرت نہ ہو تو اس پر حج کے دنوں میں تین دن کے روزے ہیں اور سات (روزے) جب تم واپس آؤ یہ پورے کرنے ہوں گے''۔ اور اگر وہ لفظ مذکورہ بالا معنی کے ساتھ دوسرے معنی کا بھی مرجوح اور کمزور سا احتمال رکھتا ہو تو اس کو ظاہر کہتے ہیں' مثلاً ''فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ'' (البقرہ:۱۷۳) ''اور جو ناچار ہو نہ یوں کہ خواہش سے کھائے اور نہ یوں کہ ضرورت سے آگے بڑھے'' اس لیے کہ باغی کا لفظ جاہل اور ظالم دونوں پر بولا جاتا ہے حالانکہ وہ اس معنی میں زیادہ ظاہر اور غالب ہے' دوسری مثال آیت کریمہ ''وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰی یَطْهُرْنَ'' ہے (البقرہ:۲۲۲) ''اور ان سے نزدیکی نہ کرو جب تک پاک نہ ہولیں'' اس لیے کہ جس طرح عورتوں کے ایام عدت ختم ہونے پر ''طہر'' کا اطلاق ہوتا ہے' اسی طرح وضو اور غسل کو بھی طہر کہتے ہیں اور دوسرے معنی میں طہر کا لفظ زیادہ ظاہر و غالب ہے' اگر کسی دلیل کی بناء پر لفظ ظاہر کو امر مرجوح (کمزور معنی) پر محمول کیا جائے تو یہ صورت تاویل کہلاتی ہے اور جس مرجوح پر اس کو حمل کیا گیا ہے' اس کو مؤول کہتے ہیں' اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے:

''وَهُوَ مَعَكُمْ اَیْنَ مَا كُنْتُمْ'' (الحدید:۴) ''اور وہ تمہارے ساتھ ہے' تم کہیں بھی ہو''

اس آیت میں معیت (ساتھ ہونا) ذات کے اعتبار سے محال ہے' لہٰذا اس کا معنی ظاہر سے پھیر کر کیا جائے گا کہ وہ اپنے علم' قدرت' حفاظت اور رعایت فرمانے کے اعتبار سے ساتھ ہے۔

یا مثلاً اللہ تعالیٰ کا قول ''وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ'' (بنی اسرائیل:۲۴) ''اور نرم دلی کے ساتھ ان کے لیے عاجزی سے جھکے رہنا''۔

اس آیت کو ظاہری لفظوں پر محمول کرنا اس لیے ممکن نہیں ہے کہ انسان کے پر نہیں ہوتے' لہٰذا اس کو حسن اخلاق اور عاجزی کے معنی پر محمول کیا جائے گا۔

مفہوم: لفظ کی دلالت معنی پر محل نطق میں نہ ہو بلکہ اس سے خارج ہو تو ایسی دلالت کو مفہوم کہتے ہیں' اس کی دو قسمیں ہیں: مفہوم موافق' مفہوم مخالف۔

پہلی قسم یعنی مفہوم موافق یہ ہے کہ جس کا حکم منطوق کے حکم کے موافق ہو' یہ موافقت اولیٰ ہوگی تو اس کا نام ''فحوی الخطاب'' رکھا جائے گا۔ اس کی مثال یہ آیت ہے: ''فَلَا تَقُلْ

لَّهُمَا اُفٍّ'' (بنی اسرائیل:۲۳) ''تو نہ کہو ان دونوں (ماں باپ) کو اُف''۔

یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ والدین کو مارنا حرام ہے' یہ دلالت اس واسطے ہے کہ مارنا بہ نسبت کلمہ اف کہنے کے زیادہ سخت ہے۔

اور اگر یہ موافقت مساوی ہو تو اسے ''لحن الخطاب'' کہتے ہیں یعنی خطاب کا معنی مفہوم ہے' جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ''اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰی ظُلْمًا'' (النساء:۱۰) بے شک جو لوگ کھاتے ہیں یتیموں کا مال ناحق' دلالت کرتا ہے کہ یتیموں کا مال جلا ڈالنا حرام ہے' وجہ دلالت یہ ہے کہ ناحق اور ظلم کے ساتھ یتیموں کا مال کھا جانا اور اس کو جلا ڈالنا' دونوں اتلاف مال میں مساوی ہیں۔

دوسری قسم: یعنی مفہوم مخالف یہ ہے کہ جس کا حکم منطوق کے حکم کے خلاف ہو اور اس کی کئی قسمیں ہیں:

(۱) مفہوم صفت: عام ازیں کہ وہ نعت (وصف) ہو یا حال ہو' یا ظرف یا عدد ہو مثلاً اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے کہ ''اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْٓا'' (الحجرات:۶) ''جب تمہارے پاس کوئی فاسق خبر لائے تو خوب چھان بین کر لیا کرو''۔

اس آیت کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ غیر فاسق کی خبر میں تحقیق ضروری نہیں ہے' چنانچہ ایک عادل شخص کی خبر مقبول ہوگی۔

(۲) مفہوم شرط: جیسے ''وَاِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَیْهِنَّ'' (الطلاق:۶) ''اور اگر وہ (مطلقہ عورتیں) حاملہ ہوں تو ان پر خرچ کرو''۔

اس کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ غیر حاملہ ہونے کی صورت میں مطلقہ عورتوں پر خرچ کرنا شوہروں پر واجب نہیں ہے۔

(۳) مفہوم غایت: مثلاً اللہ تعالیٰ کا قول ''فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْ بَعْدُ حَتّٰی تَنْكِحَ زَوْجًا غَیْرَهٗ'' (البقرہ:۲۳۰) ''(پھر اگر اسے تیسری طلاق دے دی تو وہ عورت) اس تیسری طلاق کے بعد اس کے لیے حلال نہیں' یہاں تک کہ وہ عورت اس کے علاوہ کسی اور مرد سے نکاح کرے'' جس کو اس کے شوہر نے طلاق مغلظ دے دی ہو' دوسرے مرد سے نکاح کر کے ضروری عمل سے گزر جائے گی تو اب وہ بشرط رضامندی زوج اول کے لیے حلال ہو جائے گی۔

(۴) مفہوم حصر: جیسے مثلاً ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' (الصافات:۳۵)۔
اور ''اِنَّمَا اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ'' (طٰہٰ:۹۸) یعنی یہ کہ اللہ کے سوا کوئی معبود حقیقی اور لائق عبادت نہیں ہے۔

''فَاللّٰهُ هُوَ الْوَلِيُّ'' (الشوریٰ:۹) یعنی ''اللہ کے سوا کوئی ولی نہیں ہے''۔

''لَاِلَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ'' (آل عمران:۱۵۸) یعنی ''اللہ کے سوا کسی اور کی طرف ان کا حشر نہیں ہوگا''۔ ''اِيَّاكَ نَعْبُدُ'' (الفاتحہ:۵) ''ہم تیری ہی عبادت کریں'' یعنی تیرے سوا کسی اور کی عبادت نہ کریں۔ علماء کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ آیا مفہوم مخالف بہ طور حجت معتبر ہے یا کہ نہیں؟ تو اس میں مختلف آراء اور اقوال ہیں' زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ چند شرائط کے ساتھ جو اصول فقہ کی کتب میں بیان کی گئی ہیں' یہ حجت ہے۔

قرآن پاک کے وجوہ مخاطبات

علامہ ابن الجوزی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب ''النفس'' میں بیان کرتے ہیں کہ قرآن مجید میں خطاب پندرہ طریق سے آیا ہے اور ایک عالم نے تمیں سے زیادہ قرآن میں وجوہ خطاب گنوائے ہیں' ازاں جملہ بعض طریق خطاب حسب ذیل ہیں:

(۱) خطاب عام: اور اس سے عموم مراد ہے' مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ''اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ'' (الروم:۴۰) ''اللہ وہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا''۔

(۲) خطاب خاص: اور اس میں خصوص مراد ہے' مثلاً اللہ تعالیٰ کا قول ہے:
''اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ'' (آل عمران:۱۰۶) ''کیا تم ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے''
اور ''يٰاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ'' (المائدہ:۶۷) ''اے رسول! پہنچا دیجئے''۔

(۳) خطاب عام: جس سے خصوص مراد ہے' مثلاً ''يٰاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ'' (الحج:۱) ''اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو'' کہ اس میں بچے اور پاگل (دیوانے) داخل نہیں۔

(۴) خطاب خاص: جس سے عموم مراد ہے' جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:
''يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ'' (الطلاق:۱) ''اے نبی! (ایمان والوں سے فرما دیجئے)'' جب کہ اس میں افتتاح خطاب نبی پاک ﷺ کے ساتھ ہوا' مگر مراد تمام

وہ لوگ ہیں' جو طلاق کے مالک ہوں اور آیت کریمہ ''يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّا اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ'' (الاحزاب:۵۰) ''اے نبی! ہم نے آپ کے لیے آپ کی وہ بیویاں حلال فرما دیں''۔

اس کے بارے میں ابوبکر الصیر فی بیان کرتے ہیں:

اس آیت میں خطاب کا آغاز رسول کریم ﷺ ہی سے ہوا تھا' پھر جب اللہ تعالیٰ نے ''موہوبہ'' کے بارے میں ''خَالِصَةً لَّكَ'' (الطلاق:۱) فرمایا تو اس سے معلوم ہوا کہ اس کا ماقبل رسول اللہ ﷺ اور آپ کے علاوہ دوسرے لوگوں کو بھی شامل ہے۔

(۵) خطاب جنس: مثلاً قول باری تعالیٰ ''يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ'' ''اے نبی علیک الصلوٰۃ والسلام!

(۶) خطاب نوع: مثلاً ''يَا بَنِيْ اِسْرَآئِيْلَ'' ''اے بنی اسرائیل!

(۷) خطاب عین: جیسے ''يَا اٰدَمُ اسْكُنْ'' ''اے آدم علیہ السلام! سکونت اختیار کرو'' یا نوح اهبط ''اے نوح علیہ السلام! اترو'' ''يَا اِبْرَاهِيْمُ قَدْ صَدَّقْتَ'' ''اے ابراہیم (علیہ السلام)! تم نے سچ کر دکھایا''۔ ''يَا مُوْسٰى لَا تَخَفْ'' ''اے موسیٰ! مت ڈرو''۔ ''يَا عِيْسٰى اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ'' ''اے عیسیٰ! میں تمہیں تمہاری مقررہ مدت تک پہنچاؤں گا''۔

قرآن مجید میں کسی مقام پر بھی حضور ﷺ کو یا محمد کہہ کر نام کی حیثیت سے خطاب نہیں ہوا بلکہ آپ کی تعظیم اور تشریف کا لحاظ رکھتے ہوئے ''يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ'' ''اے غیب کی خبر دینے والے'' اور ''يٰاَيُّهَا الرَّسُوْلُ'' ''اے رسول!'' کے ساتھ آپ کو مخاطب کیا گیا ہے۔

(۸) خطاب مدح: مثلاً ''يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا'' (التحریم:۶) ''اے ایمان والو!'' اور اسی لیے اہل مدینہ کو ''اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا'' (الانفال:۷۲) ''جو ایمان لائے اور اللہ کے لیے گھر بار چھوڑے''۔

(۹) خطاب الذم: مثلاً ''يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ'' (التحریم:۷) ''اے کافرو! آج بہانے نہ بناؤ''۔ ''قُلْ يٰاَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ'' (الکافرون:۱) ''تم فرماؤ! اے کافرو!''۔

(۱۰) خطاب کرامت: جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ''یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ''، ''اے (غیب کی خبر دینے والے) نبی!''۔ ''یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ''، ''اے رسول!''۔

(۱۱) خطاب اہانت: ''فانك رجیم'' ''تو مردود ہے'' اور ''اِخْسَـٔوْا فِیْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ'' (المومنون:۱۰۸) ''چکھ، ہاں ہاں! تو ہی بڑا عزت والا اکرم والا ہے''۔

(۱۲) خطاب تہکم: جیسے ''ذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْكَرِیْمُ'' (الدخان:۴۹) ''چکھ ہاں ہاں! تو ہی بڑا عزت والا اکرم والا ہے''۔

(۱۳) خطاب جمع لفظ واحد کے ساتھ: جیسے ''یٰۤاَیُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِیْمِ'' (الانفطار:۶) ''اے آدمی! تجھے کس چیز نے فریب دیا اپنے کرم والے رب سے''۔

(۱۴) خطاب واحد لفظ جمع کے ساتھ: ''یٰۤاَیُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ'' (المومنون:۵۱) ''اے پیغمبرو! پاکیزہ چیزیں کھاؤ''، ''تا قوله تعالی'' ''فَذَرْهُمْ فِیْ غَمْرَتِهِمْ'' (المومنون:۵۴) ''تو تم ان کو چھوڑ دو ان کے نشہ میں''۔

یہ تنہا حضور ﷺ کو خطاب ہے کیونکہ نہ تو آپ کے ساتھ کوئی رسول تھا اور نہ ہی آپ کے بعد کوئی نبی ہوا یا ہوگا۔

اور اسی طرح آیت کریمہ ''وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا'' (النحل:۱۲۶) ''اگر تم ان کو سزا دو تو ایسی سزا دو'' میں بھی آپ ﷺ ہی کو خطاب ہے، اس کی دلیل یہ آیت ہے: ''وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ'' (النحل:۱۲۷) ''اے محبوب! تم صبر کرو اور تمہارا صبر اللہ ہی کی توفیق سے ہے''۔

پھر اسی طرح اللہ تعالیٰ کے قول ''فَاِلَّمْ یَسْتَجِیْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْا'' (ھود:۱۴) ''تو اے مسلمانو! اگر وہ تمہاری بات کا جواب نہ دے سکیں تو جان لو'' میں بھی اکیلے حضور ﷺ کو خطاب کیا گیا ہے اور تنہا آپ ہی مخاطب ہیں، اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد ''قل فاتوا'' ہے۔

(۱۵) واحد کو تثنیہ (دو) کے لفظ سے خطاب کرنا: جیسے ''اَلْقِیَا فِیْ جَهَنَّمَ'' (ق:۲۴) ''تم دونوں جہنم میں ڈال دو'' حالانکہ یہ خطاب مالک داروغہ دوزخ کو ہے۔

اور ایک قول ہے کہ نہیں بلکہ اس کے مخاطب دوزخ کے خزانہ دار فرشتے اور وہاں کے

عذاب دینے والے فرشتے ہیں تو اس حالت میں وہ جمع کا خطاب لفظ تثنیہ کے ساتھ ہوگا۔

اور یہ قول بھی ہے کہ یہ دو ایسے فرشتوں سے خطاب ہے، جو انسان پر موکل و مقرر ہیں، جیسا کہ ان کا بیان آیت کریمہ ''وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِیْدٌ'' (ق:۲۱) ''اور ہر جان یوں حاضر ہوئی کہ اس کے ساتھ ایک ہانکنے والا اور گواہ'' میں کیا گیا ہے۔

(۱۶) تثنیہ (دو) کو لفظ واحد کے ساتھ خطاب: مثلاً ''فَمَنْ رَّبُّكُمَا یٰمُوْسٰی'' (طٰہٰ:۴۹) ''تم دونوں کا خدا کون ہے اے موسیٰ!''۔ ''بقی و یا ھارون'' اور اس کی مثال ''فَلَا یُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰی'' (طٰہٰ:۱۱۷) ''تو ایسا نہ ہو کہ وہ تم دونوں کو جنت سے نکال دے پھر تو مشقت میں پڑے'' بھی ہے۔ ابن عطیہ بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس خطاب میں صرف حضرت آدم علیہ السلام ہی کو تنہا شقاوت کے ساتھ مخاطب کیا ہے، کیونکہ آپ ہی مخاطب اوّل اور مقصود فی الکلام ہیں۔

(۱۷) دو شخصوں کو لفظ جمع کے ساتھ خطاب کرنا: جیسے ''ان تبوا لقومکما بمصر بیوتا واجعلوا بیوتکم قبلہ'' ''تم دونوں اپنے لوگوں کے لیے مصر میں گھر بناؤ اور تم سب اپنے گھروں کو قبلہ (مسجد) قرار دو۔

فائدہ

بعض علماء بیان کرتے ہیں کہ قرآن کے خطاب کی تین قسمیں ہیں:

(۱) ایک قسم ایسی ہے جو صرف نبی کریم ﷺ کے لائق ہے۔

(۲) دوسری قسم وہ ہے جو نبی کریم ﷺ کے علاوہ دوسرے لوگوں کے لیے موزوں ہے۔

(۳) تیسری قسم وہ ہے جو حضور ﷺ اور دوسرے لوگوں کے لیے یکساں ہے (یعنی دونوں ہی اس کے مخاطب ہو سکتے ہیں)۔

قرآن کے حقیقت اور مجاز کا بیان

بلاشبہ قرآن مجید میں حقائق کا وقوع ہوا ہے اور حقیقت اس لفظ کو کہا جاتا ہے، جو اپنے

معنی موضوع لہ میں استعمال ہو اور اس میں کسی قسم کی تقدیم و تاخیر نہ کی گئی ہو بلکہ اپنے معنی پر باقی ہو اور قائم ہو' یہ کلام میں بہ کثرت موجود ہے۔

اور رہا مجاز' تو جمہور اس کے بھی قرآن میں وقوع کے قائل ہیں۔ جب کہ ایک گروہ کے نزدیک قرآن مجید میں مجاز کا استعمال ہوا ہی نہیں ہے' ان ہی میں سے فرقہ ظاہریہ بھی ہے اور شوافع میں سے ابن القاص اور مالکیہ میں سے ابن خویز منداد قرآن میں مجاز کے وقوع کے منکر ہیں۔

ان منکرین مجاز کا اعتراض یہ ہے کہ مجاز جھوٹ کے مشابہ ہے اور قرآن مجید کذب (جھوٹ) کے شائبہ سے بھی پاک ہے۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ متکلم مجاز کا اس وقت سہارا لیتا ہے' جب حقیقت کا دامن تنگ ہو جاتا ہے' پھر وہ اس وقت مجاز کی طرف عدول کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے لیے یہ محال ہے کیونکہ اس کے لیے حقیقت کا دامن تنگ نہیں ہوتا ہے۔

لیکن ان لوگوں کا یہ شبہ باطل ہے کیونکہ اگر قرآن مقدس سے مجاز کو نکال باہر کریں تو قرآن سے حسن و زینت کا ایک بہت بڑا حصہ ساقط ہو جائے گا' اس لیے کہ علماء بلاغت میں مجاز کا استعمال زیادہ ہے یعنی حقیقت کی بہ نسبت مجاز زیادہ حسن و خوبی کا باعث ہوتا ہے' پھر اگر قرآن کو مجاز سے خالی ماننا ضروری قرار دے دیا جائے تو قرآن پاک کو حذف' تاکید' قصص کی تکرار اور دیگر محاسن کثیرہ سے بھی اس کو خالی ماننا پڑے گا۔

مجاز کی دو قسمیں

(۱) مجاز فی الترکیب ہے' اس کو مجاز الاسناد اور مجاز عقلی بھی کہتے ہیں' اس میں علاقہ ملابست کا ہوتا ہے۔

مجاز عقلی یہ ہے کہ فعل یا مشابہ فعل کی اسناد غیر ما ھولہ کی طرف ہو یعنی فعل یا شبہ فعل کو اصل میں جس امر کے لیے وضع کیا گیا ہے' اس حقیقی وضع کے سوا کسی دوسرے امر کی طرف اس فعل یا شبہ فعل کی نسبت کر دی جائے کیونکہ اس فعل یا شبہ فعل کا اس کے ساتھ تعلق ہوتا اور ملابست ہوتی ہے۔

(۲) جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: "وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا" (الانفال:۲)

"اور جب ان پر قرآن کی آیتیں پڑھی جائیں تو وہ (آیات) ان کے ایمان کو زیادہ کر دیں"۔

اس میں ایمان (کے کیف) میں زیادتی کرنا جو اللہ تعالیٰ کا فعل ہے' اس کی نسبت آیات کی طرف کر دی ہے کیونکہ وہ سبب بنتی ہیں اور "يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ" وہ (فرعون) ان کے بیٹوں کو مار ڈالتا اور اسی طرح "يٰهَامٰنُ ابْنِ لِيْ صَرْحًا" (المؤمن:۳۶) اے ہامان! میرے لیے ایک بلند عمارت تعمیر کر' پہلی مثال میں ذبح کی نسبت فرعون کی طرف کی ہے حالانکہ ذبح اس کے جلاد وغیرہ کرتے تھے اور دوسری مثال میں بناء مکان کی نسبت ہامان کی طرف کی گئی ہے' حالانکہ یہ کام بھی راج اور مزدوروں کا تھا' لیکن یہ چونکہ سبب آمر تھے' اس لیے ان کی طرف مجازاً نسبت کر دی ہے۔

ایسے ہی اللہ تعالیٰ کے قول "وَاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ O" (ابراہیم:۲۸) "اور اپنی قوم کو انہوں نے ہلاکت کے گھر میں ڈالا" میں لیڈروں کی طرف اپنی قوم کو دوزخ میں لے جانے کی نسبت کی گئی ہے کیونکہ انہی سرداروں نے اپنی رعایا کو کفر کا حکم دیا تھا اور ان کے کافر ہونے کا سبب بنے تھے۔ یوں ہی اللہ تعالیٰ کا قول "يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبًا O" (المزمل:۱۷) "وہ دن جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا" میں بوڑھا کرنے کے فعل کی نسبت ظرف یعنی "یوم" کی طرف کر دی ہے' اس لیے کہ فعل اس میں واقع ہوا ہے' اور "عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ O" (القارعۃ:۷) "پسندیدہ عیش" یعنی مرضیہ۔

مجاز کی دوسری قسم مجاز فی المفرد' اس کا نام مجاز لغوی بھی ہے' یہ شروع ہی سے لفظ کو غیر ما وضع لہ میں استعمال کرنے کا نام ہے' اس کی بہت سی انواع ہیں:

(۱) حذف: جیسے اس کی مثال ہے: "واسال القریہ"، "بستی والوں سے سوال کر" مراد ہے: اہل قریہ سے پوچھ۔

(۲) زیادت: جیسے "لیس کمثلہ شئی"، "نہیں اس کی مثل کوئی چیز" یعنی "لیس مثلہ شئی" لیکن حال یہ مثال محال نظر ہے۔

(۳) کل بول کر جزء مراد لینا: "يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ" (البقرہ:۱۹) "داخل کرتے ہیں اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں" یعنی "انا ملھم" "انگلیوں کے پوروں کو

پوری انگلیوں سے تعبیر کرنے کی حکمت اور نکتہ یہ مضمر ہے کہ ان کے اسلام سے گریز کرنے اور فرار اختیار کرنے میں مبالغہ کا اظہار ہو کہ اگر ان کا بس چلے تو وہ پوری انگلی بھی کانوں میں ٹھونس لینے سے نہ کترائیں اور قول باری تعالیٰ ''وَاِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ'' (المنافقون:۴) ''اور (اے مخاطب!) جب تو انہیں دیکھے (تو) ان کے قد و قامت تجھے پسندیدہ نظر آئیں'' اجسام سے مراد چہرے ہیں کیونکہ آپ نے ان کے پورے بدن تو نہیں مشاہدہ کیے تھے۔

(۴) جز بول کر کل مراد لینا: جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ قول ''وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ'' (الرحمٰن:۲۷) ''باقی ہے آپ کے رب کی ذات'' یعنی اس کی ذات مراد ہے۔ ''فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ'' (البقرہ:۱۵۰) مراد ہے اپنے چہرے پھیر لو کیونکہ استقبال قبلہ سینہ کے ساتھ واجب ہے۔

''وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ'' (الغاشیہ:۸) ''(بہت) چہرے اس دن ہشاش بشاش ہوں گے'' اور ''وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌO عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ'' (الغاشیہ:۳۔۲) ''اس دن (بہت) چہرے ذلیل ہوں گےO (دنیا میں) کام کرنے والے مشقت جھیلنے والے'' کہ ان آیتوں میں پورے بدنوں کو وجہ (چہرہ) کے لفظ سے بیان اور تعبیر کیا گیا'' ذلك بما قدمت يداك'' ''یہ اس کا بدلا ہے جو تیرے ہاتھوں نے آگے بھیجا'' اور ''بما كسبت ايديكم'' ''بسبب اس کے جو تمہارے ہاتھوں نے کمایا'' یعنی ''قدمتم'' اور ''كسبتم'' بہ صیغہ جمع اور اس کی نسبت ''ایدی'' (ہاتھوں) کی طرف اس لیے ہوئی کہ اکثر کام ہاتھوں ہی سے کیے جاتے ہیں۔

(۵) اسم خاص کا اطلاق عام پر جیسے ''انا رسول رب العلمين'' ''میں رب العالمین کا رسول ہوں'' (یعنی رسلہ)۔

(۶) اسم عام کا اطلاق خاص پر جیسے ''وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِى الْاَرْضِ'' (الشوریٰ:۵) (یعنی المومنین) کے لیے مغفرت چاہتے ہیں اور اس کی دلیل ہے: اللہ کا قول ''وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا'' (المؤمن:۷) ''اور بخشش طلب کرتے ہیں ایمان والوں کے لیے''۔

(۷) کسی شے کا نام اس امر پر رکھنا جو ماضی میں تھا، مثلاً ''وَاٰتُوا الْيَتٰمٰى اَمْوَالَهُمْ'' (النساء:۲) یعنی ان لوگوں کے اموال ان کو دے دو، جو کبھی پہلے یتیم تھے کیونکہ بالغ

ہونے کے بعد یتیمی باقی نہیں رہتی، اس طرح ما کان کے اعتبار سے کسی شے کا نام رکھنے کی مثالیں یہ بھی ہیں، مثلاً ''فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ'' (البقرہ:۲۳۲) یعنی عورتیں ان لوگوں سے نکاح کر لیں جو کہ پہلے ان کے شوہر تھے، ایسے ہی اللہ تعالیٰ کا قول ''من يات ربه مجرما'' کہ اس آنے والے کے نام مجرم دنیاوی گنہگاروں کے اعتبار سے رکھا ہے۔

(۸) ایک شے کو مال اور انجام کار کے نام سے موسوم کرنا مثلاً ''انی ارانی اعصر خمرا'' یعنی میں نے اپنے آپ کو انگور نچوڑتے ہوئے دیکھا، جو انجام کار شراب بن جاتی ہے۔
اور اللہ تعالیٰ کا قول ''وَلَا يَلِدُوْا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًاO'' (نوح:۲۷) یعنی ''ایسے لوگ جنیں گے، جو کفر و فجور کی طرف لوٹیں گے''۔
اور اللہ تعالیٰ کا قول ''حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ'' (البقرہ:۲۳۰) دوسرے مرد کو شوہر کے نام سے موسوم کیا کیونکہ عقد کے بعد وہ شوہر ہی ہوگا اور مباشرت اسی حالت میں کرے گا، جب کہ شوہر ہو جائے گا۔
اور قول باری تعالیٰ ''فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍO'' (الصّٰفّٰت:۱۰۱) ''تو ہم نے انہیں حلم والے بیٹے کی خوش خبری دی'' اور ''نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍO'' (الحجر:۵۳) ''ہم آپ کو علم والے فرزند کی بشارت دیتے ہیں'' کہ ان آیات میں بچہ کی صفت اس حالت کے ساتھ بیان کی ہے جو انجام میں اس کو حاصل ہونے والی تھی یعنی علم اور حلم۔

(۹) حال کا اطلاق محل پر، جیسے قول خداوندی ہے: ''فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ'' (آل عمران:۱۰۷) ''وہ اللہ کی رحمت میں ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے'' یعنی جنت میں کیونکہ وہ رحمت کا محل ہے۔
اور ''لا بل مكرا الليل'' رحمت کا محل ہے۔
''اِذْ يُرِيْكَهُمُ اللّٰهُ فِيْ مَنَامِكَ قَلِيْلًا'' (الانفال:۴۳) یعنی تیری آنکھ میں یہ حسن رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔

(۱۰) ایک چیز کو اس کے آلہ کے نام سے موسوم کرنا، مثلاً ''وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِى الْاٰخِرِيْنَ'' (الشعراء:۸۴) ''اور میرے لیے ذکر جمیل جاری رکھ میرے بعد آنے والوں

میں'' یعنی ثناء حسن اچھی تعریف ذکر خیر کیونکہ زبان ثناء کا آلہ ہے اور'' وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ '' (ابراہیم:۴) '' اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کے قبیلہ کی زبان میں'' یعنی اسی قوم کی لغت بولی ہیں۔

(۱۱) ایک چیز کا نام اس کی ضد کے ساتھ رکھنا جیسے'' فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍO '' (آل عمران:۲۱) '' تو انہیں خوش خبری سنا دیجئے دردناک عذاب کی'' حالانکہ بشارت کا حقیقی استعمال مسرت بخش خبر میں ہوتا ہے۔

(۱۲) فعل کا اطلاق ایسے امر پر کرنا جس کا ارادہ کرلیا ہو یا جو قریب الحصول ہو جیسے مجازنی المشارفت والقرب کہتے ہیں۔

جیسے'' فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ '' (البقرہ:۲۳۱) '' پھر وہ اپنی عدت کو پہنچیں تو انہیں روک لو'' جب مدت پہنچنے کے قریب ہو جائیں یعنی عدت گزرنے اور ختم ہونے تک پہنچ جائیں کیونکہ انقضائے عدت کے بعد امساک (روکنا) نہیں ہوتا۔

مگر'' فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ '' (البقرہ:۲۳۲) '' پھر وہ پہنچ جائیں اپنی عدت کو تو نہ روکو انہیں'' حقیقت ہے کیونکہ جب ان کی موت آنے کا وقت قریب ہوا۔

اور'' وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ '' (النساء:۹) یعنی اگر وہ چھوڑنے کے قریب ہوتے ہیں تو ڈرتے ہیں کیونکہ خطاب وصی لوگوں کی طرف ہے اور ان سے اس خطاب کا تعلق ترک سے پہلے ہی ہوسکتا ہے' اس لیے کہ وہ لوگ ترک کے بعد تو خود ہی مردہ جائیں گے۔

○ '' اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا '' (المائدہ:۶) یعنی جب کہ تم قیام کا ارادہ کرو۔

○ '' فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ '' (النحل:۹۸) یعنی جب قراءت کا ارادہ کرو' تا کہ استعاذہ قراءت سے قبل ہو۔

○ '' وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا فَجَآءَهَا بَاْسُنَا '' (الاعراف:۴)

یعنی ہم نے اس کے ہلاک کرنے کا ارادہ کیا' ورنہ اگر یہ تسلیم کریں تو حرف فاء کے ساتھ عطف ڈالنا صحیح نہ ہوگا۔

(۱۳) ایک صیغہ کو دوسرے صیغہ کے مقام پر رکھنا' اس نوع کے تحت بہت سی قسمیں آتی ہیں'

ان میں سے ایک یہ ہے کہ فاعل کا اطلاق مفعول پر ہو' جیسے مثلاً'' مَآءٍ دَافِقٍ '' (الطارق:۶) یعنی مدفون (اچھالا ہوا)۔

○ اور'' لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ '' (ھود:۴۳) '' آج اللہ کے عذاب سے کوئی بچانے والا نہیں مگر وہی (بچے گا) جس پر اللہ رحمت فرمائے'' یعنی لامعصوم کوئی بچا ہوا نہیں۔

○ '' جعلنا حرما امنا '' یعنی مامون فیہ جس میں امن ملے اور اس کا عکس یعنی کبھی مفعول کا اطلاق فاعل پر کیا جاتا ہے جیسے'' انه كان وعده ماتيا '' یعنی'' آتیا ''۔

○ اور'' حجابا مستورًا '' یعنی'' ساترًا '' پوشیدہ کرنے والا اور ایک قول یہ ہے کہ یہ اپنے باب پر ہے اور اس کے معنی ہیں: '' مستورًا '' '' عن العيون لا تحس به احد '' آنکھوں سے پوشیدہ ہے کہ کوئی شخص اس کو محسوس نہیں کرسکتا۔

○ مفرد' تثنیہ اور جمع میں سے ایک کا دوسرے پر اطلاق مفرد کے مثنی پر اطلاق کی مثال ہے '' وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ '' (التوبہ:۶۲) یعنی ان دونوں کو راضی کرو مگر چونکہ دونوں کی رضامندی اور خوشنودی حاصل کرنا باہم لازم وملزوم تھا' اس لیے مفرد کا صیغہ لایا گیا ہے۔

○ اور مفرد کے جمع پر اطلاق کی مثال'' اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ '' (العصر:۲) '' بے شک آدمی ضرور خسارے میں ہے'' یعنی تمام انسان' اس کی دلیل اس میں سے مستثنی کا درست ہونا ہے' اب بہت سے انسان رہ گئے اور'' اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا '' (المعارج:۱۹) '' بے شک انسان کم حوصلہ پیدا ہوا ہے'' اور اس کی دلیل'' الا المصلين '' کا اس میں سے مستثنی ہونا ہے۔

○ اور مثنی کے مفرد پر اطلاق کی مثال'' القيا في جهنم '' یعنی'' الق '' تو ڈال دے اور ہر ایسا جو صرف ایک ہی چیز کے لیے ہونے کے باوجود دو چیزوں کی طرف منسوب کردیا گیا ہو وہ اسی قبیل سے ہے۔ مثلاً'' يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُO '' (الرحمٰن:۲۲) '' ان سے موتی اور مونگے نکلتے ہیں'' حالانکہ موتی اور مرجان ایک ہی قسم کے دریا یعنی شور اور کھاری پانی سے برآمد ہوتے ہیں نہ کہ شیریں پانی سے'' وَجَعَلَ الْقَمَرَ

فِيهِنَّ نُوْرًا'' (نوح:۱۶) ''اور ان میں چاند کو روشن فرمایا''۔ ''ای فی احداھن ''یعنی صرف ایک آسمان میں اس کو نور بنایا ہے۔ ''نَسِيَا حُوْتَهُمَا'' (الکہف:۶۱) ''وہ دونوں مچھلی کو بھول گئے'' حالانکہ بھولنے والے صرف یوشع علیہ السلام تھے' جس کی دلیل یہ ہے کہ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا: ''فَاِنِّيْ نَسِيْتُ الْحُوْتَ'' (الکہف:۶۳) ''تو میں اپنی مچھلی کو بھول گیا'' اور نسیان کی نسبت ان دونوں کی طرف ایک ساتھ' اس وجہ سے کی گئی کہ موسیٰ علیہ السلام نے سکوت کیا تھا ''فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ'' (البقرہ:۲۰۳) ''تو جس نے جلدی کی دو دن میں اس پر کوئی گناہ نہیں'' حالانکہ تعجیل یوم ثانی میں ہی ہوتی ہے اور مثنٰی کے جمع پر اطلاق کی مثال ''ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ'' (الملک:۴) ''كَرَّتَيْنِ ''یعنی کرات بار بار بہت سی مرتبہ کیونکہ نگاہ کا تھکنا بغیر کثرت نظر کے ممکن نہیں ہے اور جمع کے مفرد پر اطلاق کرنے کی مثال ''قال رب ارجعون'' ہے یعنی ''ارجعنی'' مجھے پھر لوٹا۔

- ماضی کا اطلاق مستقبل پر۔ کیونکہ اس کا وقوع ثابت اور یقینی ہے' مثلاً ''انی امر اللہ'' یعنی قیامت اور اس کی دلیل ہے' اللہ تعالیٰ کا قول ''فلا تستعجلوہ'' اور ''وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ'' (الزمر:۶۸) ''اور پھونکا جائے گا صور' پس غش کھا کر گر پڑے گا جو آسمانوں میں ہے''۔
- ''وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ'' (المائدہ:۱۱۶) ''اور جب اللہ فرمائے گا: اے عیسیٰ! مریم کے بیٹے! کیا تم نے کہا تھا لوگوں کو''۔
- اور اس کے برعکس یعنی مستقبل کا اطلاق ماضی پر' تاکہ وہ دوام اور استمرار کا فائدہ دے' گویا کہ وہ واقع ہو کر استمرار پا گیا' جیسے ''اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ'' (البقرہ:۴۴) ''کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو؟ اور بھول جاتے ہو''۔

''وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ'' (البقرہ:۱۰۲) ''اور وہ اس (کفریہ جادو منتر) کے پیچھے لگ گئے جیسے سلیمان کے عہد میں شیطان پڑھا کرتا تھا''۔ ''یعنی تلت'' انہوں نے پڑھا ''لقد نعلم'' یعنی ''علمنا'' اور ''قد یعلم ما انتم علیه'' یعنی علم جان لیا ''فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ'' (البقرہ:۹۱) ''تم کیوں قتل کرتے تھے اللہ کے نبیوں

کو''۔ ''ای قتلتم ''تم نے ان کو قتل کیا۔

حصر اور اختصاص کا بیان

حصر مخصوص طریق سے ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ خاص کرنا یا کسی ایک چیز کے لیے کوئی حکم ثابت کرنا اور اس کے ماسوا سے اس حکم کی نفی کرنا حصر کہلاتا ہے (اور حصر کو قصر بھی کہتے ہیں)۔

قصر کی دو قسمیں ہیں:

(۱) قصر الموصوف علی الصفۃ۔

(۲) قصر الصفۃ علی الموصوف اور ہر ایک حقیقی ہے یا مجازی۔

قصر الموصوف علی الصفۃ حقیقی کی مثال جیسے ''ما زید الا کاتب ''یعنی زید کے لیے سوائے کاتب ہونے کے اور کوئی صفت نہیں ہے۔

اس قسم کا حصر فی الواقع موجود نہیں ہے کیونکہ کسی چیز کی تمام صفات پر احاطہ کر لینا اس طور پر کہ صرف ایک صفت کا اثبات اور دیگر صفات کی کلیۃً نفی ہو سکے ناممکن ہے' علاوہ ازیں یہ بھی بعید ہے کہ ایک ذات کے لیے صرف ایک ہی صفت ہو اور کوئی دوسری صفت نہ ہو' اسی وجہ سے قرآن حکیم میں اس نوعیت کا حصر واقع نہیں ہے۔

قصر الموصوف علی الصفۃ مجازی کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: ''وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ'' (آل عمران:۱۴۴) ''اور محمد (معبود نہیں) صرف ایک رسول ہیں'' یعنی حضور ﷺ رسالت پر مقصود ہیں' اس سے متجاوز ہو کر موت سے بری نہیں ہو سکے' جیسے کہ لوگ مستبعد خیال کرتے تھے کیونکہ موت سے بری ہونا شان الوہیت ہے۔

قصر الصفۃ علی الموصوف حقیقی کی مثال ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' (الصافات:۳۵) ''نہیں کوئی معبود برحق مگر اللہ'' ہے' قصر الصفۃ علی الموصوف مجازی کی مثال ''قُلْ لَّا اَجِدُ فِيْ مَا اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗۤ اِلَّاۤ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ'' (الانعام:۱۴۵) ''فرما دیجئے میں نہیں پاتا اس وحی میں جو میری طرف کی گئی کسی کھانے والے پر کوئی حرام کی ہوئی چیز' جسے وہ کھاتا ہو' مگر یہ کہ وہ

مردار ہو یا (رگوں سے) بہتا ہوا خون یا خنزیر کا گوشت تو بے شک وہ نجاست ہے یا نافرمانی کے لیے ذبح کے وقت جس جانور پر غیر اللہ کا نام پکارا جائے' اس آیت کا ظاہر دلالت کرتا ہے کہ حرام کردہ اشیاء صرف یہی ہیں جو اس آیت میں مذکور ہیں اور یہ مفہوم مراد نہیں ہو سکتا ہے کیونکہ آیت میں مذکور حرام چیزوں کے علاوہ بھی بہت سی چیزیں ایسی ہیں' جو حرام ہیں لیکن ان کا یہاں اس جگہ ذکر نہیں کیا گیا' مثلاً خمر اور دیگر نشہ آور اشیاء' اسی طرح سور کے علاوہ دیگر کچلیوں سے شکار کرنے والے جانور کا گوشت' اسی لیے علماء نے کہا ہے کہ اس آیت میں حصر مجازی ہے جو کہ اس آیت کے سبب نزول کے واقعہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلہ کو بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے' جس کا خلاصہ اور لب لباب یہ ہے کہ کفار چونکہ مردار' بہا ہوا خون' سور کا گوشت اور بتوں کے نام لے کر ذبح کیا ہوا جانور ان کو حلال کہتے تھے اور بہت سے مباحات کو حرام ٹھہراتے تھے اور طریق شریعت کی مخالفت ان کا شیوہ تھا' یہ آیت ان کی تردید کرنے کے لیے اور ان کے اس اشتباہ کے ذکر میں نازل ہوئی' جس پر وہ کاربند تھے اور حصر کے انداز میں اس کو بیان کر دیا گیا ہے تاکہ ان کا کذب خوب واضح ہو جائے اور تاکید کے ساتھ ان کا رد ہو جائے گویا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نہیں حرام مگر وہی شے جس کو کفار نے حلال ٹھہرا رکھا ہے اور غرض اس سے کفار کی مخالفت اور ان کی تردید کرنا ہے نہ کہ حصر حقیقی ایک اور اعتبار سے حصر کی تین قسمیں ہیں:

(۱) قصر افراد (۲) قصر قلب (۳) قصر تعیین۔

اوّل سے خطاب اس کو کیا جاتا ہے جو شرکت کا اعتقاد رکھتا ہو جیسے "اِنَّمَا اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ" (الکہف: ۱۱۰) سے ان لوگوں کو خطاب کیا گیا ہے' جو خدائے تعالیٰ کے ساتھ بتوں کو الوہیت میں شریک سمجھتے ہیں۔ دوسری قسم کا خطاب اس کو کیا جاتا ہے جس کا یہ اعتقاد ہو کہ متکلم نے جو حکم جس کے لیے ثابت کیا ہے' اس کا ثبوت دوسرے کے لیے بھی ہے' جیسے "رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ" (البقرہ: ۲۵۸) "میرا رب وہ ہے جو زندہ کرتا اور مارتا ہے" سے نمرود کو خطاب کیا گیا' جو خود کو ہی صرف زندہ کرنے والا اور مارنے والا سمجھتا تھا نہ کہ اللہ تعالیٰ کو۔ تیسری قسم کا خطاب اس سے کیا جاتا ہے' جس کے نزدیک دونوں امر مساوی ہوں۔

حصر کے طُرق

حصر کے بہت سے طریق ہیں:

(۱) نفی اور استثناء خواہ نفی "لا" کے ساتھ ہو یا "ما" کے ساتھ یا اور کسی ذریعے سے اور استثناء خواہ "الا" کے ذریعے ہو یا غیر کے ذریعے جیسے "لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ" (الصافات: ۳۵) "نہیں کوئی معبود مگر اللہ" اور "مَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ" (آل عمران: ۶۲) "اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں" اور "مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِیْ بِهٖ" (المائدہ: ۱۱۷) "میں نے انہیں نہیں کہا مگر وہی جس کا تو نے مجھے حکم دیا"۔

(۲) "انما" جمہور کا اس پر اتفاق ہے کہ کلمہ "انما" حصر کے لیے آتا ہے' حصر ثابت کرنے والوں سے حسب ذیل آیات سے استدلال پیش کیا ہے:

(i) "اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیْكُمُ الْمَیْتَةَ" (البقرہ: ۱۷۳) "اس نے یہی تم پر حرام کیے ہیں مردار اور خون"۔

(ii) "اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ" (الملک: ۲۶) "یہ علم تو اللہ کے پاس ہے"۔

(iii) "قَالَ اِنَّمَا یَاْتِیْكُمْ بِهِ اللّٰهُ" (ھود: ۳۳) "بولا: وہ تو اللہ تم پر لائے گا"۔

(۳) "انما بالفتح" علامہ بیضاوی اور علامہ زمخشری نے "انما" کو طرق حصر میں شمار کیا ہے اور دونوں کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد "قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ یُوْحٰٓی اِلَیَّ اَنَّمَآ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ" (الکہف: ۱۱۰) "(اے حبیب! کافروں سے) فرما دیجئے میں (الوہیت کا مدعی نہیں بلکہ معبود نہ ہونے میں) تم جیسا ہوں میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ (میرا اور) تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے" میں کلمہ "انما" برائے حصر ہے۔

(۴) تقدیم معمول جیسے "اِیَّاكَ نَعْبُدُ" (الفاتحہ: ۵) "ای لا غیرک" "ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں یعنی تیرے سوا کسی کی ہم عبادت نہیں کرتے"۔

(۵) ضمیر فصل: (ا) جیسے "فاللّٰه هو الولی" (ای لا غیرہ) اللہ تعالیٰ ہی ولی ہے' اس کے سوا کوئی نہیں۔

(ب) "وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ" (البقرہ: ۵) "اور وہی مراد کو پہنچنے والے"۔

(ج) "اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ" (آل عمران: ۶۲) "یہی بے شک سچا بیان ہے"۔

ایجاز اور اطناب کا بیان

جاننا چاہیے کہ ایجاز اور اطناب بلاغت کی بڑی انواع میں سے ہیں' یہاں تک کہ صاحب ''سر الفصاحۃ'' نے بعض علماء بلاغت کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ''البلاغۃ ھی الایجاز والاطناب'' یعنی ایجاز اور اطناب ہی بلاغت ہے۔

ایجاز اور اطناب کی تعریف میں علماء کے اقوال مختلف ہیں۔

بعض علماء نے کہا:

متعارف عبارت سے کم میں مقصود کو ادا کر دینا ایجاز ہے اور بسط کے موقع پر متعارف عبارت سے زیادہ میں مقصود کا ادا کرنا اطناب کہلاتا ہے۔

اور بعض کے نزدیک غیر زائد الفاظ میں مطلب کو پورا بیان کر دینا ایجاز ہے اور زائد الفاظ میں پورے مطلب کو بیان کرنا اطناب ہے۔

اطناب اسہاب سے اخص ہے کیونکہ اسہاب تطویل بافائدہ اور بے فائدہ دونوں کو کہتے ہیں۔

ایجاز کی انواع

ایجاز کی دو قسمیں ہیں: (۱) ایجاز قصر (۲) ایجاز جامع۔ ایجاز قصر یہ ہے کہ لفظ کا قصر اپنے معنی پر ہو' جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (تا قوله) وَاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ'' (النمل:۳۱-۳۰) ''بے شک وہ سلیمان کی طرف سے ہے اور بے شک وہ (خط) اللہ کے نام سے ہے جو نہایت رحمت والا بے حد رحم فرمانے والا ہے' یہ کہ میرے مقابلہ میں سرکشی نہ کرو اور مطیع فرمان ہو کر میرے پاس چلے آؤ''۔

کہ اس میں عنوان کتاب اور حاجت کو جمع کر دیا ہے اور اس کی ایک قسم کا نام ایجاز جامع ہے' وہ یہ ہے کہ لفظ کئی معانی کو شامل اور محیط ہو' جیسے ''اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ'' (النحل:۹۰) ''بے شک اللہ حکم فرماتا ہے عدل کرنے اور نیکی کرنے کا'' (الآیہ)۔

''عدل'' سے مراد صراط مستقیم ہے' جو افراط اور تفریط کے درمیان معتدل اور متوسط طریقہ اور راستہ ہے' اس سے عقائد' اخلاق اور عبودیت کے تمام واجبات اور ضروری امور کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

''احسان'' واجبات عبودیت میں اخلاص سے کام لینا احسان ہے کیونکہ احسان کی تفسیر حدیث میں یہ ہے:

''ان تعبدوا اللّٰہ کانک تراہ'' یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت خالص نیت سے کرو اور خضوع کے ساتھ اور خشیت الٰہی کے جذبات سے سرشار ہو کر عبادت کرو۔

اور ''وَاِيْتَآءِ ذِي الْقُرْبٰى'' (النحل:۹۰) سے مراد نوافل کی زیادتی ہے' جواب پر یہ سب باتیں اوامر ہیں' رہے نواہی تو اللہ تعالیٰ کے قول ''وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ'' (النحل:۹۰) ''اور منع فرماتا ہے بے حیائی اور بُرائی سے'' میں ''فحشاء'' سے اشارہ ہے قوت شہوانیہ کی طرف اور ''منکر'' سے اشارہ ہے' اس افراط کی طرف جو آثار غضبیہ سے حاصل اور پیدا کرتا ہے یعنی آثار غضبیہ کی زیادتی کی طرف اشارہ ہے اور تمام محرمات شرعیہ کی طرف اشارہ ہے۔

اور لفظ ''بغی'' سے استعلاء کی طرف اشارہ ہے جو قوت وہمیہ کی وجہ سے ہو' اسی لیے ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: قرآن مجید میں خیر و بشر کی اس سے زیادہ جامع آیت کوئی نہیں ہے' اس حدیث کو حاکم نے مستدرک میں روایت کیا ہے۔

اور اس کی ایک مثال اللہ تعالیٰ کا یہ قول بھی ہے' ارشاد خداوندی ہے: ''وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ'' (البقرہ:۱۷۹) اور تمہارے لیے قصاص میں حیات ہے' اس کے معنی کثیر ہیں اور الفاظ قلیل ہیں کیونکہ غرض اس سے یہ ہے کہ جب انسان کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ کسی کو قتل کرنے سے خود بھی قتل ہو گا تو پھر کسی کے قتل کی جراءت نہ کرے گا' پس قتل یعنی قصاص سے آپس کی قتل وکشت کا انسداد ہو گیا اور اس میں شک نہیں کہ قتل کا موقوف ہونا انسان کی حیات کا باعث ہے۔

قرآن حکیم کا یہ جملہ اہل عرب کے قول ''القتل انفی للقتل'' پر بیس سے زیادہ وجوہ سے فضیلت رکھتا ہے' حالانکہ اہل عرب کے نزدیک یہ نہایت جامع مثل (کہاوت) ہے۔

مگر ابن اثیر نے اس فضیلت سے انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ خالق اور مخلوق کے کلام میں کوئی تشبیہ نہیں ہو سکتی۔

"انما العلماء یقدحون اذھانھم فیما یظھر لھم من ذلك" ان بیس سے زائد وجوہ فضیلت میں سے چند حسب ذیل ہیں:

(۱) "القصاص حیواۃ" میں دس حروف ہیں اور "القتل انفی للقتل" میں چودہ حروف ہیں۔

(۲) قتل کی نفی حیواۃ کو مستلزم نہیں اور آیت حیوٰۃ کے ثبوت پر نص ہے، جو اصل غرض ہے۔

(۳) حیواۃ کا نکرہ لانا مفید تعظیم ہے اور اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ "قصاص" میں زندگی کی درازی ہے اور اسی درازی حیات کی وجہ سے حیواۃ کی تفسیر بقاء سے کی گئی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا قول "وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ" (البقرہ:۹۶) "اور ضرور تم انہیں پاؤ گے کہ وہ (دنیا کی) زندگی پر سب لوگوں سے زیادہ حرص رکھتے ہیں" مگر "القتل انفی للقتل" میں ایسا نہیں ہے کیونکہ اس میں لام جنسی ہے۔

(۴) آیت میں تکرار نہیں ہے اور "مثل" لفظ قتل کی تکرار پر مشتمل ہے اور گو تکرار مخل فصاحت نہ ہو، مگر جو کلام تکرار سے خالی ہوگا، وہ اس کلام سے جس میں تکرار ہوگی، افضل ہوگا۔

(۵) آیت میں اطراد اور جامعیت ہے اور مثل مذکور میں جامعیت نہیں کیونکہ ہر قتل مانع قتل نہیں ہے، بلکہ بعض قتل موجب قتل ہوتا ہے اور مانع قتل صرف قتل خاص ہے، جو قصاص ہے پس قصاص میں حیات ابدی ہے۔

ایجاز کی دوسری قسم ایجاز الحذف ہے

ایجاز الحذف کے مختلف اسباب ہیں:

(۱) اس حذف کا ایک فائدہ اختصار ہے، اس کے ظہور کی وجہ سے عبث سے احتراز بھی ہے۔

(۲) اس بات پر تنبیہ کرنا کہ محذوف کے ذکر سے وقت قاصر ہے اور اگر اس کے ذکر کرنے میں مشغول ہو گئے، مقصد فوت ہو جائے گا اور یہی فائدہ تحذیر اور اغراء کا ہے، اور اللہ تعالیٰ کا قول: "نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا" (الشمس:۱۳) "اللہ کی اونٹنی (کو ہاتھ لگانے) سے اور اس کے (پانی) پینے (کی باری کو بند کرنے) سے" میں دونوں مجتمع ہیں، کیونکہ "ناقۃ اللہ" تحذیر ہے اور "ذروا" اس میں مقدر ہے اور "سقیاھا" اغراء (برانگیختہ کرنا)

ہے اور "الزموا" اس میں مقدر ہے۔

(۳) ان میں سے ایک تفخیم اور اعظام ہے، کیونکہ اس میں ابہام ہوتا ہے، جیسے اہل جنت کے وصف میں اللہ تعالیٰ کا قول "حَتّٰى اِذَا جَآءُوْهَا وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا" (الزمر:۷۱) "حتیٰ کہ جب وہاں پہنچیں گے اس کے دروازے کھول دیئے جائیں گے" پس اس آیت میں جواب کو حذف کر دیا گیا تاکہ اس بات کی دلیل ہو کہ اہل جنت جو کچھ وہاں پائیں گے، اس کا وصف غیر متناہی اور کلام اس کے وصف سے قاصر ہے اور عقلیں جو چاہیں مقدر کر لیں، مگر جو کچھ وہاں ہے، اس کی حقیقت تک رسائی نہیں ہو سکتی۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا قول "وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ" (الانعام:۲۷) "اور کبھی تم دیکھو جب وہ آگ پر کھڑے کیے جائیں گے" یعنی ایسا خوف ناک منظر ہوگا کہ دیکھنے کی تاب نہ ہوگی اور عبارت اس کے بیان سے قاصر ہے۔

(۴) کبھی تخفیف کے لیے حذف کر دیتے ہیں، کثرت استعمال کی وجہ سے، جیسے حرف نداء کا حذف مثلاً "یوسف اعرض" میں یا حرف نداء حذف ہے۔

(۵) ان وجوہ میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ تعظیماً ذکر نہیں کیا جاتا، جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ہے: "قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ" (الشعراء:۲۴_۲۳) "فرعون بولا: سارے جہاں کا رب کیا ہے؟ موسیٰ نے فرمایا: رب آسمان اور زمین کا" اس آیت میں تین مقامات پر رب سے قبل مبتداء محذوف ہے یعنی "ھو رب ربکم .... اللہ رب المشرق" کیونکہ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے سوال کرنے اور اس کے حال کو ایک عظیم امر خیال فرماتے ہوئے احتراماً اور تعظیماً اللہ تعالیٰ کا اسم مبارک ذکر نہیں کیا۔

(۶) ان میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ کسی چیز کو حقیر اور گھٹیا سمجھ کر زبان کو اس کے ذکر سے بچانے کے لیے ذکر نہ کرنا، جیسے "صُمٌّ بُكْمٌ" (البقرہ:۱۸) یعنی منافقین بہرے گونگے ہیں۔

(۷) عموم مراد لینے کی غرض سے حذف کر دینا، جیسے "وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" (الفاتحہ:۴) یعنی عبادت اور اپنے تمام کاموں میں تجھی سے مدد مانگتے ہیں اور "وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ

السَّلَامِ'' (یونس:۲۵) یعنی اللہ تعالیٰ ہر ایک کو دارالسلام (جنت) کی طرف بلاتا ہے۔

(۸) رعایت فاصلہ کے لیے حذف کرنا' جیسے ''مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى'' (الضحیٰ:۳) ''آپ کے رب نے آپ کو نہیں چھوڑا اور نہ وہ (آپ سے) بیزار ہوا''۔ ''ای وما قلاك''۔

(۹) ابہام کے بعد بیان کے قصد سے حذف کر دینا' جیسے کہ مشیت کے فعل میں مثلاً ''وَلَوْ شَاءَ لَهَدٰكُمْ'' (النحل:۹) ''ای ولو شاء هدايتكم'' یعنی اگر اللہ تعالیٰ تمہاری ہدایت چاہتا۔

اطناب اور اس کے فوائد

اطناب کے کئی فوائد ہیں:

- اس میں سے ایک یہ ہے کہ ''الايضاح بعد الابهام'' یعنی ابہام کے بعد وضاحت کرنا جیسے اس کی مثال ''رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ'' (طٰہٰ:۲۵) ''عرض کی: اے میرے رب! میرا سینہ کھول دے'' ہے اس میں ''اشرح'' کے لفظ سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ متکلم کسی چیز کی شرح کا خواستگار ہے اور ''صدری'' اس طلب کی تفسیر اور اس کا بیان ہے' مقام فرعون کے دربار میں بھیجے جانے کی وجہ سے مصائب میں مبتلا ہونے کا مخبر ہے تاکید کا مقتضی ہے اور ایسے ہی ''اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ'' (الانشراح:۱) ''کیا ہم نے تیرا سینہ کشادہ نہ کیا'' بھی ہے کہ یہ مقام تاکید کا مقتضی ہے' اس وجہ سے کہ یہ امتنان کی جگہ ہے۔
- ان میں سے ایک خاص کا عطف عام پر' اس کا فائدہ یہ ہے کہ اس طرح خاص کی فضیلت پر متنبہ کر کے گویا یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ عام کی جنس سے نہیں ہے یعنی وصف میں متغائر کو تغائر فی الذات کے مرتبہ میں رکھا جاتا ہے' جیسے اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا قول ''حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى'' (البقرہ:۲۳۸) ''نگہبانی کرو سب نمازوں کی اور بیچ کی نماز کی'' اور ''مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ'' (البقرہ:۹۸) ''جو کوئی دشمن ہو اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور جبرائیل اور میکائیل کا''۔
- اور اسی طرح ایک عطف العام علی الخاص ہے' بعض علماء نے غلطی سے اس طرح کے عطف کا وجود تسلیم نہیں کیا ہے' حالانکہ اس کا فائدہ ظاہر ہے یعنی تعمیم اور اول یعنی عام کو

الگ ذکر کرنے کی علت' اس کے حال پر توجہ کرنا اور اس کی اہمیت کو اجاگر کرنا ہے' اس کی مثال ''اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ'' (الانعام:۱۶۳) ''بے شک نماز اور میری قربانیاں'' ہے کہ اس میں ''نسك'' عبادت کی معنی میں ہے اور وہ عام تر ہے۔
اور ''اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ'' (الحجر:۸۷) ''ہم نے تم کو سات آیتیں دیں' جو دہرائی جاتی ہیں اور عظمت والا قرآن''۔

قرآن مجید میں تشبیہ اور استعارہ کا بیان

تشبیہ: یہ بلاغت کی انواع میں سے سب سے اشرف اور اعلیٰ نوع ہے' مبرد نحوی اپنی کتاب ''الکامل'' میں لکھتے ہیں:

اگر کوئی شخص کلام عرب کا بیشتر حصہ تشبیہ سے وابستہ قرار دیتا ہے تو اس کی بات کو بعید از قیاس تصور نہ کرنا چاہیے' ابوالقاسم بن البندار البغدادی نے تشبیہات قرآن کے بیان میں ایک مستقل کتاب تصنیف کی ہے اور اس کا نام ''الجمان'' رکھا ہے اور علماء کی ایک جماعت نے جن میں علامہ سکاکی بھی شامل ہیں' تشبیہ کی تعریف پر بیان کی ہے:

کہ اگر ایک امر اپنے معنی میں کسی دوسرے امر کے ساتھ شرکت رکھنے پر دلالت کرتا ہے تو اس کا نام ہے تشبیہ۔

ادوات تشبیہ تین قسم پر منقسم ہیں:

(۱) حروف (۲) اسماء (۳) اور افعال۔

حروف میں سے کاف ہے' مثلاً ''کرماد'' جیسے اللہ تعالیٰ کے قول میں ''مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ'' (ابراہیم:۱۸) ''اپنے رب سے مشرکوں کا حال ایسا ہے کہ ان کے کام ہیں جیسے راکھ کہ اس پر ہوا کا سخت جھونکا آیا'' اور ''کان'' جیسے ''كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ'' (الصّٰفّٰت:۶۵) ''جیسے دیووں کے سر''۔ ''اسماء'' میں سے ''مثل'' اور شبہ یا ان دونوں کے مانند اور الفاظ جو کہ مماثلت اور مشابہت سے مشتق ہوتے ہیں۔

علامہ طیبی کا بیان ہے کہ ''مثل'' کا لفظ ایسی ہی حالت اور صفت میں استعمال کیا جاتا

ہے' جس کی کوئی شان ہو اور اس میں کچھ غرابت اور ندرت بھی پائی جاتی ہو' جیسے مثلاً ''مَثَلُ مَا يُنْفِقُوْنَ فِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ'' (آل عمران:۱۱۷) ''کہاوت اس کی جو اس دنیا کی زندگی میں خرچ کرتے ہیں اس ہوا کی سی ہے جس میں پالا ہو'' ہے اور قول باری تعالیٰ ''اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ (تا قولہ تعالیٰ) كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ '' (یونس:۲۴) ''دنیا کی زندگی کی کہاوت تو ایسی ہے جیسے وہ پانی کہ ہم نے آسمان سے اتارا...... گویا کل تھی ہی نہیں''۔

اس آیت کریمہ میں دس دس جملے ہیں اور ان سب سے مل کر مجموعی طور پر تشبیہ کی ترکیب اس حیثیت سے واقع ہوئی ہے کہ اس میں کچھ بھی ساقط ہو جائے تو تشبیہ میں خلل واقع ہو جائے گا۔ اس لیے کہ یہاں دنیا کی حالت کو اس کے جلد تر گزر جانے' اس کی نعمتوں کے فنا کے گھاٹ اترنے اور لوگوں کے اس پر فریفتہ ہونے کے بارے میں اس پانی کی حالت سے مشابہ کرنا مقصود تھا' جو کہ آسمانوں سے نازل ہوا اور اس نے انواع و اقسام کی جڑی بوٹیاں اگائیں اور اس سرسبز گھاس اور رنگ برنگ پودوں اور پھولوں نے اپنی گل کاری سے روئے زمین کو دیدہ زیب اور دلکش پوشاک سندس پہنا کر دلہن کی طرح سنوار دیا' یہاں تک کہ جب اہل دنیا اس دنیا کی طرف مائل ہوئے اور انہوں نے گمان کیا کہ اب یہ دنیا تمام خرابیوں اور زوال سے بَری ہے تو یکایک اللہ تعالیٰ کا عذاب اس پر نازل ہوا اور اس طرح مٹ گئی کہ گویا کل تک کوئی چیز ہی نہ تھی۔

استعارہ قرآنیہ کا بیان

استعارہ وہ لفظ ہے' جو اس چیز میں استعمال کیا جائے جو چیز اصلی معنی کے ساتھ مشابہ ہے۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ استعارہ کی حقیقت یہ ہے کہ کلمہ کسی معروف بہا' شئے سے غیر معروف شئی کے لیے عاریتاً لے لیا جائے' اس کا فائدہ اور حکمت ایک خفی چیز کا اظہار اور ایسے اظہار کی مزید وضاحت کرنا ہوتی ہے' جو کہ جلی نہیں ہوتا' حصول مبالغہ کی غرض سے ایسا کیا جاتا ہے یا یہ سب باتیں مقصود ہوتی ہیں۔

اظہار خفی کی مثال اللہ تعالیٰ کا قول ''وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ '' (الزخرف:۴) اور بے

شک وہ اصل کتاب میں ہے'' کہ اس کی حقیقت ''وانه فی اصل الكتاب'' تھی' چنانچہ اصل کے لیے ''ام'' کا لفظ مستعار لے لیا گیا اور اس کی علت یہ ہے کہ جس طرح اصل سے فرع کا نشوونما ہوتا ہے' اسی طرح ماں اولاد کے نشوونما پانے کی جگہ ہے اور اس کی حکمت یہ ہے کہ جو چیز مرئی (دکھائی دینے والی) نہیں' اس کی ایسی مثال پیش کی جائے کہ وہ مرئی ہو جائے اور اس طرح سننے والا سماع کی حد سے منتقل ہو کر آنکھوں سے دیکھنے کی حد میں پہنچ جائے' یہ چیز علم بیان میں حد درجہ بلیغ ہے۔

اور جو چیز کہ جلی (روشن) نہیں ہے' اس کے ایضاح کی ایسی مثال کہ وہ جلی ہو جائے' قول باری تعالیٰ ''وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ '' (بنی اسرائیل:۲۴) ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ بیٹے کو رحمت اور مہربانی کے طور پر ماں باپ کے سامنے عاجزی کرنے کا حکم دیا جائے۔ ''لھما'' لفظ ''ذل'' کے ساتھ پہلے ''جانب'' کی طرف استعارہ کیا گیا' اس استعارہ کی قریب تر تقدیر ہے ''واخفض لھما جانب الذل'' یعنی تو فروتنی کے ساتھ اپنے پہلو کو جھکا۔ اور یہاں استعارہ کی حکمت یہ ہے کہ نا قابل دید چیز کو نمایاں اور نظروں کے سامنے کر دیا جائے' تاکہ بیان میں حسن پیدا ہو اور چونکہ اس مقام پر مراد یہ تھی کہ بیٹا اپنے والدین کے سامنے عاجزی اور انکساری کرے کہ کوئی ممکن پہلو فروتنی کا باقی نہ چھوڑے' اس لیے یہ ضرورت ہوئی کہ استعارہ میں ایسا لفظ لیا جائے' جو کہ پہلے لفظ سے زیادہ بلیغ ہو' چنانچہ اس غرض سے ''جناح'' کا لفظ لیا گیا' اس میں اس طرح کے معنی پائے جاتے ہیں' جو پہلو جھکانے سے حاصل نہیں ہوتے' مثلاً پہلو کا جھکانا یہ بھی ہے کہ کوئی شخص اپنا بازو تھوڑا سا نیچا کر دے اور یہاں مراد یہ ہے کہ اس قدر جھکے کہ پہلو زمین سے مل جائے' گویا بالکل فرش ہو جائے اور یہ بات بجز اس کے پرندوں کی طرح کے پروں کا ذکر کیا جائے اور کسی صورت میں ممکن نہیں تھی۔

اور مبالغہ کی مثال ہے' قول باری تعالیٰ: ''وَفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا'' (القمر:۱۲) کہ اس حقیقت ''وفجرنا عیون الارض'' ہے یعنی ہم نے زمین کے چشموں کو جاری کیا لیکن اگر اسی طرح اس کی تعبیر کر دی جاتی تو اس میں وہ مبالغہ کبھی نہ آتا' جو کہ پہلی عبارت میں ہے اور یہ ظاہر کرتا ہے کہ تمام روئے زمین چشموں کا منبع و مرکز بن گئی ہے۔

قرآن حکیم کے کنایہ اور تعریض کا بیان

بلاغت کی انواع اور اسالیب فصاحت میں سے کنایہ اور تعریض بھی ہیں اور یہ بھی واضح رہے کہ کنایہ تصریح کی بہ نسبت زیادہ بلیغ ہوتا ہے' اہل بیان نے کنایہ کی تعریف یہ کی ہے کہ کنایہ ایسا لفظ ہوتا ہے' جس سے اس کے معنی کا لازم مراد لیا جائے۔

کنایہ کے کئی اسباب ہیں:

(۱) قدرت کی عظمت اور زیادتی پر تنبیہ کرنا مقصود ہوتا ہے' جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ''هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ'' (الاعراف:۱۸۹) ''وہی ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا'' یہاں نفس واحدہ حضرت آدم علیہ السلام سے کنایہ ہے۔

(۲) دوسرا سبب یہ ہے کہ کنایہ اس لیے کرتے ہیں کہ تصریح کرنا قبیح اور بُرا متصور ہوتا ہے' چنانچہ ایسی جگہ کنایہ ہی مناسب ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے جماع کے لیے ''ملامسہ' مباشرہ' افضاء' رفث' دخول'' اور ''سر'' قول باری تعالیٰ ''وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا'' (البقرہ:۲۳۵) ''ہاں ان سے خفیہ وعدہ نہ رکھو'' میں کے ساتھ بہ طور کنایہ بیان فرمایا ہے۔

(۳) تیسرا سبب بلاغت اور مبالغہ کا قصد ہے' جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ''اَوَ مَنْ يُّنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ O'' (الزخرف:۱۸) ''اور کیا وہ جو گہنے میں پروان چڑھے اور بحث میں صاف بات نہ کرے'' اس میں عورتوں کی نسبت یہ کنایہ کیا ہے کہ وہ آرام پسندی اور بناؤ سنگار کے شوق میں پروان چڑھ کر ایسی ہوتی ہیں کہ معاملات میں غور کرنا اور باریک معانی کو سمجھنا ان کے بس کا روگ نہیں ہے۔

اگر اللہ تعالیٰ یہاں پر ''النساء'' کا لفظ لاتا تو اس سے یہ بات ہرگز نہ نکلتی اور پھر مقصد یہ تھا کہ ملائکہ سے اس بات کی نفی کی جائے اور اللہ تعالیٰ کا قول ''بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوْطَتَانِ'' (المائدہ:۶۴) ''بلکہ اس کے ہاتھ کشادہ ہیں'' اللہ کے جود و کرم کی بے کراں وسعت سے کنایہ ہے۔

(۴) چوتھا سبب یہ ہے کہ اختصار مقصود ہوتا ہے' مثلاً متعدد الفاظ کو محض ایک ''فعل'' کے لفظ

کے ساتھ کنایہ کرنا' جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ''لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ O'' (المائدہ:۷۹) ''ضرور بہت ہی بُرے کام کرتے ہیں''۔ ''فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا'' (البقرہ:۲۴) ''پھر اگر نہ لاسکو اور ہم فرمائے دیتے ہیں کہ ہرگز نہ لاسکو گے'' اور ان سب سے مراد یہ ہے کہ اگر وہ کوئی سورت قرآن کے مثل نہ لاسکیں۔

(۵) پانچواں سبب کسی شخص کے انجام پر آگاہ کرنے کی غرض سے کنایہ کیا جاتا ہے' مثلاً قول باری تعالیٰ ''تَبَّتْ يَدَا اَبِيْ لَهَبٍ'' (اللہب:۱) یعنی وہ جہنمی ہے اور آخر کار اس کا ٹھکانا اور لوٹنے کی جگہ ''لهب'' یعنی آتش دوزخ ہے۔

اور ''حَمَّالَةَ الْحَطَبِ O فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ'' (اللہب:۵-۴) یعنی چغل خور عورت کا مقام آخرت اور اس کا انجام کار یہ ہوگا کہ وہ جہنم کا ایندھن بنے گی اور اس کی گردن میں طوق ہوگا۔

تعریض: تعریض کنایہ کے قریب المعنی ہے' ان دونوں کے درمیان فرق بہت باریک سا ہے۔

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ کا قول ہے:

کنایہ اور تعریض کا فرق لوگوں نے مختلف الفاظ میں بیان کیا ہے اور وہ فرق تقریباً ایک ہی طرح کی عبارتوں پر مشتمل ہے۔

علامہ زمخشری کا قول ہے کہ ایک چیز کو اس کے لفظ موضوع لہ کے سوا دوسرے لفظ کے ساتھ ذکر کرنا کنایہ ہے۔

اور تعریض یہ ہے کہ ایک شے کا ذکر اس غرض سے کیا جائے کہ اس سے غیر مذکور شے پر دلالت قائم ہو سکے۔

علامہ سکاکی بیان کرتے ہیں:

تعریض وہ ہے جس کا بیان کسی غیر مذکور موصوف کے لیے کیا جاتا ہے۔

اور منجملہ تعریض کے ایک بات یہ ہے کہ مخاطب ایک شخص ہو اور مراد کوئی اور شخص ہو۔

O اور تعریض کبھی اس غرض سے ہوتی ہے کہ موصوف کی قدرت و منزلت کی بلندی کو ظاہر کیا جائے' جیسے ''وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ'' (البقرہ:۲۵۳) ''اور کوئی وہ ہے جسے سب

پردر جوں بلند کیا"۔
یعنی محمد مصطفےٰ علیہ التحیۃ والثناء کا نام اسمِ گرامی ایسا ہے، جو کبھی مشتبہ نہیں ہو سکتا۔

O یا مخاطب سے لطف آمیز لہجہ میں گفتگو کرنے اور سخت کلامی سے احتراز کرنے کے لیے تعریض کو استعمال کرتے ہیں۔

مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:
"لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ" (الزمر:۶۵) "(اے مخاطب!) اگر تو نے اللہ کے ساتھ شریک کیا تو تیرے سب عمل ضرور ضائع ہو جائیں گے"۔
اس آیت کریمہ میں بہ ظاہر روئے سخن حضور ﷺ کی طرف ہے، مگر مراد دوسرے لوگ ہیں، اس کہ وجہ یہ ہے کہ حضور ﷺ سے شرک کا وقوع محال ہے۔

خبر اور انشاء کا بیان

کلام کی صرف دو قسمیں ہیں: خبر اور انشاء۔
علم نحو کے ماہرین اور تمام اہل بلاغت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ کلام خبر اور انشاء صرف دو ہی قسموں میں منحصر ہے۔ ان کے سوا کلام کی کوئی تیسری قسم نہیں ہے۔
خبر: وہ کلام ہے جس میں صدق اور کذب داخل ہوتا ہے اور انشاء اس کے خلاف ہے۔
خبر کے مقاصد: خبر سے مقصود مخاطب کو کسی حکم کا فائدہ پہنچانا ہوتا ہے اور کبھی خبر، اس مقصد کے علاوہ دیگر اغراض کے لیے بھی آتی ہے، جو حسب ذیل ہیں:

(۱) امر کے معنی میں، جیسے "وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ" (البقرہ:۲۳۳) اور مائیں دودھ پلائیں۔

(۲) نہی کے معنی میں، جیسے "لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ O" (الواقعہ:۷۹) نہ چھوئیں اسے مگر پاک لوگ۔

(۳) دعا کے معنی میں، جیسے "اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" (الفاتحہ:۴) اور تجھی سے مدد چاہیں۔

(۴) دعا ضرر و ہلاکت کے معنی میں "تَبَّتْ يَدَآ اَبِىْ لَهَبٍ وَّتَبَّ" (اللہب:۱) تباہ ہو جائیں ابولہب کے دونوں ہاتھ، اور وہ تباہ ہو ہی گیا۔

اسی طرح "غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا" (المائدہ:۶۴) خود ان کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اور ان کے اسی قول کی وجہ سے ان پر لعنت کی گئی۔
بعض علماء نے "حصرت صدورهم" کو بھی اسی قبیل سے قرار دیا ہے اور کہا کہ یہ ان کے خلاف دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان منافقین مدینہ کے دلوں کو یوں ہی تنگی اور گھٹن میں رکھے کہ وہ بد بخت جنگ احد کے لیے آمادہ نہ تھے۔

فصل

انشاء کی اقسام میں سے ایک قسم استفہام ہے اور وہ استخبار کے معنی میں آتا ہے، یعنی کسی چیز کے بارے میں کچھ دریافت کرنا اور پوچھنا۔ اور جس لفظ کے ساتھ کوئی بات پوچھی جائے، اسے "ادات" استفہام کہتے ہیں۔

ادوات استفہام کا بیان

(۱) ہمزہ مفتوح یعنی اس کا مطلب ہے: کیا۔
(۲) "هَلْ" اس کا مطلب ہے: کیا؟
(۳) "مَا" کیا چیز؟
(۴) "مَنْ" کون اور کس نے؟
(۵) "اَىّ" کون سا؟
(۶) "كَمْ" کتنے؟
(۷) "كَيْفَ" کیسے؟
(۸) "اَيْنَ" کہاں؟
(۹) "اَنّٰى" کیسے، کہاں سے، کب؟
(۱۰) "مَتٰى" کب؟
(۱۱) "اَيَّانَ" کب؟

استفہام کئی معنوں کے لیے آتا ہے۔
(۱) انکار: اس میں نفی کے لحاظ سے استفہامیہ مفہوم پایا جاتا ہے اور اس کا مابعد منفی ہوتا ہے، اسی

وجہ سے اس کے ساتھ "اِلَّا" حرف استثناء ضرور آتا ہے۔ جیسے ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفَاسِقُوْنَO" (الاحقاف:۳۵) "تو کون ہلاک کیے جائیں گے مگر بے حکم لوگ" اور "وَهَلْ نُجْزِیْ اِلَّا الْكَفُوْرَ" (سبا:۱۷) "اور ہم کسے سزا دیتے اسی کو جو ناشکرا ہے" اور قول باری تعالیٰ "مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نَّاصِرِيْنَ" (الروم:۲۹) "جسے خدا نے گمراہ کر دیا اور ان کا کوئی مددگار نہیں" میں ایسے ہی استفہام پر منفی کا عطف ڈالا گیا ہے' جس کا معنی ہوا "لا یهدی" اور اسی کی مثالیں ہیں۔ "اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ" (الشعراء:۱۱۱) "بولے: کیا ہم تم پر ایمان لے آئیں اور تمہارے ساتھ کمینے ہوئے ہیں"۔

- "اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا (ای لا نومن)" (المؤمنون:۴۷) "کیا ہم ایمان لے آئیں اپنے جیسے دو آدمیوں پر"۔
- "اَمْ لَهُ الْبَنَاتُ وَلَكُمُ الْبَنُوْنَO" (طور:۳۹) "کیا اس کو بیٹیاں اور تم کو بیٹے"۔
- "اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى" (النجم:۲۱) (یعنی "لا یکون هذا") کیا تم کو بیٹا اور اس کو بیٹی۔
- "اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ" (الزخرف:۱۹) (یعنی "ما شهدوا") کیا ان کے بناتے وقت یہ حاضر تھے۔

اور اکثر احوال میں تکذیب بھی اس کے ساتھ ہی پائی جاتی ہے اور وہ ماضی میں بہ معنی "لم یکن" اور مستقبل میں بہ معنی "لا یکون" آتی ہے' جیسے اس کی مثال ہے: "اَفَاَصْفٰكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ" (بنی اسرائیل:۴۰) "کیا تمہارے رب نے تم کو بیٹے چن لیا" (یعنی "لم یفعل ذلك") اور قول باری تعالیٰ "اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ" (هود:۲۸) (یعنی "لا یکون هذا الالزام") کیا ہم اسے تمہارے چپیٹ دیں اور تم بیزار ہو۔

- دوسرا معنی "توبیخ" ہے اور اسی کو "تفریع" سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ مثالیں:
(ا) "اَفَعَصَيْتَ اَمْرِیْ" (طٰہٰ:۹۳) تو کیا تم نے میرا حکم نہ مانا (ب) "اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ" (الصّٰفّٰت:۹۵) کیا اپنے ہاتھ کے تراشوں کو پوجتے ہو (ج) "اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا وَّتَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخَالِقِيْنَ" (الصّٰفّٰت:۱۲۵) کیا بعل کو پوجتے ہو اور چھوڑتے ہو سب سے اچھا پیدا کرنے والا' اور توبیخ زیادہ تر ایسے امور پر ہوتی ہے' جو ثابت اور واقع

ہوں اور ان کے کرنے پر ڈانٹ پلائی جاتی ہے کہ ایسا کیوں کیا ہے جیسا کہ اس کی مثال گزر چکی ہے۔

اور کبھی تو یہ کسی عمل کے ترک کیے جانے پر ہوتی ہے کہ جس کو کرنا چاہیے تھا اور اسے چھوڑنا موزوں اور مناسب نہ تھا۔

جیسے اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے:

"اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ" (فاطر:۳۷) اور کیا ہم نے تمہیں وہ عمر نہ دی تھی جس میں سمجھ لیتا جسے سمجھنا ہوتا۔

اور نیز یہ آیت "اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا" (النساء:۹۷) "کیا اللہ کی زمین کشادہ نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے"۔

تیسرا معنی "تقریر" ہے اور وہ مخاطب کو کسی ایسے امر کے اقرار اور اعتراف پر آمادہ کرنے کا نام ہے' جو اس کے نزدیک ثابت شدہ اور قرار پذیر ہو چکا ہو' اسی وجہ سے اس پر صریح موجب (مثبت) کلام کا عطف کیا جاتا ہے اور اس کا عطف بھی صریح موجب کلام پر ہی کیا جاتا ہے۔

اوّل یعنی اس پر کلام موجب کے عطف کیے جانے کی مثال' اللہ تعالیٰ کا ارشاد "وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ" (الانشراح:۱-۲) "کیا ہم نے تمہارا سینہ کشادہ نہ کیا اور تم پر سے تمہارا بوجھ اتار لیا"۔

"اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى" (الضحیٰ:۶) "کیا اس نے تمہیں یتیم نہ پایا پھر جگہ دی"۔

"اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِیْ تَضْلِيْلٍ" (الفیل:۲) "کیا ان کا داؤ تباہی میں نہ ڈالا"۔

اور دوسری شق (یعنی استفہام تقریری کے کلام موجب پر معطوف ہونے) کی مثال ہے:

"اَكَذَّبْتُمْ بِاٰيٰتِیْ وَلَمْ تُحِيْطُوْا بِهَا عِلْمًا" (النمل:۸۴) "کیا تم نے میری آیتیں جھٹلائیں حالانکہ تمہارا علم ان تک نہ پہنچا تھا"۔

جیسا کہ علامہ جرجانی نے تقریر کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ یہ آیت اللہ تعالیٰ کے قول "وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا" (النمل:۱۴) کے قبیل سے ہے (اور

ان کے منکر ہوئے اور ان دلوں میں ان کا یقین تھا' ظلم اور تکبر سے) اور استفہام تقریر کی حقیقت یہ ہے کہ وہ استفہام انکاری ہے اور انکار نفی ہے (اور بے شک وہ نفی پر داخل ہوا ہے) اور یہ مسلمہ قاعدہ ہے کہ نفی کی نفی اثبات ہوتا ہے' استفہام تقریری کی مثالوں میں سے ایک یہ ہے: ''اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ'' (الزمر:۳۶) ''کیا اللہ اپنے بندہ کو کافی نہیں''۔

اسی طرح یہ آیت بھی ہے: ''اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ'' (الاعراف:۱۷۲) ''کیا میں تمہارا رب نہیں''۔

علامہ زمخشری نے ارشادِ خداوندی ''اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ'' (البقرہ:۱۰۶) ''کیا تجھے خبر نہیں کہ اللہ سب کچھ کر سکتا ہے' کو بھی اس کی مثال بتایا ہے''۔

چوتھا معنی ''تعجب یا تعجیب'' ہے' مثلاً ''کَیْفَ تَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ'' (البقرہ:۲۸) ''بھلا تم کیونکہ خدا کے منکر ہوئے'' اور ''مَالِیَ لَآ اَرَی الْھُدْ ھُدَ'' (النمل:۲۰) ''کیا ہوا کہ میں ہدہد کو نہیں دیکھتا'' اور یہ قسم اور سابق دونوں قسموں کو اکٹھی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ قول ''اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ'' (البقرہ:۴۴) ''کیا لوگوں کو بھلائی کا حکم دیتے ہو'' ہے۔

علامہ زمخشری نے کہا کہ اس آیت میں ہمزہ استفہام تقریر کے معنی میں توبیخ کے ساتھ وارد ہے اور ان کی حالت پر اظہار تعجب بھی ہے۔ اور آیت کریمہ ''مَا وَلّٰھُمْ عَنْ قِبْلَتِھِمُ'' (البقرہ:۱۴۲) ''پھیر دیا مسلمانوں کو ان کے قبلہ سے'' میں تعجب اور استفہام حقیقی دونوں کا احتمال موجود ہے۔

پانچواں معنی ہے: ''عتاب'' (ناراضگی اور خفگی کا اظہار کرنا) جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ''اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ'' (الحدید:۱۶) ''کیا ایمان والوں کو ابھی وہ وقت نہ آیا کہ ان کے دل جھک جائیں اللہ کی یاد کے لیے'' اور سب سے لطیف عتاب وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب افضل کائنات ﷺ پر کیا ہے' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''عَفَا اللّٰہُ عَنْکَ لِمَ اَذِنْتَ لَھُمْ'' (التوبہ:۴۳) ''اللہ تمہیں معاف کرے تم نے انہیں کیوں اذن دے دیا''۔

چھٹا معنی ''تذکیر'' ہے (جس کا مطلب یاد دہانی اور تجدید عہد ہے) اس میں ایک قسم کا اختصار پایا جاتا ہے' مثلاً اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ''اَلَمْ اَعْھَدْ اِلَیْکُمْ یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا

تَعْبُدُوا الشَّیْطٰنَ'' (یٰس:۶۰) ''اے اولادِ آدم! کیا میں نے تم سے عہد نہ لیا تھا کہ شیطان کو نہ پوجنا بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے'' اور ''اَلَمْ اَقُلْ لَّکُمْ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ'' (البقرہ:۳۳) ''فرمایا: میں نہ کہتا تھا کہ میں جانتا ہوں آسمانوں اور زمین کی سب چھپی ہوئی چیزیں''۔

''ھَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِیُوْسُفَ وَاَخِیْہِ'' (یوسف:۸۹) ''(بولے:) کچھ خبر ہے تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا کیا تھا؟''

ساتواں معنی ہے: ''افتخار'' جیسے ''اَلَیْسَ لِیْ مُلْکُ مِصْرَ'' (الزخرف:۵۱) ''کیا میرے لیے مصر کی سلطنت نہیں''۔

آٹھواں معنی ''تفخیم'' (عظمت اور بڑائی کا اظہار) جیسے ''مَالِ ھٰذَا الْکِتٰبِ لَا یُغَادِرُ صَغِیْرَۃً وَّلَا کَبِیْرَۃً'' (الکہف:۴۹) ''اس نوشتہ کو کیا ہوا نہ اس نے کوئی چھوٹا گناہ چھوڑا اور نہ بڑا''۔

نواں معنی ''تہویل اور تخویف'' ہے (ڈرانا) مثلاً ''اَلْحَآقَّۃُ O مَا الْحَآقَّۃُ O'' (الحاقہ:۲۔۱) ''وہ حق ہونے والی کیسی O وہ حق ہونے والی O'' اور ''اَلْقَارِعَۃُ O مَا الْقَارِعَۃُ'' (القارعہ:۲۔۱) ''دل دہلانے والی O کیا وہ دل دہلانے والی O''

دسواں معنی سابق کے برعکس ہے اور وہ ہے ''تسہیل اور تخفیف'' (یعنی آسانی اور نرمی) جیسے ''وَمَا ذَا عَلَیْھِمْ لَوْ اٰمَنُوْا'' (النساء:۳۹) ''اور ان کا کیا نقصان تھا اگر ایمان لاتے''۔

گیارھواں معنی ''تہدید اور وعید'' ہے (دھمکی دینا) جیسے ''اَلَمْ نُھْلِکِ الْاَوَّلِیْنَ'' (المرسلات:۱۶) ''کیا ہم نے اگلوں کو ہلاک نہ فرمایا''۔

بارھواں معنی ''تسویہ'' ہے' یہ وہ استفہام ہے جو ایسے جملہ پر داخل ہوتا ہے' جس کی جگہ مصدر کو لانا صحیح ہوتا ہے' جیسے ''سَوَآءٌ عَلَیْھِمْ ءَاَنْذَرْتَھُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْھُمْ'' (البقرہ:۶) ''انہیں برابر ہے چاہے تم انہیں ڈراؤ یا نہ ڈراؤ''۔

تیرھواں معنی ہے: ''امر'' جیسے ''اسلمتم'' یعنی ''اسلموا فھل انتم منتھون'' یعنی ''انتھوا'' اور ''اتصبرون'' یعنی ''اصبروا''۔

چودھواں معنی ''تنبیہ'' ہے اور وہ امر ہی کی ایک قسم ہے' جیسے ''اَلَمْ تَرَ اِلٰی رَبِّکَ کَیْفَ مَدَّ الظِّلَّ'' (ای انظر) (الفرقان:۴۵) ''اے محبوب! کیا تم نے اپنے رب کو نہ دیکھا کیسا

پھیلایا سایا''۔

پندرھواں معنی ہے: ''ترغیب'' (رغبت دلانا) جیسے ''مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا'' (الحدید:۱۱) ''کون ہے جو اللہ کو قرض دے اچھا قرض'' اور ''ھَلْ اَدُلُّکُمْ عَلٰی تِجَارَۃٍ تُنْجِیْکُمْ'' (الصف:۱۰) ''کیا میں بتادوں وہ تجارت جو تمہیں دردناک عذاب سے بچائے''۔

سولھواں معنی ہے: ''نہی'' جیسے ''اَتَخْشَوْنَھُمْ فَاللّٰہُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْہُ'' (التوبہ:۱۳) ''کیا ان سے ڈرتے ہو تو اللہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس سے ڈرو'' اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: ''فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ'' (المائدہ:۴۴) ''لوگوں سے خوف نہ کرو اور مجھ سے ڈرو''۔

اور اللہ تعالیٰ کا یہ قول ''مَا غَرَّکَ بِرَبِّکَ الْکَرِیْمِ'' (الانفطار:۶) (یعنی ''لا تغتر'') ''کس چیز نے فریب دیا ہے' اپنے کرم والے رب سے''۔

سترھواں معنی ہے: ''دعاء'' اور یہ بھی نہیں کی طرح ہے' مگر یہ کہ دعاء ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ہوتی ہے' جیسے مثلاً ''اَتُھْلِکُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَھَآءُ'' یعنی ''اَتُھْلِکُنَا'' (الاعراف:۱۵۵) ''کیا تو ہمیں اس کام پر ہلاک فرمائے گا جو ہمارے بے عقلوں نے کیا''۔

اٹھارھواں معنی ہے: ''استرشاد'' (طلب ہدایت) جیسے ''اَتَجْعَلُ فِیْھَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْھَا'' (البقرہ:۳۰) ''کیا ایسے کو نائب کرے گا' جو ان میں فساد پھیلائے''۔

فصل

انشاء کی ایک قسم امر ہے اور امر طلب فعل کا نام ہے نہ کہ فعل سے رکنے کا اور امر کا صیغہ ''افعل'' اور ''لیفعل'' ہے' امر ایجاب کے معنی میں حقیقت ہے جیسے ''اقیموا الصلوہ'' نماز قائم کرو' ''فلیصوا معك'' امر کے مجازی معانی۔

امر کے مجازی معانی

امر کے حقیقی معنی تو وجوب ہے اور کبھی امر دیگر معنوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور وہ اس کے مجازی معنی ہیں' جیسے:

(۱) ندب ہے' اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ''وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَہٗ

وَاَنْصِتُوْا'' (الاعراف:۲۰۴) ''اور جب قرآن پڑھا جائے تو اسے کان لگا کر سنو اور خاموش رہو''۔

(۲) اباحت' جیسے ''فَکَاتِبُوْھُمْ'' (النور:۳۳) ''تو انہیں آزادی لکھ دو''۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اس آیت میں امر اباحت کے لیے وارد ہوا ہے اور اسی قسم سے یہ قول بھی ہے' اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

''وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا'' (المائدہ:۲) ''اور جب احرام سے فارغ ہو جاؤ تو شکار کر سکتے ہو'' ظاہر ہے شکار کرنا واجب نہیں ہے مباح ہے۔

(۳) دعاء' یہ ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف امر ہوتا ہے' جیسے ''رَبِّ اغْفِرْلِیْ'' (نوح:۲۸) ''اے میرے رب! مجھے بخش دے''۔

(۴) تہدید (دھمکی)' جیسے ''اعملوا ما شئتم'' (حٰم السجدہ:۴۰) ''جو جی میں آئے کرو'' کیونکہ یہاں یہ مراد نہیں ہے کہ ان کو امر دیا جا رہا ہے کہ وہ جو چاہیں کریں۔

(۵) اہانت' مثلاً ''ذُقْ اِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْکَرِیْمُ'' (الدخان:۴۹) ''چکھ ہاں ہاں تو ہی بڑا عزت والا کرم والا ہے''۔

(۶) تسخیر' یعنی ذلیل بنانے کے لیے' جیسے ''کُوْنُوْا قِرَدَۃً'' (البقرہ:۶۵) ''کہ ہو جاؤ بندر''۔ اس میں ان معذب لوگوں کے ایک صورت سے دوسری صورت میں منتقل ہونے کو تعبیر کیا ہے اور یہ تبدیلی شکل ان کو ذلیل و رسوا کرنے کے لیے تھی اور یہ اہانت سے خاص تر امر ہے۔

(۷) تعجیز (عاجز بنا دینا)' جیسے ''فَاْتُوْا بِسُوْرَۃٍ مِّنْ مِّثْلِہٖ'' (البقرہ:۲۳) ''تو اس جیسی ایک سورت تو لے آؤ'' کیونکہ مراد ان سے اس بات کو طلب کرنا نہیں ہے بلکہ ان کے عجز کا اظہار مقصود ہے۔

○ امتنان (احسان جتانا)' جیسے ''کُلُوْا مِنْ ثَمَرِہٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ'' (الانعام:۱۴۱) ''کھاؤ اس کا پھل جب پھل لائے''۔

○ تعجب جیسے ''اُنْظُرْ کَیْفَ ضَرَبُوْا لَکَ الْاَمْثَالَ'' (بنی اسرائیل:۴۸) ''دیکھو انہوں نے تمہیں کیسی تشبیہیں دیں''۔

- تسویہ (برابر کرنا) جیسے ''فَاصْبِرُوْٓا اَوْ لَا تَصْبِرُوْا'' (الطور:١٦) ''اب چاہو صبر کرو یا نہ کرو''۔
- ارشاد جیسے ''وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَایَعْتُمْ'' (البقرہ:٢٨٢) ''اور جب خرید وفروخت کرو تو گواہ کرلو''۔
- احتقار (حقیر جاننا) جیسے ''اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ'' (الشعراء:٤٣) ''ڈالو جو تمہیں ڈالنا ہے''۔
- انذار (ڈرانا) جیسے ''قُلْ تَمَتَّعُوْا'' (ابراہیم:٣٠) ''فرمادیجیے (کچھ) فائدہ اٹھالو''۔
- اکرام جیسے ''اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ'' (الحجر:٤٦) ''(ان سے کہا جائے گا:) تم ان میں داخل ہوجاؤ سلامتی کے ساتھ''۔
- انعام (نعمت کی یاد دہانی) جیسے ''كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ'' (الانعام:١٤٢) ''کھاؤ اس سے جو اللہ نے تمہیں رزق دیا''۔
- تکذیب' جیسے ''قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ'' (آل عمران:٩٣) ''تم فرماؤ توریت لا کر پڑھو''۔

''قُلْ هَلُمَّ شُهَدَآءَكُمُ الَّذِيْنَ يَشْهَدُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا'' (الانعام:١٥٠) ''آپ فرمائیں: تم اپنے وہ گواہ لاؤ جو گواہی دیں اللہ نے اسے حرام کیا''۔

- مشورہ' جیسے ''فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى'' (الصّٰفّٰت:١٠٢) ''اب تو دیکھ تیری کیا رائے ہے''۔
- اعتبار' جیسے ''اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ'' (الانعام:٩٩) ''اس کا پھل دیکھو جب پھلے''۔

فصل

نہی بھی انشاء کی ایک قسم ہے' نہی کسی کام سے رکنے کے مطالبہ کو کہتے ہیں' نہی کا صیغہ ''لا تفعل'' ہے۔

نہی کا حقیقی معنی تحریم ہے اور مجازاً دیگر معانی کے لیے بھی اس کا ورود ہوتا ہے' جو حسب ذیل ہیں:

(١) کراہت جیسے ''وَلَا تَمْشِ فِى الْاَرْضِ مَرَحًا'' (بنی اسرائیل:٣٧) ''اور زمین میں اتراتا نہ چل''۔

(٢) دعاء جیسے ''رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا'' (آل عمران:٨) ''اے رب! ہمارے دل ٹیڑھے نہ کر''۔

(٣) ارشاد جیسے ''لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ'' (المائدہ:١٠١) ''ایسی باتیں نہ پوچھو جو تم پر ظاہر کی جائیں تو تمہیں بری لگیں''۔

(٤) تسویہ جیسے ''اَوْ لَا تَصْبِرُوْا'' (الطور:١٦) ''(اب چاہو) صبر کرو یا نہ کرو''۔

(٥) احتقار اور تقلیل جیسے ''وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ'' (طٰہٰ:١٣١) ''اور اے سننے والے! اپنی آنکھیں نہ پھیلا'' یعنی وہ چیز قلیل اور حقیر ہے۔

(٦) عاقبت' مثلاً ''وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَآءٌ'' (آل عمران:١٦٩) ''اور جو اللہ کی راہ میں مارے گئے' ہرگز انہیں مردہ نہ خیال کرو بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں'' یعنی جہاد کا انجام حیات ہے موت نہیں۔

(٧) یاس (ناامیدی) جیسے ''لَا تَعْتَذِرُوْا'' (التوبہ:٦٦) ''بہانے نہ بناؤ''۔

(٨) اہانت' جیسے ''اخْسَئُوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ'' (المؤمنون:١٠٨) ''(رب فرمائے گا:) دھتکارے پڑے رہو اس میں اور مجھ سے بات نہ کرو''۔

سورتوں کے فواتح کا بیان

واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کی سورتوں کا آغاز کلام کی دس انواع کے ساتھ فرمایا ہے اور کوئی سورت ایسی نہیں جو ان دس انواع میں سے کسی نہ کسی نوع میں داخل نہ ہو۔

- پہلی نوع اللہ تعالیٰ کا ثناء کرنا ہے' چنانچہ پانچ سورتوں میں تحمید ہے اور دو سورتوں میں ''تبارك'' سے اور سات سورتوں میں تسبیح سے افتتاح فرمایا ہے۔
- دوسری نوع حروف تہجی ہیں' ان کے ساتھ انتیس سورتوں کو شروع کیا ہے۔
- تیسری نوع نداء ہے' یہ دس سورتوں میں وارد ہوئی ہے' پانچ سورتوں میں رسول کریم ﷺ کو نداء کی گئی ہے' جن کے نام یہ ہیں: الاحزاب' الطلاق' التحریم' المزمل اور المدثر

اور پانچ سورتوں میں امت کو نداء کی گئی ہے' جو حسب ذیل ہیں: النساء' المائدہ' الحج' الحجرات اور الممتحنہ۔

○ چوتھی خبر یہ جملے ہیں' مثلاً

○ ''یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ'' (الانفال:۱) ''اے محبوب! تم سے غنیمتوں کو پوچھتے ہیں''۔

○ ''بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ'' (التوبہ:۱) ''بیزاری کا حکم (سنانا ہے اللہ اور رسول کی طرف سے)''۔

○ ''اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ'' (النحل:۱) ''اب آتا ہے اللہ کا حکم''۔

○ ''اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ'' (الانبیاء:۱) ''قریب آ گیا ہے لوگوں کے لیے ان کے (اعمال کے) حساب کا وقت''۔

○ ''قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ'' (المومنون:۱) ''بے شک مراد کو پہنچے ایمان والے''۔

○ ''سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا'' (النور:۱) ''یہ ایک سورت ہے کہ ہم نے اتاری''۔

○ ''تَنْزِیْلُ الْكِتٰبِ'' (الزمر:۱) ''کتاب اتارنا ہے''۔

○ ''اَلَّذِیْنَ كَفَرُوْا'' (محمد:۱) ''جنہوں نے کفر کیا''۔

○ ''اِنَّا فَتَحْنَا'' (الفتح:۱) ''بے شک ہم نے تمہارے لیے روشن فتح دی''۔

○ ''اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ'' (القمر:۱) ''پاس آئی قیامت''۔

○ ''اَلرَّحْمٰنُ○ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ○'' (الرحمٰن:۲۔۱) ''رحمٰن نے اپنے محبوب کو قرآن سکھایا''۔

○ ''قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ'' (المجادلہ:۱) ''بے شک اللہ نے سنا''۔

○ ''اَلْحَآقَّةُ'' (الحاقہ:۱) ''وہ حق ہونے والی''۔

○ ''سَاَلَ سَآئِلٌ'' (المعارج:۱) ''مطالبہ کیا ہے ایک سائل نے''۔

○ ''اِنَّآ اَرْسَلْنَا نُوْحًا'' (نوح:۱) ''بے شک ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا''۔

○ ''لَآ اُقْسِمُ'' (دو جگہوں میں) (البلد:۱) ''مجھے اس شہر کی'' (القیامہ:۱) ''روز قیامت کی قسم''۔

○ ''عَبَسَ'' (عبس:۱) ''تیوری چڑھائی''۔

○ ''اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ'' (القدر:۱) ''بے شک ہم نے اسے شب قدر میں اتارا''۔

○ ''لَمْ یَكُنِ'' (البینہ:۱) ''نہ تھے''۔

○ ''اَلْقَارِعَةُ'' (القارعہ:۱) ''دل دہلانے والی''۔

○ ''اِنَّآ اَعْطَیْنٰكَ الْكَوْثَرَ'' (الکوثر:۱) ''اے محبوب! بے شک ہم نے تمہیں بے شمار خوبیاں عطا فرمائیں''۔

یہ کل تئیس (۲۳) سورتیں ہیں۔

پانچویں نوع ہے' قسم' پندرہ سورتوں کا آغاز قسم سے کیا گیا ہے' ان میں سے ایک سورت ایسی ہے جس میں فرشتوں کی قسم یاد فرمائی گئی ہے اور وہ سورہ ''الصّٰفّٰت'' ہے۔

اور دو سورتوں یعنی سورہ بروج اور الطارق میں افلاک کی قسم کا ذکر سے چھ سورتوں میں لوازم افلاک کی قسم کھائی ہے۔

سورہ النجم میں ثریا کی قسم اور الفجر میں دن کے مبداء کی قسم ہے۔ الشمس میں آیۃ النہار کی قسم ہے اور اللیل میں زمانہ کے شطر (نصف حصہ) کی قسم ہے۔ الضحیٰ میں دن کے نصف حصہ کی اور العصر میں دن کے آخری حصہ کی یا پورے زمانہ بھر کی قسم ذکر فرمائی گئی ہے۔

اور دو سورتوں میں ہوا کی قسم ہے جو کہ عناصر اربعہ میں سے ایک عنصر ہے اور یہ الذاریات اور المرسلات کی سورتیں ہیں۔

اور سورہ الطور میں مٹی کی قسم ہے اور یہ بھی ان ہی کا ایک عنصر ہے اور سورہ والتین میں نبات کی قسم ہے۔ سورہ النازعات میں حیوان ناطق کی قسم ذکر ہوئی ہے اور سورہ والعادیات میں ان جانوروں کی قسم ہے جو چرند ہیں۔

○ چھٹی نوع شرط ہے اور یہ سات سورتوں میں آئی ہے' جو حسب ذیل ہیں:

(۱) سورہ واقعہ (۲) سورہ منافقون (۳) سورہ تکویر (۴) سورہ انفطار (۵) سورہ انشقاق (۶) سورہ زلزلہ (۷) سورہ نصر۔

○ ساتویں نوع امر ہے اور یہ چھ سورتوں میں آیا ہے' جو درج ذیل ہیں: (۱) ''قُلْ اُوْحِیَ'' ''اے محبوب! فرماؤ میری طرف وحی کی جاتی ہے'' (۲) ''اِقْرَاْ'' (العلق:۱) ''پڑھو'' (۳) ''قُلْ یٰۤاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ'' (الکافرون:۱) ''تم فرماؤ اے کافرو!'' (۴) ''قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ'' (الاخلاص:۱) ''تم فرماؤ وہ اللہ ہے وہ ایک ہے'' (۵) ''قُلْ اَعُوْذُ'' (الفلق/الناس:۱) ''تم فرماؤ میں اس کی پناہ لیتا ہوں'' یعنی ''المعوذتین''۔

O آٹھویں نوع استفہام ہے اور یہ چھ سورتوں میں آیا ہے:

(۱) ''هَلْ اَتٰى'' (الدھر:۱) (۲) ''عَمَّ يَتَسَآءَ لُوْنَ'' (النباء:۱) (۳) ''هَلْ اَتٰكَ'' (الغاشیہ:۱) (۴) ''اَلَمْ نَشْرَحْ'' (الم نشرح:۱) (۵) ''اَلَمْ تَرَ'' (الماعون:۱) (۶) ''اَرَاَيْتَ'' (الماعون:۱)۔

O نویں نوع بددعا ہے اور بددعا سے صرف تین سورتوں کا افتتاح کیا گیا ہے:

(۱) ''وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ'' (المطففین:۱) (۲) ''وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ'' (الھمزہ:۱) (۳) ''تَبَّتْ'' (اللھب:۱)۔

قرآنی سورتوں کے خواتم

یہ بھی تحسین کلام میں فواتح کی طرح منفرد حیثیت کے حامل ہیں' اس لیے کہ یہ کلام کے آخر میں درسماعت پر دستک دیتے اور گوش گزار ہوتے ہیں' اسی وجہ سے یہ سامع کو گفتگو کے اختتام پذیر ہونے سے آگاہ کرنے کے ساتھ معانی کے عجیب پن اور ندرت کے بھی متضمن ہوکر آئے ہیں۔ تاآنکہ ان کو سن لینے کے بعد نفس پھر مزید کسی بات کا مشتاق اور منتظر نہیں رہتا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ سورتوں کے خواتم' دعاؤں' پندونصائح' فرائض' تحمید' تہلیل' مواعظ وعد' وعید اسی طرح اور بہت سے امور میں سے کسی امر پر مشتمل ہوتے ہیں۔

مثلاً سورہ فاتحہ کے خاتمہ میں پورے مطلوب کی تفصیل بیان کر دی گئی ہے کیونکہ اعلیٰ مطلوب وہ ایمان ہے' جو ضلالت اور معصیت سے محفوظ ہو کیونکہ نافرمانی اور گمراہی غضب الٰہی کا باعث اور ان جملہ باتوں کی تفصیل اللہ تعالیٰ نے اپنے قول ''اَلَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ'' (الفاتحہ:۵) ''جن پر تو نے احسان کیا'' سے بیان فرما دی ہے۔

O اور قرآن کی سورتوں کے خاتمے میں دعا آنے کی مثال ''سورہ بقرہ'' کے خاتمہ کی دو آیتیں ہیں۔

O اور وصایا کی مثال سورہ آل عمران کا خاتمہ ہے۔

O فرائض پر ختم ہونے کی مثال سورہ النساء کا خاتمہ ہے۔ اس میں نکتہ اور حسن اختتام کی بات یہ ہے کہ اس میں موت کے احکام کا بیان ہے اور موت پر زندہ کا اختتام کا رہتا

ہے۔ نیز سب سے آخر میں نازل ہونے والے احکام' احکامِ موت ہیں۔

O سورہ المائدہ کا خاتمہ تجلیل اور تعظیم (عظمت و کبریائی) پر ہوا ہے۔

O اور سورہ الانعام کا خاتمہ وعد اور وعید پر ہوتا ہے۔

O سورہ الاعراف کا خاتمہ فرشتوں کے حال کو بیان کر کے انسان کو عبادت خداوندی پر آمادہ و برانگیختہ کرنے کے ساتھ ہوتا ہے۔

O سورہ الانفال کا خاتمہ جہاد اور صلہ رحمی (رشتہ داروں کا خیال رکھنا) پر ترغیب دلانے کے ساتھ ہوتا ہے۔

O سورہ براۃ کا خاتمہ حضور نبی کریم ﷺ کے مدح و ثناء' آپ کے اوصاف عالیہ کے بیان اور تہلیل کے ساتھ کیا گیا ہے۔

O سورہ یونس کا خاتمہ حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تسلی دینے کے ساتھ ہوا ہے اور یوں ہی سورہ ھود کا خاتمہ بھی ہے۔

O سورہ یوسف کا خاتمہ قرآن پاک کی مدح اور اس کے وصف کے بیان کے ساتھ ہوا ہے۔

O اور سورہ الرعد کا اختتام ہوتا ہے' رسول پاک ﷺ کی تکذیب کرنے والے کی تردید پر۔

اور خاتمہ سورت کی واضح ترین علامت سورہ ابراہیم کا خاتمہ یعنی یہ قول ''هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ'' (ابراہیم:۵۲) الآیہ' اور اسی کی مثل الاحقاف کا خاتمہ بھی ہے اور اسی طرح سورہ الحجر کا خاتمہ ہے' ارشاد ہوتا ہے:

''وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ O'' (الحجر:۹۹) ''اور مرتے دم تک اپنے رب کی عبادت میں رہو' اس میں ''یقین'' کی تفسیر موت سے کی گئی ہے اور یہ اعلیٰ درجہ کی براعت ہے۔

اور دیکھو! سورہ زلزال کا آغاز کس طرح سے قیامت کے ہولناک احوال و مناظر سے ہوتا ہے اور خاتمہ سورت ''فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ O وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ'' (الزلزال:۷-۸) سے ہوتا ہے۔

ترجمہ: ''تو جو ایک ذرہ بھی بھلائی کرے اسے دیکھے گا اور جو ایک ذرہ بھر برائی کرے'

اسے دیکھے گا''۔

اور سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیت ''وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ'' (البقرہ:۲۸۱) ''اور ڈرو اس دن سے جس میں اللہ کی طرف پھرو گے'' میں کس شان سے براعت جلوہ گر ہے اور اس میں وفات کی مستلزم آخریت کی عکاسی کس قدر دلکش انداز میں ہو رہی ہے۔

اسی طرح سب سے آخر میں نازل ہونے والی سورت النصر میں بھی موت کی طرف اشارہ ملتا ہے' جیسا کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے سعید بن جبیر کے طریق پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے' حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین سے دریافت فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے قول ''اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ'' (النصر:۱) ''جب اللہ کی مدد اور فتح آئے'' سے کیا مراد ہے؟ صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین نے جواب دیا: محلات اور شہروں کی فتح (یعنی کشور کشائی کی خوشخبری) مراد ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

اے ابن عباس (رضی اللہ عنہما)! اس سے مراد ایک مدت معین ہے' جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے مقرر کی گئی تھی اور اس آیت میں آپ کی وفات کی طرف اشارہ ہے۔

امام بخاری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یوں بھی روایت کی ہے کہ انہوں نے فرمایا:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا معمول تھا کہ وہ مجھے بھی شیوخ بدر کی مجلس میں بلایا کرتے تھے اور شیوخ میں سے کسی ایک کو یہ بات گراں گزری۔ چنانچہ انہوں نے کہہ دیا کہ یہ لڑکا (ابن عباس) ہم بزرگوں کے ساتھ مجلس میں کیوں شریک ہوتا ہے جب کہ ہمارے بچے بھی ان کی طرح ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم کو یہ بھی معلوم ہے کہ یہ کون ہے؟ پھر ایک دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تمام شیوخ بدر کو مدعو کیا اور ان سے دریافت کیا کہ آیت کریمہ ''اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ'' (النصر:۱) کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟

شیوخ بدر میں سے چند حضرات نے کہا: ہم کو حکم دیا گیا ہے کہ جس وقت ہمیں نصرت و فتح نصیب ہو تو اس وقت ہم اللہ تعالیٰ کی حمد بجالائیں اور اس سے بخشش طلب کریں۔

اور بعض صحابہ نے سکوت اختیار فرمایا اور کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مجھ سے فرمایا: ابن عباس! کیا آپ کا بھی یہی قول ہے؟ میں نے جواب دیا: نہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمانے لگے: پھر تم کیا کہتے ہو؟

میں نے کہا: اس میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کی طرف اشارہ ہے' اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کی موت کے علم سے آگاہ فرمایا ہے کہ جب اللہ کی نصرت اور فتح آئے تو یہ تمہارے وصال فرمانے کی علامت ہے تو اس وقت تم اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرنا اور اس کی تسبیح کرنا اور مغفرت طلب کرنا اور وہ بہت توبہ قبول کرنے والا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر فرمایا: میں اس سورت کے متعلق وہی جانتا ہوں' جو کچھ تم نے بیان کیا ہے۔

قرآن پاک کی آیات اور سورتوں میں مناسبت

مناسبت لغت میں ہم شکل اور باہم قریب ہونے کے معنی میں آتا ہے' آیات اور اس کی مثل چیزوں میں مناسبت کا مرجع ایک ایسا معنی ہے' جو ان میں باہم تعلق اور ربط کا کام دیتا ہے' وہ معنی عام ہو یا خاص' عقلی ہو حسی یا خیالی وغیرہ یا اس کے علاوہ اور قسم کے علاقے اور لزومات ذہنی مثلاً سبب اور مسبب علت اور معلول نظیرین اور ضدین اور دیگر امور مناسبت کا فائدہ یہ ہے کہ وہ کلام کے اجزاء کو باہم جوڑنے اور ملانے کا کام دیتی ہے اور اس سے اجزاء کلام کا باہمی ارتباط بڑھ کر کلام میں مضبوطی اور تقویت پیدا کرتا ہے۔ تالیف کلام کا حال اس عمارت کی طرح ہوتا ہے' جو کہ نہایت محکم اور متناسب اجزاء کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے۔

علامہ ابو جعفر ابن الزبیر ابو حیان کے استاذ نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھی' جس کا نام ''البرهان فی مناسبة ترتیب سور القرآن'' ہے اور شیخ برہان الدین بقاعی نے اسی موضوع پر ''نظم الدرر فی مناسبة الآی والسور'' کے نام سے ایک کتاب تالیف کی ہے۔

اور علامہ حافظ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ کی اس موضوع پر ایک عمدہ اور لطیف تصنیف ''تناسق الدرر فی تناسب السور'' موجود ہے۔

علم المناسبہ ایک بہترین فن ہے' عام طور پر مفسرین نے اس علم کی دقت اور باریکی کی

وجہ سے بہت کم اس پر توجہ کی ہے۔

اور جن علماء مفسرین نے بہ کثرت مناسبات کو بیان کیا ہے' ان میں سے ایک امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ تعالیٰ ہیں' وہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

قرآن حکیم کے اکثر نکات اور باریکیاں اس کی ترتیبوں' مناسبتوں اور رابطوں میں مضمر ہیں۔

شیخ عزالدین بن عبدالسلام فرماتے ہیں:

مناسبت ایک اچھا علم ہے لیکن ارتباط کلام کے عمدہ اور خوبصورت ہونے میں یہ شرط ہے کہ وہ کسی ایسے کلام میں واقع ہو' جس میں اتحاد و یگانگت ہو اور اس کا اوّل اس کے آخر سے مربوط ہو' لہٰذا اگر کلام کا وقوع مختلف اسباب پر ہوگا تو اس میں یہ ارتباط ہرگز نہیں ہوگا اور جو شخص ایسے کلام کو ربط دے گا' وہ خواہ مخواہ ٹھنڈے تکلف کا مرتکب ہوگا اور ہتھیلی پر سرسوں اگانے کی کرے گا اور ایسے بودے طریق کی پیروی کرے گا کہ اس سے تو معمولی قسم کے کلام کے حسن کو بھی بچانا اور محفوظ رکھنا ضروری ہے' چہ جائیکہ قرآن حکیم ایسے افضل ترین کلام کی خوبی وحسن کی حفاظت اور قرآن حکیم کا نزول جو بیس سے زیادہ سال تک تدریجاً ہوتا ہے اور اس عرصہ میں مختلف اسباب کی بناء پر مختلف اوقات میں مختلف احکام کے بارے میں یہ نازل ہوا تھا اور اس طرح کا کلام بھی باہم مربوط نہیں کیا جا سکتا۔

تنبیہ

بعض آیات اس طرح کی ہیں کہ ان کی مناسبت ان کے ماقبل کے ساتھ مشکل نظر آتی ہے' ان آیات میں سے ایک سورہ القیامہ کی یہ آیت کریمہ ہے' جس میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

''لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ'' (القیامہ:۱۶) تم یاد کرنے کی جلدی میں قرآن کے ساتھ اپنی زبان کو حرکت نہ دو اور اس آیت کی وجہ مناسبت اوّل و آخر کے ساتھ ایک نہایت دشوار امر ہے' کیونکہ یہ ساری سورت احوال قیامت کے بیان میں نازل ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ بعض رافضیوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ اس سورت میں سے کچھ حصہ ساقط ہو گیا ہے۔

اور حدیث صحیح میں ہے کہ اس آیت کا نزول رسول اکرم ﷺ کے نزولِ وحی کی حالت میں زبان مبارک کو حرکت دینے پر ہوا تھا۔

ائمہ مفسرین نے اس کی بہت سی مناسبتیں بیان فرمائی ہیں۔

○ ان میں سے ایک یہ ہے کہ جس وقت اللہ تعالیٰ نے قیامت کا ذکر فرمایا اور یہ بیان کیا کہ جو شخص عمل آخرت میں کوتاہی کرتا ہے' وہ عاجلہ یعنی دنیا کی محبت میں مبتلا ہے اور دین کا منشاء دراصل یہ ہے کہ نیکی کے امور کی طرف جلدی کی جائے اور یہ نیک کاموں میں سبقت شرعاً مطلوب ہے تو اللہ تعالیٰ نے متنبہ فرمایا کہ کبھی اس مطلوب کو ایک ایسی چیز عارض ہو جاتی ہے' جو اس سے بھی زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی ہے' مثلاً وہ وحی کا پوری توجہ اور یکسوئی کے ساتھ ہمہ تن گوش ہو کر سننا ہے اور اس کے مفاہیم ومطالب کو سمجھنا ہے اور فوراً اس کے حفظ اور یاد کرنے میں مشغول ہونا اس سے مانع ہے' لہٰذا امر ہوا کہ ساتھ ساتھ فوراً حفظ اور یاد کرنے میں جلدی نہ کرو' اس لیے کہ اس کا یاد کرانا اللہ رب العالمین کے ذمہ کرم پر ہے' بس آپ کا کام صرف اتنا ہے کہ جو وحی اترتی ہے' اسے توجہ سے سنتے رہیے اور جب اس کا نزول مکمل ہو چکے تو اس کے احکام کی اتباع کریں۔ پھر جس وقت یہ جملہ معترضہ ختم ہو گیا' اس وقت دوبارہ کلام کا آغاز اسی انسان اور اس کے ابناء جنس کے متعلقات سے ہوا' جس کے ذکر سے پہلے کلام کا افتتاح ہوا تھا اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''کلا'' یہ کلمہ ردع ہے گویا کہ رب العزت نے فرمایا بلکہ تم لوگ اے آدم کے بیٹو! اس وجہ سے کہ تمہارا خمیر اور اٹھان ہی عجلت سے واقع ہوئی ہے' ضرور ہر چیز میں جلد بازی کرو گے اور اسی عاجلانہ سرشت کی وجہ سے عاجلہ (دنیا) سے دوستی کا دم بھرو گے۔

○ دوسری وجہ مناسبت یہ ہے کہ جس نفس کا ذکر سورت کے شروع میں ہوا' اس سے مصطفیٰ کریم ﷺ کے نفس شریف اور ذات لطیف کی طرف عدول کیا اور گویا یہ کہا کہ عام نفوس کی شان تو وہ ہے مگر اے سراپا ستائش محبوب! آپ تمام نفوس سے افضل و اعلیٰ ہیں۔ لہٰذا آپ اپنی شان کے لائق کامل ترین احوال اختیار فرمائیں۔

○ اور اسی باب سے اللہ تعالیٰ کا یہ قول ''يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ'' (البقرہ:۱۸۹) ''تم سے

نئے چاند کو پوچھتے ہیں'' بھی ہے کیونکہ بعض اوقات اس پر یہ اشکال وارد کیا جاتا ہے کہ ''ھلال'' کے احکام اور گھروں میں داخل ہونے کے احکام میں کون سی مناسبت ہے؟ اور ان کو ایک ساتھ کس تعلق اور ربط و مناسبت کی بناء پر ذکر کیا گیا ہے؟

اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ یہ استطراد کے باب سے ہے کیونکہ چاند کے گھٹنے اور بڑھنے کی حکمت یہ بیان کی گئی تھی کہ اس سے حج کے اوقات کا تعین ہوتا ہے اور یہ گھروں میں دروازہ سے آنے کے بجائے پیچھے سے داخل ہونا ان لوگوں کا عموماً موسم حج میں معمول ہوتا تھا (جیسا کہ اس آیت کے شانِ نزول سے پتا چلتا ہے) لہٰذا گھر میں داخلہ کا حکم اس مقام پر سوال کے جواب میں امر زائد کو بیان کرنے کے قبیل سے ہوا' اس کی نظیر یہ ہے کہ سمندر کے پانی کے بارے میں سوال پیدا ہوا تھا تو اس کے جواب میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ھو الطھور ماؤھا الحل میتة''۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا قول ''وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ'' (البقرہ:۱۱۵) ''اور پورب اور پچھم سب اللہ ہی کا ہے'' بھی اسی باب سے ہے کیونکہ اس کے بارے میں بھی یہ سوال ہوتا ہے کہ اس کی ماقبل سے کیا مناسبت ہے اور اس کا ماقبل ہے ''وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسَاجِدَ اللّٰهِ'' (البقرہ:۱۱۴) ''اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ کی مسجدوں سے روکے''۔

شیخ ابو محمد الجوینی رحمۃ اللہ علیہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں: میں نے ابوالحسن الدھان سے سنا ہے' وہ فرماتے تھے:

اس آیت کی وجہ اتصال اپنے ماقبل سے یہ ہے کہ سابق میں بربادی بیت المقدس کا ذکر آ چکا ہے یعنی یہ کہ تم کو یہ بات اس سے روگردانی پر آمادہ نہ کرے اور تم اس کی طرف رخ کرو' اس لیے کہ مشرق اور مغرب سب اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی سمتیں ہیں۔

اعجاز قرآن

معجزہ ایسے خرق عادت امر کو کہتے ہیں' جو تحدی (چیلنج) کے ساتھ مقرون (ملا ہوا) ہو اور وہ معارضہ سے سالم رہے۔

معجزہ کی دو قسمیں ہیں: (۱) حسی (۲) عقلی۔

بنی اسرائیل کے اکثر معجزات حسی تھے' کیونکہ وہ لوگ انتہائی کند ذہن اور کم عقل تھے اور حضور نبی کریم ﷺ کی امت کے لیے زیادہ تر معجزات عقلی تھے' اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ کی امت کے افراد روشن دماغ اور کمال درجہ کی ذکاوت اور فہم و فراست کے مالک ہیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ شریعت محمدیہ ''عَلٰی صَاحِبِهَا التَّحِيَّةُ وَالثَّنَاءُ'' نے چونکہ قیامت تک صفحہ ہستی پر باقی رہنا ہے' اس واسطے اس امت کو یہ خصوصیت عطا ہوئی کہ اس شریعت کے شارع اور پیغمبر ﷺ کو ہمیشہ رہنے والا عقلی معجزہ عطا کیا گیا' تا کہ اہل بصیرت اس کو ہر دور میں دیکھ سکیں۔

جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ہر نبی کو ایک ایسی چیز دی گئی کہ اسی کی مثل انسان اس پر ایمان لے آئے اور صرف مجھے جو چیز دی گئی ہے' وہ وحی (قرآن مجید) ہے' جو اللہ تعالیٰ نے مجھ پر نازل فرمایا ہے' لہٰذا مجھے امید ہے کہ میرے پیروکار اور امتی سب نبیوں کے پیروکاروں سے زیادہ ہوں گے۔ (بخاری شریف)

کہا گیا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام کے معجزات ان کے زمانہ کے ختم ہونے کے ساتھ ہی ختم ہو گئے' اس لیے ان کے معجزات کا صرف انہی لوگوں نے مشاہدہ کیا' جو اس زمانہ میں موجود تھے اور قرآن مجید کا معجزہ قیامت تک کے لیے باقی ہے۔ قرآن کریم اپنے اسلوب بیان' فصاحت و بلاغت اور غیب کی خبروں کے بارے میں خرق عادت اور شانِ اعجاز کے ساتھ متصف ہے' کوئی زمانہ اور دور ایسا نہیں گزرے گا کہ اس میں قرآن حکیم کی کوئی پیش گوئی ظاہر ہو کر اس کے دعوے کی صحت پر دلالت نہ کرے اور ایک قول اس سلسلہ میں یہ بھی ہے کہ گزشتہ زمانہ کے واضح معجزات حسی اور آنکھوں سے نظر آنے والے تھے' جیسے حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا وغیرہ۔ اور قرآن حکیم کا معجزہ عقل و ادراک کے ذریعہ مشاہدہ میں آتا ہے' اس لیے اس پر ایمان رکھنے والے بہ کثرت لوگ ہوں گے' کیونکہ جو چیز چشم سر سے دیکھی جائے' وہ اس مشاہدہ کرنے والے کے فنا ہونے کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہے اور جو چیز نظر عقل سے دیکھی اور مشاہدہ کی جائے' وہ باقی رہنے والی ہوتی ہے اور اس کو ہر آنے والا شخص یکے بعد دیگرا اپنے دور میں مشاہدہ کرتا رہتا ہے۔

ارباب عقل کا اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ قرآن مجید معجزہ ہے' اس کے چیلنج اور

دعوتِ مقابلہ کے باوجود کسی میں سکت نہیں کہ اس کا معارضہ کر سکے۔

اور جس وقت نبی پاک ﷺ نے قرآن مجید اہل عرب کے سامنے پیش کیا اور وہ ایسا دور تھا کہ اہل عرب فصاحت و بلاغت کی بلندیوں کو چھو رہے تھے۔ میدانِ خطابت میں اپنی مثال آپ تھے' قرآن نے جب ان فصحاء عرب اور شعلہ بیان مقرروں کو تحدی کی اور مقابلہ کا چیلنج کیا' ان سے کہا: قرآن کی مثل لاؤ' اگر تم اپنے دعویٰ فصاحت و بلاغت میں سچے ہو اور سالہا سال تک انہیں مہلت بھی دیئے رکھی' مگر عرب کے فصحاء سے ہرگز مقابلہ نہ ہو سکا اور وہ اس کی مثل نہ لا سکے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ O'' (الطور: ۳۴) ''تو اس جیسی ایک بات تو لے آئیں اگر سچے ہیں''۔

اور اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے بہ حکم الٰہی اہل عرب سے قرآن مجید کی دس سورتوں کی مثل پیش کرنے کا چیلنج فرمایا' جس کی بابت اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ O فَاِلَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ'' (ھود: ۱۴-۱۳) ''کیا یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے اسے جی سے بنا لیا' تم فرماؤ کہ تم ایسی بنائی ہوئی دس سورتیں لے آؤ اور اللہ کے سوا جو مل سکے سب کو بلاؤ' اگر تم سچے ہو اور پھر ان کو ایک ہی سورت بنا لانے کی دعوت دی' جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے:

''اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ'' (یونس: ۳۸) ''کیا یہ (کافر) کہتے ہیں کہ اُس نے خود گھڑ لیا ہے اسے' آپ فرمایئے: پھر تم بھی لے آؤ ایک سورت اس جیسی'' اور اس کے بعد اسی تحدی اور چیلنج کو مکرر ذکر کیا' ارشادِ خداوندی ہے:

''وَاِنْ كُنْتُمْ فِىْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ'' (البقرہ: ۲۳) ''اور اگر تمہیں کچھ شک ہو' اس میں جو ہم نے اپنے خاص بندے پر اتارا تو اس جیسی ایک سورت تو لے آؤ'' مگر جب وہ اس کے معارضہ سے عاجز ہو گئے اور اس کی مثل لانے پر انہیں قدرت نہ ہوئی اور ان خطیبوں اور بلغاء کی کثرت کچھ بھی کام نہ آ سکی تو اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمایا کہ تمام اہل عرب قرآن کی مثل پیش کرنے سے عاجز ہو گئے ہیں اور اس طرح قرآن پاک کا معجزہ پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا' چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

''قُلْ لَّىِٕنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓي اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا'' (بنی اسرائیل: ۸۸)

''تم فرماؤ اگر آدمی اور جن سب اس بات پر متفق ہو جائیں کہ اس قرآن کی مانند لے آئیں تو اس کا مثل نہ لا سکیں اگرچہ ان میں سے ایک دوسرے کا مددگار ہو''۔ سوچنے کا مقام ہے کہ اہل عرب جو بڑے فصیح اللسان زبان آور تھے اور پھر یہ کہ انہیں ہر وقت یہ بات کھائے جا رہی تھی کہ کس طرح اپنی پھونکوں سے چراغ مصطفوی کو بجھا دیں اور دین مصطفیٰ ﷺ کو چلنے نہ دیں' اس کا کام تمام کر دیں' اگر ان کے بس میں ہوتا تو ضرور قرآن کا معارضہ کرتے اور اس کے چیلنج کا توڑ پیش کرتے' جب کہ صورت حال یہ ہے کہ مشرکین کے بارے میں ایسی کوئی بات منقول نہیں ہے کہ ان میں کسی کے دل میں قرآن کے معارضہ کا خیال تک آیا ہو' یا اس نے اس چیز کا ارادہ بھی کیا ہو بلکہ اس کے برعکس ہوا یہ کہ جب ان سے کوئی مقابلہ کی صورت بن نہ پائی تو عناد و دشمنی اور رکیک حرکتوں پر اتر آئے' کبھی قرآنی آیات کا تمسخر اڑاتے اور کبھی جادو بتاتے اور کبھی کہتے: یہ شاعری ہے اور کبھی اگلوں کی داستانوں کا مجموعہ گردانتے' غرضیکہ ورطہ حیرت میں ڈوبے بوکھلاہٹ کے عالم میں بھانت بھانت کی بولی بولتے' جو ان کی لاچاری و بے بسی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

ولید بن مغیرہ جب حضور ﷺ سے قرآن سن کر آیا اور اس کی قوم نے اس سے مطالبہ کیا کہ وہ قرآن کے بارے میں کوئی ایسا کلمہ کہے' جس سے معلوم ہو کہ وہ اس کو پسند نہیں کرتا تو ولید نے کہا: میں کیا کہوں؟ اللہ کی قسم! تمہیں معلوم ہے کہ تم لوگوں میں مجھ سے بڑھ کر کوئی شخص شعر' رجز اور قصیدہ کا عالم نہیں ہے' بخدا! جو بات وہ کہتا ہے ان میں سے کسی کے ساتھ مشابہت نہیں رکھتی اور اللہ کی قسم! محمد مصطفیٰ ﷺ جو بات کہتے ہیں' ان کی بات میں لطافت و شیرینی ہے' اس کا بالائی حصہ ثمردار اور اس کا زیریں حصہ شکر بار اور یقیناً ان کے کلام کو غلبہ حاصل ہو گا اور یہ کبھی مغلوب نہ ہو سکے گا اور بے شک یہ اپنے سے کم تر تمام کلام مٹا کر رکھ دے گا اور اسی کا سکہ جمے گا۔

فصل

قرآن میں کس وجہ سے اعجاز پایا جاتا ہے؟

امام فخر الدین رازی فرماتے ہیں:

قرآن حکیم کے اعجاز کی وجہ اس کی فصاحت' اسلوب' بیان کی ندرت اور اس کا تمام عیوب کلام سے صحیح وسلامت ہونا ہے۔

علامہ زملکانی کا قول ہے:

قرآن حکیم کے اعجاز کی وجہ اس کا ایک خاص ترتیب وتالیف پر ہونا ہے' نہ کہ مطلق ترتیب وتالیف اور خاص تالیف وترتیب یہ ہے کہ اس کے مفردات' ترکیب اور وزن کے اعتبار سے موزوں مناسب معتدل اور مساوی ہوں اور اس کے مرکبات معنوی اعتبار سے بلند ترین درجہ اور مرتبہ کے ہوں۔

ابن عطیہ بیان کرتے ہیں:

وہ صحیح بات جو ماہر علماء اور جمہور کا موقف ہے' قرآن کے وجہ اعجاز کی نسبت یہ ہے کہ قرآن اپنے نظم عبارت' صحت معانی اور فصاحت الفاظ کی روانی وسلاست کی وجہ سے معجز ہے' اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم ہر شئی کا احاطہ کرتا ہے' ایسے ہی اللہ تعالیٰ کا علم' کلام کے بھی تمام محاسن اور خوبیوں کو محیط ہے۔ لہٰذا جس وقت قرآن کا کوئی لفظ اللہ تعالیٰ نے مرتب فرمایا تو اپنے وسیع ومحیط علم سے اس بات کو بھی معلوم فرمالیا کہ کون سا لفظ پہلے لفظ کے بعد آنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور کون سا معنی دوسرے معنی کے بعد بیان ووضاحت کے لیے مناسب رہے گا اور پھر اسی طرح اوّل سے آخر تک قرآن پاک کی ترتیب ہوئی ہے۔

اور انسان عموماً جہل' نسیان اور ذہول کا شکار ہوتا ہے اور یہ بھی بدیہی طور پر معلوم ہے کہ کوئی بندہ بشر اس طرح کلام پر ہمہ گیر دسترس نہیں رکھ سکتا' اس لیے قرآن کا نظم فصاحت کے بلند ترین مرتبہ میں ہوا ہے اور اسی دلیل سے ان لوگوں کا قول بھی باطل ہو جاتا ہے' جو کہتے ہیں کہ اہل عرب قرآن پاک کا مثل لانے پر قادر تھے' مگر انہوں نے اس سے صرف نظر کر لی حالانکہ صحیح بات یہ ہے کہ قرآن کا مثل پیش کرنا ہرگز کسی کے بس میں نہیں ہے' اس لیے تم نے دیکھا ہوگا کہ ایک فصیح وبلیغ قادر الکلام شخص سال بھر اپنے قصیدہ یا خطبہ ولیکچر کی درستی اور کانٹ چھانٹ کرنے کے بعد بھی جب کبھی دوبارہ اس پر نظر ثانی کا موقع پاتا ہے تو اب بھی اس میں مزید تنقیح اور اصلاح وتہذیب کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہتا ہے۔

اور کتاب اللہ کی شان یہ ہے کہ اگر اس میں سے کوئی لفظ نکال دیا جائے' پھر پوری لغت عرب کو چھان ماریں کہ اس سے اچھا کوئی لفظ ہاتھ آ جائے تو ہرگز تلاش بسیار کے بعد بھی نہیں مل سکے گا' بلکہ اس جیسا لفظ بھی دستیاب نہیں ہوگا' جو اس کی جگہ رکھ سکیں اور ہم پر قرآن کے اکثر حصہ کی براعت واضح ہو جاتی ہے' مگر بعض مواقع پر مخفی بھی رہتی ہے اور اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ ہم اہل عرب سے ذوق سلیم اور طبیعت کی عمدگی میں بدرجہا کم ہیں۔

قرآن عظیم کے ذریعہ دنیائے عرب پر اس لیے حجت قائم ہوئی کہ وہ ارباب فصاحت تھے اور ان کی طرف سے معارضہ ومقابلہ کا شبہ کیا جا سکتا تھا اور ایسے ہی ہوا' جس طرح کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جادوگروں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا طبیبوں پر معجزہ کے ذریعہ حجت قائم کرنا ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ عام طور پر انبیاء علیہم السلام کے معجزات کو ان کے زمانہ کا بہترین امر قرار دیتا ہے' موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں سحر وجادو درجہ کمال کو پہنچا ہوا تھا اور عیسیٰ علیہ السلام کے دور میں فن طب اپنے عروج پر تھا' لہٰذا ان کے معجزات کا اس طرح اظہار کیا گیا کہ انہوں نے سحر اور طب کو نیچا دکھایا اور اسی طرح حضور سید عالم ﷺ کے زمانہ مبارک میں فصاحت اپنے کمال پر تھی' چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے ان کو وہ معجزہ دکھایا' جس سے تمام فصحائے عرب کا غرور ونخوت ختم ہو گیا

تیرے آگے یوں ہیں دبے لچے فصحاء عرب کے بڑے بڑے
کوئی جانے منہ میں زبان نہیں' نہیں بلکہ جسم میں جان نہیں

تنبیہات

اوّل: اس بات پر اتفاق ہو جانے کے بعد کہ قرآن پاک کا مرتبہ بلاغت میں نہایت اونچا ہے' اس بارے میں اختلاف ہے کہ آیا فصاحت میں بھی اس کا درجہ اسی طرح یکساں ہے یا کوئی تفاوت ہے؟ مثلاً یہ کہ ترکیب کلام میں کوئی ترکیب ایسی نہ ملتی ہو کہ اس خاص معنی کا فائدہ دینے میں قرآن سے بڑھ کر متناسب اور معتدل ہو؟ یا ایسا نہیں؟ بلکہ اس کے مراتب میں فرق اور تفاوت ہے؟ قاضی نے منع کو پسند کیا ہے یعنی تفاوت کا انکار کیا ہے' وہ کہتے ہیں کہ قرآن پاک میں ہر کلمہ فصاحت کے اعلیٰ ترین درجہ پر فائز ہے' اگرچہ بعض لوگ اس کے بارے میں

دوسروں کی نسبت زیادہ اچھا ہونے کا خیال کرتے ہیں۔

ابونصر قشیری اور دیگر علماء کا مختار یہ ہے کہ قرآن میں فصاحت کے اعتبار سے فرق مراتب موجود ہے' چنانچہ قرآن میں افصح اور فصیح دونوں درجہ کے کلام ہیں۔

دوم: قرآن مجید کی شعر موزون سے تنزیہ کی حکمت یہ بیان کی جاتی ہے کہ باوجودیکہ موزون کلام کا رتبہ دوسرے کلاموں کے رتبہ سے بلند و بالا ہوتا ہے لیکن چونکہ قرآن سچائی کا معیار اور حق کا سرچشمہ ہے اور شاعر کا منتہائے فکر یہ ہے کہ وہ حق کی صورت میں اپنے تخیل کے زور پر باطل کی تصویر کھینچ دے اور وہ اثباتِ صدق اور اظہار حق کے بجائے مذمت اور ایذاء رسانی کے لیے مبالغہ آرائی سے کام لیتا ہے' جیسا کہ شاعر کہتا ہے

ہوں وہ نحیف کہ ہوا چشم مور میں مدفون　　کتنا فراخ ملا گوشہ مزار مجھے

شعر کا معاملہ کچھ ایسا ہی ہے کہ "اکذب اوست احسن اوست"۔

اسی لیے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے نبی مکرم ﷺ کو اس سے پاک رکھا اور اسی وجہ سے کہ شعر کی شہرت کذب کے ساتھ ہوتی ہے۔ مناطقہ نے ان قیاسات کو جو اکثر حالتوں میں جھوٹ اور بطلان کی طرف پہنچانے والے ہوتے ہیں' قیاسات شعریہ کے نام سے موسوم کیا ہے۔

کسی دانا کا قول ہے:

کوئی دین دار اور سچائی کا علم بردار شخص اپنے اشعار میں مبالغہ آرائی اور رنگینی پیدا کرنے والا نظر نہیں آیا ہے۔

قرآن مجید میں مستنبط علوم

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ" (الانعام: ۳۸) "ہم نے اس کتاب میں کچھ اٹھا نہ رکھا"۔

اور اسی طرح فرمایا: "وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ" (النحل: ۸۹)
"اور ہم نے تم پر یہ قرآن اتار کہ ہر چیز کا روشن بیان ہے"۔

اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "ستکون فتن" "عنقریب فتنوں کا دور آنے والا ہے۔

صحابہ کرام علیہم الرضوان نے عرض کیا: یارسول اللہ! اس سے بچنے کا ذریعہ کیا ہے؟ ارشاد ہوا کہ کتاب اللہ کہ اس میں ماضی' مستقبل اور حال کی خبریں اور تمہارے لیے ہر چیز کا حکم موجود ہے' اس حدیث کی تخریج امام ترمذی اور دیگر محدثین نے کی ہے۔

سعید ابن منصور' حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں' انہوں نے فرمایا: جس شخص کا ارادہ ہو کہ علم حاصل کرے' پس وہ قرآن کو لازم پکڑ لے کیونکہ اس میں اوّلین اور آخرین کی خبریں ہیں۔ امام بیہقی بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے علم سے اس کے اصول کا اعادہ کیا ہے۔

امام بیہقی رحمۃ اللہ' حسن رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کرتے ہیں' انہوں نے فرمایا:

اللہ تعالیٰ نے ایک سو چار کتابیں نازل فرمائی ہیں اور ان میں سے چار کتابوں میں سب کا علم ودیعت فرمایا ہے۔ وہ چار کتابیں تورات' انجیل' زبور اور فرقان ہیں اور پھر تورات' انجیل' زبور کا علم قرآن پاک میں ودیعت فرما دیا ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

علماء امت کے تمام اقوال حدیث کی شرح ہیں اور تمام احادیث قرآن پاک کی شرح ہیں' نیز فرماتے ہیں: وہ تمام باتیں جن کا نبی ﷺ نے حکم دیا ہے' وہ قرآن ہی کا مفہوم ہے۔

امام شافعی کے اس قول کی تائید حضور اکرم ﷺ کی اس حدیث مبارک سے ہوتی ہے' جس میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں صرف انہی چیزوں کو حلال بتاتا ہوں' جو اللہ تعالیٰ نے حلال فرما دی ہیں اور انہی چیزوں کے بارے میں حرام کا حکم دیتا ہوں' جن کو اللہ تعالیٰ نے حرام فرمایا ہے۔

اس حدیث کو امام شافعی نے "کتاب الام" میں روایت کیا ہے۔

سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

مجھے رسول اللہ ﷺ سے جو بھی حدیث پہنچی ہے' میں نے اس کا مصداق اللہ کی کتاب قرآن میں پایا ہے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں جب تم سے رسول اللہ ﷺ کی حدیث بیان کرتا ہوں تو اس کی تصدیق قرآن سے کرا دیتا ہوں' یہ حدیث ابن ابی حاتم نے روایت کی

ہے۔

امام شافعی کا یہ بھی قول ہے کہ دین کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے' جس کا ثبوت اور اس کی دلیل قرآن پاک میں نہ پائی جاتی ہو' بلکہ ہر مسئلہ کی رہنمائی قرآن سے ہوتی ہے۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ بعض احکام شریعت ایسے بھی ہیں' جو ابتداءً سنت سے ثابت ہیں تو پھر ایسے کیوں ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ درحقیقت وہ احکام بھی کتاب ہی سے ماخوذ ہیں کیونکہ قرآن پاک نے ہم پر رسول پاک ﷺ کی اتباع کو فرض کیا ہے اور آپ ﷺ کے ارشادات پر عمل کرنا ہم پر فرض قرار دیا ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ مکہ مکرمہ میں یہ بات کہی کہ تم لوگ جو بھی بات پوچھو' میں اس کا جواب قرآن مجید سے تمہیں دوں گا۔

اس پر لوگوں نے سوال کیا: آپ اس محرم (احرام باندھنے والے) کی بابت کیا کہتے ہیں جو حالت احرام میں زنبور (بھڑ) کو مار ڈالے؟

امام شافعی نے فرمایا: ''بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ.'' ''وَمَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا'' (الحشر:۷)

''اللہ کے نام سے شروع جو نہایت مہربان رحم والا' اور جو کچھ تمہیں رسول عطا فرمائیں وہ لو اور جس سے منع فرمائیں باز رہو''۔

اور اپنی پوری سند کے ساتھ حدیث بیان کی کہ حضرت حذیفہ بن الیمان نے رسول اکرم ﷺ سے روایت کی ہے: حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''اقتدوا بالذین من بعدی ابی بکر وعمر''۔

اور پھر انہوں نے ایک پوری سند کے ساتھ سفیان کے واسطہ سے حضرت عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی کہ انہوں نے محرم کو زنبور (بھڑ) کے مار ڈالنے کا حکم دیا۔

امام بخاری رحمۃ اللہ الباری نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے' انہوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ان گودنے والیوں' بال اکھڑوانے والیوں' دانتوں کے درمیان شگاف ڈالنے والیوں' جو کہ خدا کی خلقت کو بدلتی ہیں پر لعنت کی۔

یہ بات قبیلہ بنی اسد کی ایک عورت کو پہنچی' اس نے آکر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے کہا کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ آپ ایسی ایسی عورت پر لعنت بھیجتے ہیں' ابن مسعود فرمانے لگے: جن پر حضور ﷺ نے لعنت بھیجی ہو' مجھے کیا ہے کہ میں ان پر لعنت نہ بھیجوں اور یہ بات قرآن پاک میں ہے' اس عورت نے کہا: میں نے تو قرآن پاک پورا پڑھا ہے' اس میں کہیں یہ بات نہیں پائی جس کو آپ بیان کرتے ہیں۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر تو نے قرآن کو پڑھا ہوتا تو ضرور اس میں یہ بات پاتی' کیا تو نے یہ نہیں پڑھا ہے: ''وَمَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا'' (الحشر:۷) اور جو کچھ تمہیں رسول عطا فرمائیں وہ لو اور جس سے منع فرمائیں باز رہو' اس عورت نے کہا: ہاں! اس کو بے شک پڑھا ہے' ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تو رسول اللہ ﷺ نے ہی اس بات سے منع فرمایا ہے۔

ابن سراقہ نے ''کتاب الاعجاز'' میں ابوبکر بن مجاہد سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے ایک دفعہ کہا: دنیا میں کوئی شئی ایسی نہیں ہے جس کا ذکر قرآن میں نہ ہو' لوگوں نے ان سے کہا: قرآن میں خیانتوں کا ذکر کہاں ہے؟ تو انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ کے اس قول میں ''لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ مَسْکُوْنَۃٍ فِیْھَا مَتَاعٌ لَّکُمْ'' (النور:۲۹)

''اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں کہ ان گھروں میں جاؤ جو خاص کسی کی سکونت کے نہیں اور ان کے برتنے کا تمہیں اختیار ہے'' اور یہی خیانتیں ہیں۔

ابن برہان کا بیان ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے جو کچھ فرمایا ہے' وہ بعینہ یا اس کی اصل قریب بعید قرآن میں موجود ہے' جس نے سمجھ لیا سمجھ لیا' جو اندھا رہا وہ اندھا رہا' ایسے ہی ہر حکم اور فیصلہ جو حضور اکرم ﷺ نے صادر اور نافذ فرمایا' وہ قرآن سے باہر نہیں ہے۔

البتہ یہ بات ضرور ہے کہ ہر طالب قرآن اپنے اجتہاد اور فہم کے مطابق جتنی کوشش اور ہمت صرف کرے گا' اسی قدر قرآن کے مفاہیم ومطالب کو پالے گا' ایک اور عالم فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے جس شخص کو فہم وفراست کی دولت عطا فرمائی ہو' اس کے لیے کوئی چیز ایسی نہیں جس کا استخراج قرآن سے ممکن نہ ہو' وہ ہر شئی کو قرآن پاک سے معلوم کرسکتا ہے' حتیٰ کہ ایک عالم نے نبی پاک ﷺ کی عمر مبارک تریسٹھ برس قرآن سے مستنبط کی ہے' وہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورہ المنافقین میں فرمایا ہے: ''وَلَنْ یُّؤَخِّرَ اللّٰہُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُھَا''

(المنافقون:۱۱) ''اور ہرگز اللہ کسی جان کو مہلت نہ دے گا جب اس کا وعدہ آ جائے گا'' اور یہ سورت تریسٹھویں سورت ہے' پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے سورہ التغابن کو رکھا ہے' جو اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ حضور ﷺ کے وصال سے دنیا میں نقصان عظیم ظاہر ہوگا۔

ابن ابی الفضل المرسی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

قرآن پاک اوّلین اور آخرین کے علوم کا جامع ہے' مگر اس کے تمام علوم کا احاطہ کر لینا حقیقی طور پر اللہ تعالیٰ ہی کی شان کے لائق ہے' اس کے بعد اللہ کے رسول ﷺ' وہ بھی ماسوا ان امور کے جن کا علم اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے مخصوص رکھا ہے اور اس کے بعد رسول اللہ ﷺ سے علم قرآن کی میراث سادات صحابہ کرام علیہم اجمعین کو پہنچی' جیسے خلفائے اربعہ' حضرت ابن مسعود' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم اجمعین' یہاں تک کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما تو فرماتے ہیں:

اگر میرے اونٹ باندھنے کی رسی بھی گم ہو جائے تو میں اس کو بھی قرآن پاک میں پاتا ہوں۔

ازاں بعد صحابہ سے تابعین نے علوم قرآن کی میراث پائی اور اس کے بعد سے پھر ہمتیں پست ہو گئیں' عزائم ٹھنڈے پڑ گئے اور علماء کی حالت پتلی ہو گئی' ان لوگوں نے صحابہ کرام اور تابعین کی طرح قرآن پاک کے علوم وفنون کا حامل بننے میں کمزوری دکھائی اور بعد کے علماء نے علوم کو کوئی انواع میں تقسیم کر لیا اور ہر ایک گروہ کسی ایک فن کو سیکھنے سکھانے کی طرف متوجہ ہو گیا' ایک جماعت نے لغات قرآن کے ضبط کرنے' اس کے کلمات کی تحریر' اس کے حروف کے مخارج اور تعداد کلمات' آیات' سورتوں' احزاب' انصاف اور ارباع اور اس کے سجدوں کی تعداد' اور ہر دس آیات تک تعلیم دینے کے اصول وضوابط وغیرہ محض اس کے متشابہ کلمات کے شمار اور آیات متماثلات کی گنتی وشمار پر اکتفاء کیا اور قرآن کے معانی سے تعرض ہی نہ کیا اور نہ ہی ان مضمرات میں تدبر کیا' جو قرآن میں ودیعت کیے گئے ہیں۔ ان لوگوں کو ''قراء'' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

علماء نحو نے معرب' مبنی اسماء وافعال اور حروف عاملہ وغیرہ کے بیان پر اپنی توجہ مبذول رکھی اور اسماء اور ان کے تابع افعال کی اقسام لازم ومتعدی اور کلمات کے رسم الخط اور انہی کے

متعلق تمام امور کی نہایت شرح وبسط کے ساتھ تحقیق کی یہاں تک کہ بعض نحویوں نے مشکلات قرآن کے اعراب کو بتایا اور بعض نحویوں نے ایک ایک کلمہ کا اعراب الگ الگ بیان کیا۔

مفسرین کی صرف الفاظ قرآن پر زیادہ توجہ رہی اور جب انہوں نے دیکھا کہ کوئی لفظ صرف ایک ہی معنی پر دلالت کرتا ہے اور کوئی دو معنوں پر اور کسی لفظ کی دلالت دو سے زیادہ معانی پر ہے تو انہوں نے پہلے لفظ کو اسی کے حکم پر جاری رکھا اور اس میں سے خفی لفظ کے معنی واضح کیے اور دو یا زیادہ معانی کا احتمال رکھنے والے لفظ میں متعدد احتمالات میں سے کسی ایک معنی کو ترجیح دینے کے لیے غور وفکر کیا اور ہر شخص نے اپنی اپنی فکر کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے نظریہ کے تقاضا کے مطابق بات کہی۔

علمائے اصول نے قرآن مجید میں پائے جانے والے اصولی اور نظریاتی شواہد اور عقلی دلائل پر توجہ مبذول کی' مثلاً قول باری تعالیٰ جل شانہ ''لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا'' (الانبیاء:۲۲)۔

''اگر آسمان وزمین میں اللہ کے سوا اور خدا ہوتے تو ضرور وہ تباہ ہو جاتے'' اور اس جیسی آیات کثیرہ میں غور وفکر کر کے ان سے اللہ تعالیٰ کی توحید' اس کے وجود' بقاء' قدم' قدرت اور علم پر دلائل وبراہین کا استنباط کیا اور نئی نئی دلیلیں پیش کیں اور جو باتیں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی شان کے لائق نہ تھیں' ان سے اس کی تنزیہہ اور پاکی کو بیان کیا اور اس علم کو نام ''علم اصول دین'' رکھا۔

ایک جماعت نے خطاب قرآن کے معانی میں غور وفکر کیا اور دیکھا کہ ان میں سے بعض خطابات عموم کے اور بعض خصوص کے مقتضی ہیں اور اسی طرح کی دیگر باتیں معلوم کیں' ایک طبقہ نے لغت کے احکام از قسم حقیقت ومجاز اس سے مستنبط کیے اور تخصیص' اخبار' نص' ظاہر' مجمل' محکم' متشابہ' امر' نہی' نسخ اور اسی طرح دیگر امور انواع قیاسات' استصحاب حال اور استقراء کی انواع پر کلام کیا اور اس فن کا نام ''اصول فقہ'' رکھا۔

اور ایک جماعت نے قرآن کے حلال وحرام اور ان تمام احکام پر جو اس میں موجود ہیں' محکم طریقہ سے نظر صحیح اور فکر صادق سے کام لیا اور انہوں نے ان احکام کے اصول وفروع کی

داغ بیل ڈالی اور نہایت خوب صورت طریقے سے جامع بحث کی اور اس کا نام علم الفروع رکھا' اس کو "علم الفقہ" کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

○ ایک جماعت کا نصب العین قرآن مجید میں پائے جانے والے گزشتہ صدیوں اور سابقہ امتوں کے قصص اور واقعات کا بیان کرنا رہا ہے' چنانچہ انہوں نے سابقہ امتوں کے تاریخی واقعات نقل کیے اور ان کے آثار اور کارناموں کو مدون کیا' یہاں تک کہ دنیا کی ابتداء اور تمام اشیاء کے آغاز آفرینش کا ذکر کیا اور اس فن کا نام تاریخ اور قصص رکھا۔

○ اور ایک جماعت نے قرآن مجید کی حکمتوں' تمثیلوں اور مواعظ پر متنبہ کیا' جو کہ بڑے بڑے مردان کار کے دلوں کو لرزا دینے اور پہاڑوں کو پاش پاش کر دینے والے ہیں۔

پس انہوں نے اس میں سے وعد' وعید' تحذیر اور تبشیر' موت اور آخرت کی یاد' حشر و نشر' حساب و عقاب' جنت اور دوزخ وغیرہ کے واقعات اخذ کیے' مواعظ کو فصول کے انداز میں مرتب کیا' زجر و توبیخ کے اصول منضبط کیے اور یہ کام سرانجام دینے والی جماعت واعظین اور خطباء کے نام سے موسوم ہوئی۔

○ ایک گروہ نے قرآن حکیم سے "تعبیر الرؤیا" کے اصول مستنبط کیے اور اس سلسلہ میں سورہ یوسف میں سات فربہ گایوں کو خواب میں دیکھنے کا قصہ' جیل کے دو قیدیوں کا خواب' اور خود حضرت یوسف علیہ السلام کا سورج' چاند اور ستاروں کو خواب میں سجدہ کرتے ہوئے دیکھنا اور اس طرح کے بیانات کو مشعل راہ بنا کر قرآن مجید سے ہر قسم کے خوابوں کی تعبیر کے قواعد بنائے اور اگر ان پر قرآن سے کسی خواب کی تعبیر دشوار ہوئی تو حدیث رسول اللہ ﷺ سے روشنی حاصل کی کیونکہ حدیث مبارک' قرآن پاک کی شارح ہے۔ پھر حدیث شریف سے بھی کسی خواب کی تعبیر نکالنے میں مشکل پیش آئی تو امثال و حکم کو مرجع بنایا پھر عرف عام اور لوگوں کے محاورات اور عادات و اطوار کا بھی لحاظ رکھا' کیونکہ لوگوں کے راہ و رسم اور ان کے عرف و رواج سے رہنمائی لینے کی طرف خود قرآن میں اشارہ ملتا ہے' ارشاد خداوندی ہے: "وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ" (الاعراف:۱۹۹) اور بھلائی کا حکم دو۔

بعض لوگوں نے آیت میراث میں سہام یعنی حصص اور حصہ داروں اور مستحقین کا ذکر دیکھ کر اس سے "علم الفرائض" وضع کیا اور قرآن پاک میں نصف' ثلث' ربع' سدس اور ثمن وغیرہ کے بیان سے فرائض کا حساب اور عول کے مسائل نکالے' پھر اسی آیت میں وصایا کے احکام کا استخراج کیا۔

○ ایک طبقہ نے قرآن حکیم کی ان روشن آیتوں میں فکر و نظر سے کام لیا' جن میں رات' دن' چاند' سورج' منازل' مہر و ماہ و نجوم اور بروج کی اعلیٰ حکمتوں پر دلالت موجود ہے اور ان سے "علم المواقیت" کا فن وضع کیا۔

○ ادیبوں اور شاعروں نے لفظ کی جزالت و عمدگی' نظم کا بدیع اور اچھوتا پن' حسن سیاق مبادی' مقاطع' مخالص' خطاب کی رنگینی اور تنوع' اطناب' ایجاز وغیرہ امور کو پیش نظر رکھ کر اس سے علم بلاغت (معانی' بیان بدیع) کی بنیاد ڈالی۔

○ ارباب اشارات اور اصحاب حقیقت (صوفیاء کرام) نے قرآن میں نظر کی تو ان پر اس کے الفاظ سے بہت کچھ معانی اور باریکیاں منکشف ہوئیں' چنانچہ ان حضرات نے اپنی مخصوص اصطلاحات وضع کر کے ان معانی کو خاص ناموں' مثلاً فنا' بقاء' حضور' خوف' ہیبت' انس' وحشت اور قبض و بسط وغیرہ ناموں سے موسوم کیا۔

○ الغرض مذکورہ بالا علوم و فنون تو وہ ہیں جو ملت اسلامیہ کے علماء نے اخذ کیے اور ان کے علاوہ بھی قرآن کریم بے شمار علوم پر حاوی ہے۔

حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے علماء کرام کا بیان ہے کہ قرآن مجید کی آیتیں پانچ سو ہیں اور بعض کے نزدیک ایسی آیات صرف ایک سو پچاس ہیں' ممکن ہے ان کی مراد ان ہی آیات سے ہو' جن میں احکام کی تصریح کر دی گئی ہے کیونکہ قصص اور امثال وغیرہ کی آیات سے بھی تو بہ کثرت احکام مستنبط ہوتے ہیں۔

شیخ عزالدین بن عبدالسلام کتاب "الامام فی ادلۃ الاحکام" میں لکھتے ہیں: قرآن پاک کی بیشتر آیات اس طرح کے احکام سے خالی نہیں' جو آداب حسنہ اور اخلاق جمیلہ پر مشتمل ہوں۔

انہی کا بیان ہے کہ کبھی احکام پر صیغہ (امر) کے ساتھ استدلال کیا جاتا ہے اور یہ ظاہر

صورت ہے اور بسا اوقات اخبار کے ساتھ جیسے ''اُحِلَّ لَکُمْ'' (البقرۃ:۱۸۷) ''تمہارے لیے حلال ہوا''۔ ''حُرِمَتْ عَلَیْکُمُ الْمَیْتَۃُ'' (المائدہ:۳) ''تم پر حرام ہے مردار''..... ''کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ'' (البقرہ:۱۸۳) ''تم پر روزے فرض کیے گئے'' اور کبھی اس چیز کے ساتھ احکام پر استدلال ہوتا ہے' جس پر دنیا یا آخرت میں فوراً یا آئندہ اچھا یا بُرا اور نفع یا نقصان کا نتیجہ مرتب ہو۔

اور شارع علیہ السلام نے اس کی متعدد انواع قرار دی ہیں' تا کہ بندگانِ خدا کو تعمیل احکام کی ترغیب وشوق دلایا جا سکے اور خوف دلا کر پابند احکام کیا جا سکے اور مختلف طریقوں سے حکم کو بیان کر کے اسے ان کے فہم وادراک کے قریب تر کر دیا جائے۔ چنانچہ ہر ایسا کام کہ شرع نے اس کے کرنے والے کی مدح کی اور اس کی عظمت بیان کی ہے۔

- یا اس فعل یا اس کے فاعل کو پسند فرمایا ہے یا اس فعل پر اپنی رضا وخوشنودی کا اظہار فرمایا ہے اور اس کے کرنے والے کو محبوب وپسندیدہ قرار دیا ہے یا اس کے کرنے والے کو برکت' اچھائی وعمدگی اور استقامت کے وصف سے موصوف گردانا ہے یا اس فعل کی یا فاعل کی قسم یاد فرمائی ہے' جیسے شفع وتر اور مجاہدین کے گھوڑوں اور نفس لوامہ کے قسم ذکر کی ہے۔
- یا اس کو اس امر کا سبب قرار دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے فاعل کو یاد کیا کرتا ہے یا اس سے محبت رکھتا ہے۔
- یا اسے جلدی (دنیا میں) یا آئندہ (آخرت میں) ثواب دیتا ہے یا بندہ کو اللہ تعالیٰ کی شکرگزاری کرنے یا اللہ تعالیٰ بندہ کو ہدایت فرمانے یا اللہ تعالیٰ کے اس فعل کرنے والے کو راضی کرنے یا اس کے گناہوں کو معاف کرنے اور اس کی برائیوں کا کفارہ دینے کا وسیلہ قرار دیا ہے۔
- یا یہ اس نے وہ فعل قبول فرمایا ہے یا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس فعل کے کرنے والے کی مدد و نصرت فرمائی ہے یا اس کو کوئی بشارت دی ہے یا اس کے فاعل کو کسی خوبی کے ساتھ موصوف کیا ہے یا فعل ہی کا معروف وصف ذکر کیا ہے۔
- یا اس کے فاعل سے حزن اور خوف کی نفی کر دی ہے۔

- یا اس کو امن دینے کا وعدہ فرمایا ہے یا اس کو فاعل کی ولایت کا سبب قرار دیا ہے یا اس بات کی خبر دی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے اس شئی کے حصول کی دعا فرمائی ہے یا اس چیز کا وصف اس طرح سے ذکر کیا ہے کہ اس کو باعث قربت وثواب بتایا ہے۔
- یا اس کو صفت مدح کے ساتھ موصوف کیا ہے' جیسے حیات' نور اور شفاء اور یہ امور اس فعل کی ایسی مشروعیت کی دلیل ہیں' جو کہ واجب اور مندوب ہونے کے درمیان مشترک ہے۔

اور ہر ایسا فعل کہ شارع نے اس کے ترک کرنے کا حکم دیا ہو یا اس فعل یا فاعل کی مذمت کی ہو یا اس کے فاعل پر خفگی کا اظہار کیا ہو یا اس کر کرنے والے پر لعنت کی ہو یا اس فعل اور اس کے فاعل سے راضی ہونے اور اس سے محبت کی نفی فرمائی ہو یا اس کام کے کرنے کو بہائم اور شیطان ایسا کہا ہو یا اس فعل کو ہدایت پانے اور مقبولیت حاصل کرنے سے رکاوٹ قرار دیا ہو یا اس کا وصف کسی برائی اور ناپسندیدگی کے ساتھ فرمایا ہو یا انبیاء کرام علیہم السلام نے اس فعل سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کی ہو یا اس فعل پر غصہ کا اظہار کیا ہو یا اس فعل کو فلاح وکامرانی کی نفی کا سبب قرار دیا ہو یا کسی جلد یا دیر میں آنے والے عذاب کا موجب بتایا ہو یا کسی مذمت' ملامت' گمراہی یا معصیت کا سبب بتایا گیا ہو یا اس فعل کی صفت خبث' رجس یا نجس بیان کی گئی ہو یا اس کو فسق یا اثم ہونے کے ساتھ موصوف کیا ہو یا کسی گناہ' ناپاکی' لعن' غضب' زوال نعمت' نزول عذاب کا سبب بتایا گیا ہو یا وہ فعل کسی سزا پانے' سنگ دلی' ذلت نفس کا سبب قرار دیا ہو یا اس فعل کو معاذ اللہ' اللہ کی عداوت' اس سے لڑائی' استہزاء یا مسخری کرنے کا سبب بتایا گیا ہو یا اس کام کرنے سے اللہ تعالیٰ اس کو محروم کر کے چھوڑے یا خود اللہ تعالیٰ اپنی ذات کو اس کام پر رکنے یا برداشت کرنے یا درگزر کرنے کے وصف سے موصوف کیا ہو یا اس فعل سے توبہ کرنے کی دعوت دی ہو یا اس کام کے کرنے والے کو خبث یا احتقار سے موصوف کیا ہو یا اس کو شیطانی کام قرار دیا ہو یا یہ فرمایا ہو کہ شیطان اس عمل کو کرنے والوں کی نگاہ میں آراستہ ومزین کر کے پیش کرتا ہے یا یہ فرمایا ہو کہ اس عمل کے کرنے والے کا شیطان دوست بن جاتا ہے یا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس فعل کو کسی بُری صفت کے ساتھ

موصوف کیا ہو جیسے ظلم' سرکشی' حد سے بڑھنا' گناہ' مرض کا باعث ہونا بیان کیا ہو یا اس
فعل یا اس کے فاعل سے انبیاء علیہم السلام نے برأت کا اظہار فرمایا ہو یا اللہ تعالیٰ کے حضور اس
فعل کے مرتکب کی شکایت کی ہو یا اس کام کے کرنے والے سے عداوت کا اظہار کیا ہو
یا اس پر افسوس اور غم کرنے سے منع کیا ہو یا اس فعل کو فاعل کے لیے جلد یا دیر سے ناکافی
ونقصان کا سبب بتایا ہو یا وہ فعل جنت اور اس کی نعمتوں سے محرومی کا موجب بنے یا اس
فعل کے حامل شخص کو اللہ تعالیٰ کا دشمن کہا گیا ہو یا یہ کہ اللہ تعالیٰ کو اس سے دشمنی رکھنے
والا بتایا گیا ہو یا یہ بتایا گیا ہو کہ اس فعل کا کرنے والا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول
اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جنگ کرنے والا ہے یا اس فعل کا فاعل نے غیر کا گناہ خود اٹھالیا ہو یا
اس فعل کے بارے میں کہا گیا ہو کہ یہ کام نہیں ہوتا ہے یا مناسب نہیں ہے یا اس کام کا
سوال کرتے وقت اس سے بچنے کا حکم دیا گیا ہو یا اس کام کی ضد پر عمل کرنے کا حکم دیا
گیا ہو یا اس کے فاعل سے بائیکاٹ کرنے کا حکم دیا گیا ہو یا اس کام کے کرنے والوں
نے آخرت (نتیجہ) میں ایک دوسرے پر لعنت کی ہو یا انہوں نے باہم ایک دوسرے
سے بیزاری کا اظہار کیا ہو یا ان میں سے ہر ایک نے دوسرے کے لیے بددعا کی ہو یا
اس کے فاعل کو ضلالت کے ساتھ موصوف کیا ہو یا اس کے متعلق یہ کہا گیا ہو کہ یہ عمل
اللہ' رسول اور صحابہ کے نزدیک کوئی شئ نہیں ہے یا شارع علیہ السلام نے اس کام سے
اجتناب کرنے کو فلاح وکامیابی کا ذریعہ قرار دیا ہو یا اس کام کو مسلمانوں کے درمیان
بغض وعداوت کا وقوع کا سبب بتایا گیا ہو یا یہ کہا ہو کہ کیا تو اس کام کے کرنے سے باز
رہنے والا ہے؟ یا انبیاء کرام علیہم السلام کو اس کام کے کرنے والے کے حق میں دعا کرنے
سے منع کر دیا گیا ہو یا اس کام کے کرنے پر ابعاد (دور کرنا) یا طرد (دھتکارنا) کا ترتب
ہوا ہو یا اس فعل کے کرنے والے کے لیے (قاتله الله) خدا اس کو غارت کرے' کے
الفاظ وارد ہوئے ہوں۔

○ یا اس فعل کے فاعل کی نسبت یہ خبر دی گئی ہو کہ اللہ تعالیٰ اس سے قیامت کے دن کلام (رحمت کا کلام) نہیں فرمائے گا۔

○ اس کی طرف نظر (کرم) نہیں فرمائے گا اور اس کا تزکیہ نہیں کرے گا اور اس کے عمل

درست نہیں کرے گا' اس کا حیلہ چلنے نہیں دے گا یا فلاح نہیں پائے گا یا اس پر شیطان کو
مسلط کرنے کی خبر دی گئی ہو یا وہ فعل اس کے فاعل کی کج دلی کا سبب ہو یا وہ فعل اس
کے کرنے والے کے لیے اللہ کی آیتوں اور قدرت کے واضح دلائل سے روگردانی کا
باعث بتایا گیا ہو یا اس کے علت فعل کے بارے میں سوال کرنے کی خبر دی ہو کیونکہ یہ
فعل کے نہ کرنے پر دلیل ہے اور اس کی دلالت محض کراہت پر دلالت کی بہ نسبت تحریم
پر زیادہ ظاہر ہے۔

اور اباحت لفظ ''احلال'' سے مستفاد ہوتی ہے' اور اسی طرح جناح' حرج' اثم اور مواخذہ
کی نفی بھی اباحت کا فائدہ دیتی ہے اور اس کام کے کرنے کی اجازت ملنے' اس فعل سے درگزر
کرنے اور اعیان میں جو منافع ہیں' ان پر احسان جتانے' تحریم سے سکوت فرمانے' اور جو شخص
کسی چیز کو حرام بتائے' اس پر انکار سے سکوت فرمانے اور اس کی خبر دینے سے کہ اس نے یہ چیز
ہمارے (نفع) کے لیے بنائی اور پیدا کی ہے اور اگلوں کے ایسے عملوں کی خبر دینے سے کہ جن
پر مذمت نہ کی گئی ہو اور اگر شارع کے خبر دینے کے ساتھ کوئی مدح بھی ہو تو وہ مدح اس فعل
کے وجوباً یا استحباباً مشروع ہونے کی دلیل ہے' یہاں تک شیخ عزالدین کا کلام تمام ہو گیا۔

کسی دوسرے عالم کا قول ہے کہ بعض اوقات حکم کا استنباط سکوت (شارع) سے بھی
ہوتا ہے اور اس کے متعلق ایک جماعت نے قرآن پاک کے غیر مخلوق ہونے پر اس طرح
استدلال کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اٹھارہ جگہوں پر انسان کا ذکر کیا اور فرمایا کہ وہ مخلوق ہے اور
قرآن کا ذکر چوّن (۵۴) مقامات پر کیا ہے' مگر ایک جگہ بھی قرآن کو مخلوق نہیں کہا اور جس جگہ
قرآن اور انسان کا ذکر اکٹھے ایک ساتھ کیا تو وہاں ان دونوں کے درمیان بیان میں مغایرت پیدا
کر دی' چنانچہ ارشاد فرمایا: ''اَلرَّحْمٰنُ ○ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ○ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ○'' (الرحمٰن: ۳۔۱)
''رحمٰن نے اپنے محبوب کو قرآن سکھایا ○ انسان کی جان محمد کو پیدا کیا ○''۔

امثالِ قرآن

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:
''وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ''

(الزمر:۲۷) "اور بے شک ہم نے لوگوں کے لیے اس قرآن میں ہر قسم کی کہاوت بیان فرمائی کہ کسی طرح انہیں دھیان ہو"۔

○ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں، انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: بے شک قرآن پانچ وجوہ پر نازل ہوا ہے: حلال، حرام، محکم، متشابہ اور امثال، پس تم لوگ حلال کو کام میں لاؤ اور حرام سے خود کو بچاؤ، محکم کی اتباع کرو اور متشابہ پر ایمان لاؤ اور امثال سے عبرت پکڑو اور نصیحت حاصل کرو۔

○ علامہ ماوردی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"علم القرآن" کا ایک بہت عظیم حصہ "علم الامثال" ہے، حالانکہ لوگ اس سے غافل ہیں، اس لیے کہ وہ امثال ہی میں پھنس کر رہ جاتے ہیں (یعنی کہانیوں میں ہی کھن ہو جاتے ہیں، ان کی کنہہ میں نہیں پہنچتے) اور جن امور سے متعلق وہ مثالیں بیان ہوئی ہیں، ان سے غافل رہتے ہیں (اور یہ سبک سار سبق گیر نہیں ہوتے) اور حقیقت یہ ہے کہ مثل بغیر ممثل کے اسپ بے لگام اور ناقہ بے زمام ایسی ہے۔

○ ایک اور عالم فرماتے ہیں:

امام شافعی رحمہ اللہ نے "علم الامثال" کو علوم القرآن کے ان امور میں سے شمار کیا ہے، جن کا جاننا مجتہد پر واجب ہے اور اس کے بعد قرآن کی بیان کردہ ان امثال کی معرفت ضروری ہے، جو اطاعت خداوندی پر دلالت کرنے والی اور اس کی نافرمانی سے اجتناب کو ضروری قرار دینے میں مبین اور واضح ہیں۔

○ شیخ عزالدین رحمہ اللہ کا قول ہے:

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں امثال کو وعظ وتذکیر یعنی ڈرانے اور یاددہانی کے لیے بیان فرمایا ہے، پھر ان امثال میں سے وہ جو ثواب میں تفاوت پر یا عمل کے اکارت و رائیگاں کر دینے یا مدح وذم وغیرہ پر مشتمل ہیں، وہ احکام پر دلالت کرتی ہیں اور یاددہانی کے لیے بیان فرمایا ہے، پھر ان امثال میں سے وہ جو ثواب میں تفاوت پر یا عمل کے اکارت ورائیگاں کر دینے یا مدح وذم وغیرہ پر مشتمل ہیں، وہ احکام پر دلالت کرتی ہیں۔

فصل

امثال قرآن کی دو قسمیں ہیں:

(۱) ظاہر، جس کی صراحت کر دی گئی ہے۔

(۲) کامن (پوشیدہ) کہ اس میں مثل کا کوئی ذکر ہی نہیں ہوتا۔

قسم اوّل کی مثالوں میں سے ایک اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے:

"مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا" (البقرہ:۱۷) کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے منافقین کے لیے دو مثالیں بیان کی ہیں، ایک آگ کے ساتھ دوسری بارش کے ساتھ۔ قسم اوّل ہی کی دوسری مثال اللہ تعالیٰ کا یہ قول بھی ہے:

"أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا" (الرعد:۱۷) اس نے آسمان سے پانی اتارا تو نالے اپنے اپنے لائق بہہ نکلے۔

○ ابن ابی حاتم نے علی کے طریق سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ جو مثال بیان فرمائی ہے، اس میں سے قلوب اپنے یقین وشک کے موافق محتمل ہوئے اور انہوں نے حظ اٹھایا، سووہ زبد (جھاگ) تو وہ یوں ہی بے سود قابل انداخت ہوتا ہے، یہ شک کی تمثیل ہے اور رہی وہ چیز جو لوگوں کو فائدہ بہم پہنچاتی ہے تو وہ زمین میں ٹھہر جاتی ہے اور یہ شئی یقین ہے اور اس کی مثال یہ ہے کہ جس طرح زیور کو آگ میں ڈال کر کھرا کھوٹا دیکھا جاتا ہے، پھر اس میں سے خالص چیز لے لی جاتی ہے اور کھوٹ اس میں چھوڑ دی جاتی ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ یقین کو قبول فرما لیتا ہے اور شک کو چھوڑ دیا کرتا ہے۔

اسی راوی کا بیان ہے کہ حضرت عطاء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ مثال اللہ تعالیٰ نے مومن اور کافر کے لیے دی ہے۔

اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ یہ تین مثالیں ہیں، جن کو ایک مثال میں سمو دیا گیا ہے۔

ارشاد خداوندی ہے کہ جس طرح یہ "زبد" (جھاگ) مضمحل ہو کر جفاء (کوڑا، کچرا) بن گیا اور بے کار چیز ہو گیا کہ اب وہ قابل انتفاع نہیں رہا، اسی طرح باطل اہل باطل سے دور ہو

جاتا ہے اور جس طرح کہ وہ پانی زمین میں ٹھہر کر شادابی پیدا کرتا ہے اور پیداوار میں اضافہ کا سبب بنتا ہے اور زمین سے نبات کی روئیدگی اور نشوونما کا ذریعہ بنتا ہے۔

یا جس طرح کہ سونا چاندی کو آگ میں ڈالنے سے اس کا میل کچیل دور ہو جاتا ہے اور وہ کندن بن جاتا ہے' ایسے ہی حق اہل حق کے لیے باقی رہ جاتا ہے اور انہی سیم و زر کے میل کی طرح کہ وہ آگ میں پڑنے سے الگ ہو جاتا ہے' باطل بھی اہل باطل سے مضمحل اور جدا ہو جاتا ہے۔

اور اسی پہلی قسم کی ایک اور مثال اللہ تعالیٰ کا یہ قول بھی ہے:

''وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ'' (الاعراف:۵۸) اور جو اچھی زمین ہے۔ ابن ابی حاتم علی کے طریق سے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں' انہوں نے فرمایا کہ یہ مثال اللہ تعالیٰ نے مومن کے لیے بیان کی ہے یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''مومن طیب'' (پاک باز اور اچھا) ہے اور اس کا عمل بھی طیب وعمدہ ہے' جس طرح کہ اچھی زمین کا پھل اچھا ہوتا ہے اور ''وَالَّذِي خَبُثَ'' (الاعراف:۵۸) یہ مثال کافر کے لیے دی گئی ہے کہ وہ شوریلی اور دلدلی زمین کی مانند ہے اور کافر خود بھی خراب اور ردی ہے تو اس کے عمل بھی خبث یعنی ردا اور خراب ہوں گے۔

اور اسی قبیل سے ہے' اللہ تعالیٰ کا قول ''اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ'' (البقرہ:۲۶۶) ''کیا تم میں کوئی اسے پسند رکھے گا کہ اس کے پاس ایک باغ ہو' اس کے متعلق امام بخاری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے' وہ فرماتے ہیں کہ ایک دن حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام علیہم الرضوان سے دریافت کیا: تم لوگوں کے نزدیک یہ آیت کس بارے میں نازل ہوئی ہے: ''اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ'' (البقرہ:۲۶۶)'' کیا تم میں کوئی اسے پسند رکھے گا کہ اس کے پاس ایک باغ ہو کھجوروں اور انگوروں کا'' صحابہ کرام نے جواب دیا: اللہ تعالیٰ خوب علم والا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ جواب سن کر برہم ہوئے اور فرمایا: یہ کیا بات ہوئی' صاف صاف کہہ کہ ہم جانتے ہیں یا نہیں جانتے' پس ابن عباس رضی اللہ عنہما یہ سن کر کہنے لگے: اس کے متعلق میرے دل میں ایک بات ہے' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بھتیجے بیان کرو اور اپنے نفس کو حقیر نہ سمجھو (یعنی) خود اعتمادی ہو' احساسِ کمتری نہیں ہونا چاہیے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ ایک عمل کی مثال دی گئی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کس عمل کی یہ مثال ہے؟

انہوں نے جواب دیا: ایک ایسے مال دار شخص کی جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں عمل پیرا ہوتا ہے' پھر اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف شیطان کو بھیجا تو وہ شخص نافرمانیوں اور گناہوں میں ایسا کاربند ہوا کہ اس نے اپنے تمام اعمال کا بیڑا غرق کر دیا۔

اَمْثَالِ کَامِنَہ

یعنی وہ امثال جو پوشیدہ ہوتی ہیں اور صریح طور پر لفظوں سے ظاہر نہیں ہوتیں' ان کے متعلق علامہ ماوردی بیان کرتے ہیں:

میں نے ابو اسحاق ابراہیم ابن مضارب ابن ابراہیم سے سنا' ان کا بیان ہے کہ میں نے اپنے باپ مضارب کو یہ بیان کرتے ہوئے سنا ہے کہ میں نے حسن ابن الفضل سے دریافت کیا کہ تم قرآن میں عربی اور عجمی ضرب الامثال بہت بیان کیا کرتے ہو' اچھا بھلا یہ بتاؤ کہ تم نے قرآن میں یہ ضرب المثل ''خیر الامور اوساطھا'' بہترین کام وہ ہے جس میں اعتدال اور میانہ روی پائی جائے' بھی کہیں پائی ہے؟

حسن ابن فضل نے جواب دیا: بے شک' یہ ضرب المثل قرآن حکیم میں چار جگہ آئی ہے:

(۱) ''لَا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ'' (البقرہ:۶۸) ''نہ بوڑھی نہ بچھیا (بلکہ) اس کے درمیان متوسط عمر کی''۔

(۲) ''وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا'' (الفرقان:۶۷) ''اور وہ کہ جب خرچ کرتے ہیں نہ حد سے بڑھیں اور نہ تنگی کریں اور دونوں کے درمیان اعتدال پر رہیں''۔

(۳) ''وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ'' (بنی اسرائیل:۲۹) ''اور اپنا ہاتھ اپنی گردن سے بندھا ہوا نہ رکھو اور نہ پورا کھول دے''۔

(۴) قولہ تعالیٰ: ''وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا'' (بنی اسرائیل:۱۱۰) ''اور اپنی نماز نہ بہت اونچی آواز سے پڑھو اور نہ بالکل آہستہ بلکہ ان دونوں کے بیچ میں راستہ چاہو''۔

مضارب کہتے ہیں کہ پھر میں نے پوچھا کہ کیا تم نے قرآن میں یہ ضرب المثل بھی پائی ہے: ''من جهل شيئا عاداه (الناس اعداء لما جهلوا)'' (ترجمہ:) حسن نے کہا: ہاں! دو جگہ قرآن میں اس کہاوت کا مفہوم پاتا ہوں:

(۱) ''بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ'' (یونس:۳۹) ''بلکہ اسے جھٹلایا جس کے علم پر قابو نہ پایا''۔

(۲) ''وَاِذْ لَمْ يَهْتَدُوْا بِهٖ فَسَيَقُوْلُوْنَ هٰذَآ اِفْكٌ قَدِيْمٌ'' (الاحقاف:۱۱) ''اور جب انہیں اس کی ہدایت نہ ہوئی تو اب کہیں گے: یہ پرانا بہتان ہے''۔

سوال: مضارب: ''احذر شر من احسنت اليه'' (ترجمہ:) کیا یہ مثل (کہاوت) بھی قرآن میں ہے؟

جواب: حسن: بے شک دیکھو اللہ تعالیٰ کا قول ''وَمَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ'' (التوبہ:۷۴) ''اور انہیں کیا بُرا لگا یہی نہ کہ اللہ اور رسول نے اپنے فضل سے غنی کر دیا''۔

سوال: مضارب: کیا یہ مثل ''ليس الخير كالعيان'' (شنیدہ کے بود مانند دیدہ) قرآن سے پائی جاتی ہے؟

جواب: حسن: بالکل دیکھو! اللہ تعالیٰ کا قول:

''اَوَلَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ'' (البقرہ:۲۶۰) ''فرمایا: کیا تجھے یقین نہیں؟ عرض کیا کہ یقین کیوں نہیں! مگر یہ چاہتا ہوں کہ میرے دل کو قرار آئے''۔

سوال: مضارب: ''في الحركات البركات'' (حرکت میں برکت) کیا ضرب المثل قرآن میں ہے؟

جواب: حسن: جی ہاں! اللہ تعالیٰ کا قول ''وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً'' (النساء:۱۰۰) اس پر دلالت کرتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں گھر بار چھوڑ کر نکلے گا' وہ زمین میں بہت جگہ اور گنجائش پائے گا۔

سوال: مضارب: کیا یہ ضرب المثل ''كما تدين تدان'' (چاہ کن راہ چاہ در پیش) یعنی جیسا کرو گے ویسا بھرو گے' قرآن میں ہے؟

جواب: حسن: ہاں! اللہ تعالیٰ کا قول: ''مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ'' (النساء:۱۲۳) ''اور جو برائی کرے گا' اس کا بدلہ پائے گا''۔

سوال: مضارب: کیا تم کو اہل عرب کی یہ کہاوت ''حسين تقلي تدري'' بھی قرآن میں ملی ہے؟

جواب: حسن: بے شک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''وَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ حِيْنَ يَرَوْنَ الْعَذَابَ مَنْ اَضَلُّ سَبِيْلًا'' (الفرقان:۴۲) ''اور وہ عنقریب جان لیں گے' جب عذاب دیکھیں گے کہ راستہ سے بھٹکا ہوا کون تھا؟''

سوال: مضارب: کیا آپ نے یہ ضرب المثل کہ ''لا يلدغ المومن من حجر مرتين'' (مومن ایک سوراخ سے دو مرتبہ نہیں ڈسا جاتا)؟ قرآن میں پائی ہے۔

جواب: حسن: بے شک دیکھو قول باری تعالیٰ ''هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَآ اَمِنْتُكُمْ عَلٰٓى اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ'' (یوسف:۶۴) ''کیا اس کے بارے میں تم پر اسی طرح اعتبار کرلوں' جس طرح پہلے اس کے بھائی (یوسف) کے بارے میں' میں نے تم پر اعتبار کیا تھا''۔

سوال: مضارب: میں نے کہا: کیا تم یہ کہاوت کہ ''من اعان ظالما سلط عليه'' بھی قرآن میں پاتے ہو؟

جواب: حسن: بے شک دیکھئے ارشاد خداوندی ہے:

''كُتِبَ عَلَيْهِ اَنَّهٗ مَنْ تَوَلَّاهُ فَاَنَّهٗ يُضِلُّهٗ وَيَهْدِيْهِ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ'' (الحج:۴)

''جس پر لکھ دیا گیا کہ جو اس کی دوستی کرے گا تو یہ ضرور اسے گمراہ کر دے گا اور اسے عذاب دوزخ کی راہ بتائے گا''۔

سوال: مضارب: اور تم ''لا تلد الحية الا حية'' (عاقبت گرگ زادہ گرگ شود) سپاں دے بچے متر نہ ہندے بھانویں چلیاں دودھ پلایئے' کی کہاوت کس آیت سے لیتے ہو؟

جواب: حسن: اس آیت کریمہ سے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا'' (نوح:۲۷) ''اور ان کی اولاد نہ ہو گی مگر بدکار شدید کافر''۔

سوال: مضارب: اور یہ ضرب المثل کہ ''للحيطان اذان'' دیوار کے بھی کان ہوتے ہیں'

قرآن میں کہاں ہے؟

جواب: حسن: دیکھئے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ''وَفِيكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ'' (التوبہ: ۴۷) ''اور تم میں ان کے جاسوس موجود ہیں''۔

سوال: مضارب: اور کیا یہ کہاوت کہ ''الجاهل مرزوق والعالم محروم'' جاہل کو رزق دیا جاتا ہے اور عالم کو محروم رکھا' بھی قرآن میں ملتی ہے؟

جواب: حسن: ضرور دیکھو! اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''مَنْ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا'' (مریم: ۷۵) ''جو گمراہی میں ہو تو اسے رحمٰن خوب ڈھیل دے''۔

سوال: مضارب: اور کیا یہ ضرب المثل قرآن میں ہے: ''الحلال لا یاتیك الا قوتا والحرام یا یاتیك الا جزافا''۔

جواب: حسن: ہاں موجود ہے۔ آیت ''اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ لَا تَاْتِيْهِمْ'' (الاعراف: ۱۶۳) ''جب ہفتہ کے دن ان کی مچھلیاں پانی پر تیرتیں ان کے سامنے آتیں اور جو دن ہفتے کا نہ ہوتا' نہ آتیں''۔

فائدہ: جعفر بن شمس الخلافہ نے کتاب الاداب میں ایک خاص باب مقرر کیا ہے' جس میں قرآن کے ایسے الفاظ ذکر کیے ہیں' جو ضرب المثل کے قائم مقام ہیں اور یہ ایک بدیع نوع ہے' جس کو ''ارسال المثل'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جعفر الخلافہ لکھتے ہیں: حسب ذیل آیات قرآن اس نوع مذکور میں پیش کی جاسکتی ہیں:

(۱) لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ. (النجم: ۵۸) — اللہ تعالیٰ کے سوا اس کا کوئی کھولنے والا نہیں۔

(۲) لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ. (آل عمران: ۹۲) — تم ہرگز بھلائی کو نہ پہنچو گے جب تک راہ خدا میں اپنی پیاری چیز نہ خرچ کرو۔

(۳) اَلْئٰنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ. (یوسف: ۵۱) — اب اصلی بات کھل گئی۔

(۴) وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ. (یٰس: ۷۸) — اور ہمارے لیے کہاوت کہتا ہے اور

اپنی پیدائش بھول گیا (ایاز قدر خود بشناس)۔

(۵) ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدٰكَ. (الحج: ۱۰) — یہ اس کا بدلہ ہے جو تیرے ہاتھوں نے آگے بھیجا۔ (گندم از گندم بروید جوز جو) جو بوگے' وہی کاٹو گے۔

(۶) قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ. (یوسف: ۴۱) — حکم ہو چکا اس بات کا جس کا تم سوال کرتے تھے۔

(۷) اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ. (ھود: ۸۱) — کیا صبح قریب نہیں۔

(۸) وَحِيْلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ. (سبا: ۵۴) — اور روک کر دی گئی ان میں اور اس میں جسے چاہتے ہیں۔

(۹) لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ. (الانعام: ۶۷) — ہر چیز کا وقت مقرر ہے۔

(۱۰) وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ. (فاطر: ۴۳) — اور برا داؤ اپنے چلنے والے پر ہی پڑتا ہے (چاہ کن را چاہ در پیش)

(۱۱) قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ. (بنی اسرائیل: ۸۴) — فرما دیجئے: ہر شخص اپنی طبیعت کے مطابق کام کرتا ہے۔

(۱۲) وَعَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ. (البقرہ: ۲۱۶) — اور قریب ہے کوئی بات تمہیں بری لگے اور وہ تمہارے حق میں بہتر ہو۔

(۱۳) كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ. (المدثر: ۳۸) — ہر جان اپنی کرنی میں گروی ہے (یعنی جیسا کرو گے ویسا بھرو گے)۔

(۱۴) مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ. (المائدہ: ۹۹) — رسول پر نہیں مگر حکم پہنچانا (کہ بر رسولاں بلاغ است وبس)

(۱۵) مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ. (التوبہ: ۹۱) — نیکی کرنے والوں پر کوئی راہ نہیں۔

(۱۶) هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ. — نیکی کا بدلہ کیا ہے مگر نیکی۔

(الرحمٰن:۶۰)

(۱۷) كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً. (البقرہ:۲۴۹)
کہ بارہا کم جماعت غالب آ گئی کثیر پر۔

(۱۸) آٰلْئٰنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ. (یونس:۹۱)
کیا اب اور پہلے سے نافرمان رہا۔

(۱۹) تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى. (الحشر:۱۴)
تم انہیں ایک جتھا سمجھو گے اور ان کے دل الگ الگ ہیں۔

(۲۰) وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ. (فاطر:۱۴)
اور تجھے کوئی نہ بتائے گا' اس بتانے والے کی طرح۔

(۲۱) كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ O (المؤمنون:۵۳)
ہر گروہ جو اس کے پاس ہے' اس پر خوش ہے۔

(۲۲) وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ. (الانفال:۲۳)
اور اگر اللہ تعالیٰ ان میں کچھ بھی بھلائی جانتا (یعنی ان میں حق کے قبول کی کچھ بھی صلاحیت ہوتی) تو ضرور انہیں سنوا دیتا۔

(۲۳) وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ. (سبا:۱۳)
اور میرے بندوں میں سے شکر گزار بہت کم ہیں۔

(۲۴) لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا. (البقرہ:۲۸۶)
اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔

(۲۵) قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ. (المائدہ:۱۰۰)
اے نبی ﷺ! آپ فرما دیجئے کہ پاک اور ناپاک برابر نہیں ہو سکتے۔

(۲۶) ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ. (الروم:۴۱)
خشکی اور تری میں (انسانوں کے کرتوتوں کی وجہ سے) فساد اور برائیاں ظاہر ہو گئیں۔

(۲۷) ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ. (الحج:۷۳)
کس قدر کمزور ہے چاہنے والا اور جس کو چاہا گیا۔

(۲۸) لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ. (الصّٰفّٰت:۶۱)
ایسی ہی کامیابی کے لیے کام کرنے والوں کو کام کرنا چاہیے۔

(۲۹) وَقَلِيْلٌ مَّا هُمْ. (ص:۲۴)
اور وہ بہت ہی کم ہیں (آٹے میں نمک کے برابر)۔

(۳۰) فَاعْتَبِرُوْا يٰۤاُولِي الْاَبْصَارِ. (الحشر:۲)
عبرت پکڑنے والو (بصیرت کی آنکھیں رکھنے والو)۔

چشم عبرت بر کشا و صورت حق بین نصیر — شامت اعمال ما صورت گرفتہ بے نظیر

اسی طرح اور بھی ہیں۔

قرآن اور قسمیں اٹھانے کا بیان

ابن قیم نے اس موضوع پر "التبیان" کے نام سے ایک مستقل کتاب تصنیف کی ہے۔ "قسم" سے مقصود خبر کی تحقیق اور اس کی تاکید ہوتی ہے حتیٰ کہ اسی بناء پر "وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ" (المنافقون:۱) "اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ منافق ضرور جھوٹے ہیں" ایسے کلاموں کو بھی قسم کی قسم سے شمار کیا گیا حالانکہ اس میں شہادت (گواہی) کی خبر دی گئی ہے اور اس کو قسم قرار دیئے جانے کی وجہ یہ ہے کہ یہ کلام خبر کی تاکید کرتا ہے' اس لیے یہ قسم کے نام سے موسوم ہے۔ اس جگہ ایک اعتراض کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قسم یاد فرمانے کا کیا معنی ہے؟

کیونکہ اگر وہ قسم مومن کے لیے ذکر کی گئی ہے تو مومن تو محض خبر دینے ہی کے ساتھ بغیر قسم کے اس کی تصدیق کرتا ہے اور اگر یہ قسم کافر کے لیے بیان کی گئی ہے تو پھر کافر کے لیے یہ کچھ بھی مفید نہیں۔

اس اعتراض کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ قرآن شریف کا نزول اہل عرب کی زبان میں ہوا ہے اور ان کی عادت ہے کہ جس وقت وہ کسی بات کو تاکید کے ساتھ ذکر کرنا چاہتے ہیں تو قسم کھایا کرتے ہیں۔ ابوالقاسم قشیری اس اعتراض کے جواب میں لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے اتمام حجت اور اس کی تاکید کے لیے قسم کو ذکر کیا ہے اور یہ اس لیے ہے کہ حکم (فیصلہ کرنے والا) فریقین کے درمیان کسی امر کا فیصلہ دو ہی طریق سے کرتا ہے:

(۱) شہادت (۲) یا قسم کے ساتھ' اس لیے کہ اللہ تعالیٰ قرآن میں دونوں نوعوں کا ذکر فرما دیا تا کہ ان منافقین کے لیے کوئی حجت باقی نہ رہ جائے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ''قُلْ اِیْ وَرَبِّیْٓ اِنَّهٗ لَحَقٌّ'' (یونس: ۵۳) ''تم فرماؤ ہاں! میرے رب کی قسم! بے شک وہ ضرور حق ہے''۔

اور فرمایا: ''شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ'' (آل عمران: ۱۸) ''اللہ نے گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتوں نے اور عالموں نے''۔ اللہ تعالیٰ اور فرشتے اور علم والے انصاف کے ساتھ گواہی دے چکے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور ایک اعرابی کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ اس نے جب اللہ تعالیٰ کا قول: ''وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ ۝ فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ'' (الذاریات: ۲۳-۲۲) اور آسمان میں تمہاری روزی ہے اور تمام وہ چیزیں جن کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے اور آسمان اور زمین کے رب کی قسم! بے شک یہ قرآن اسی طرح حق ہے جیسا تمہارا آپس میں باتیں کرنا' سنا تو چیخ اٹھا اور کہنے لگا: وہ کون ہے: جس نے رب تعالیٰ کو اس قدر غضب دلایا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ امر ضروری قرار پایا کہ وہ قسم ذکر کر کے بات کی تاکید فرمائے' قسم صرف کسی عظمت والے نام کے ساتھ ہی کھائی اور ذکر کی جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں سات جگہ اپنی ذات مبارک کی قسم بیان فرمائی ہے:

(۱) قُلْ اِیْ وَرَبِّیْٓ. (یونس: ۵۳) — آپ فرمائیے کہ مجھے اپنے رب کی قسم!

(۲) قُلْ بَلٰى وَرَبِّیْ لَتُبْعَثُنَّ. — آپ فرما دیجیے کیوں نہیں! مجھے اپنے رب کی قسم ہے! تم ضرور اٹھائے جاؤ گے۔ (التغابن: ۷)

(۳) فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيٰطِيْنَ. — تو آپ کے رب کی قسم! ہم انہیں اور شیطانوں کو سب کو گھیر کر لائیں گے۔ (مریم: ۶۸)

(۴) فَوَرَبِّكَ لَنَسْئَلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ. — اے نبی! آپ کے رب کی قسم! ہم ان سب سے ضرور پوچھیں گے۔ (الحجر: ۹۲)

(۵) فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ. — اے نبی! آپ کے رب کی قسم! وہ مسلمان نہ ہوں گے۔ (النساء: ۶۵)

(۶) فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ. (المعارج: ۴۰) — اور مجھے قسم ہے سب مشرقوں اور مغربوں کے رب کی!

اور باقی تمام قسمیں اپنی مخلوق کے ناموں کے ساتھ ذکر فرمائی ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

(۱) ''وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ'' (التین: ۱) ''انجیر کی قسم اور زیتون کی!''۔

(۲) ''وَالصّٰٓفّٰتِ'' (الصّٰفّٰت: ۱) ''قسم ہے باقاعدہ صف باندھ کر کھڑے ہونے والوں کی!''۔

(۳) ''وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا'' (الشمس: ۱) ''سورج اور اس کی روشنی کی قسم!''

(۴) ''وَالَّيْلِ'' (اللیل: ۱) ''رات کی قسم!''

(۵) ''وَالضُّحٰى'' (الضحیٰ: ۱) ''چاشت کی قسم!''

(۶) ''فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ'' (التکویر: ۱۵) ''قسم ہے ان ستاروں کی جو الٹے پھریں' سیدھے چلیں!''۔

اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کی قسم کیوں کر ذکر فرمائی ہے حالانکہ غیر اللہ کی قسم اٹھانے کی سخت ممانعت آئی ہے۔

تو ہم کہیں گے کہ اس کا جواب کئی طریقوں سے دیا گیا ہے:

- پہلا طریق یہ ہے کہ ان جگہوں پر مضاف محذوف ہے اور اصل میں اس طرح ہے: ''ورب التین ○ ورب الزیتون ○ ورب الشمس'' اور اسی طرح باقی میں ہے۔
- دوسرا طریق یہ ہے کہ اہل عرب ان چیزوں کی تعظیم کرتے تھے اور ان کی قسم کھایا کرتے تھے لہٰذا قرآن کا نزول ان کے عرف کے موافق ہوا ہے۔
- تیسرا طریق یہ ہے کہ قسم صرف ان چیزوں کی کھائی جاتی ہے' جو قسم کھانے والے کے نزدیک بزرگی اور عظمت کی حامل ہوں اور وہ چیزیں قسم کھانے والے سے بلند و بالا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے بلند تر کوئی نہیں ہے' اس لیے اس نے کبھی اس ذات پاک کی قسم یاد فرمائی ہے اور کبھی اپنی مصنوعات کی' کیونکہ مصنوعات اپنے خالق اور صانع کی ذات اور وجود پر دلیل ہیں۔
- ابن ابی حاتم' حسن رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کرتے ہیں' انہوں نے کہا:

بے شک اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں سے جس چیز کی چاہے قسم یاد فرمائے' جب کہ کسی بندے کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سوا دوسری کسی چیز کی قسم کھائے۔

○ علماء بیان فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے قول "لعمرك" میں نبی کریم ﷺ کی قسم بیان فرمائی ہے تا کہ لوگوں کو آپ کا مرتبہ اور اللہ کے نزدیک جو قدر و منزلت ہے' معلوم ہو جائے۔

○ ابن مردویہ' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب مکرم محمد مصطفیٰ ﷺ سے افضل اور زیادہ شان و عظمت والا کوئی نفس پیدا نہیں فرمایا ہے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے علاوہ کسی کی جان کی قسم یاد نہیں فرمائی ہے' صرف آپ کی جان کی قسم بیان فرمائی ہے' ارشاد خداوندی ہے: "لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِیْ سَكْرَتِهِمْ یَعْمَهُوْنَ" (الحجر:۷۲) "اے محبوب (ﷺ)! آپ کی جان کی قسم! بے شک وہ اپنے نشہ میں بھٹک رہے تھے"۔

○ پھر اللہ تعالیٰ ان اصولِ ایمان کی قسم بیان فرماتا ہے' جن کی معرفت لوگوں پر واجب اور ضروری ہے اور وہ اصولِ ایمان جن کی قسم اٹھائی گئی' حسب ذیل ہیں:

(۱) توحید (۲) قرآن حق ہے (۳) رسول برحق ہے (۴) جزا و سزا (۵) اور وعدہ اور وعید۔

○ اوّل یعنی توحید کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ قول "وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا" سے لے کر تا قولہ تعالیٰ "اِنَّ اِلٰـهَكُمْ لَوَاحِدٌ" (الصّٰفّٰت:۱تا۴) "قسم ہے ان کی کہ باقاعدہ صف باندھے پھر ان کو جھڑک کر چلائیں' پھر ان جماعتوں کی کہ قرآن پڑھیں' بے شک تمہارا معبود ضرور ایک ہے"۔

○ دوم کی مثال "فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ○ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِیْمٌ○ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِیْمٌ" (الواقعہ:۷۵تا۷۷) "تو مجھے قسم ہے ان جگہوں کی جہاں (تارے) ڈوبتے ہیں اور تم سمجھو تو یہ بڑی قسم ہے' بے شک یہ عزت والا قرآن ہے"۔

○ سوم کی مثال "یٰسٓ○ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِیْمِ○ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ○" (یٰس:۱تا۳) "یٰس○ قسم ہے قرآن کی جو حکمت سے بھرا ہوا ہے○ (اے محمد ﷺ!) بے شک آپ پیغمبروں میں سے ہیں○" اور "وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰی○ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰی○" (النجم:۱۔۲) "حکمت والے قرآن کی قسم! بے شک تم سیدھی راہ پر بھیجے گئے ہو' اس پیارے چمکتے تارے محمد ﷺ کی قسم! جب یہ معراج سے اترے' تمہارے صاحب نہ بہکے اور نہ بے راہ چلے"۔

○ چہارم (ا) "وَالذّٰرِیٰتِ" تا قولہ تعالیٰ "اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ○ وَّاِنَّ الدِّیْنَ لَوَاقِعٌ" (الذاریات:۱تا۶) "قسم ان کی جو بکھر کر اڑانے والیاں! بے شک جس بات کا تمہیں وعدہ دیا جاتا ہے' ضرور سچ ہے اور بے شک انصاف ضرور ہونا ہے"۔

(ب) "وَالْمُرْسَلٰتِ" تا قولہ "اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ" (المرسلات:۱۔۷) "قسم ان کی جو بھیجی جاتی ہیں لگاتار! بے شک جس بات کا وعدہ تم دیئے جاتے ہو ضرور ہونی ہے"۔

○ پنجم یعنی انسان کے احوال کی قسمیں کھانے کی مثال "وَالَّیْلِ اِذَا یَغْشٰی" تا قولہ تعالیٰ "اِنَّ سَعْیَكُمْ لَشَتّٰی" (اللیل:۱۔۴) "اور رات کی قسم! جب چھا جائے۔۔۔۔ بے شک تمہاری کوشش مختلف ہے"۔

(ب) "وَالْعٰدِیٰتِ" تا قولہ "اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ" (العادیات:۱۔۶) "قسم ہے ان گھوڑوں کی جو میدان میں تیزی سے دوڑتے ہیں' بے شک آدمی اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے"۔

(ج) "وَالْعَصْرِ○ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ○" (العصر:۱۔۲) "اس زمانہ محبوب کی قسم!○ بے شک انسان ضرور نقصان میں ہے"۔

(د) "وَالتِّیْنِ" الی قولہ "لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ" (التین:۱۔۴) "انجیر کی قسم۔۔۔۔ بے شک ہم نے انسان کو اچھی صورت پر بنایا"۔

(ھ) "لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ۔۔۔۔ الی قوله۔۔۔۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ كَبَدٍ" (البلد:۱۔۴) "مجھے اس شہر کی قسم۔۔۔۔ بے شک ہم نے انسان کو مشقت میں رہتا پیدا کیا"۔

مجادلہ کا بیان

قرآن عظیم دلائل و براہین کی جمیع انواع پر مشتمل ہے‘ کوئی برہان‘ دلیل تقسیم اور تحذیر ایسی نہیں جو کہ معلومات عقلیہ اور سمعیہ سے بنائی گئی ہو اور وہ کتاب اللہ میں بیان نہ ہوئی ہو‘ مگر فرق صرف یہ ہے کہ قرآن حکیم نے متکلمین کی طرح دقیق ابحاث میں الجھے بغیر سادہ انداز میں اہل عرب کی عادات اور عرف و رواج کے مطابق دلائل و براہین کو پیش کیا ہے اور قرآن کے اس سادہ اسلوب اور طرز بیان کو اپنانے کی دو وجہیں ہیں:

○ پہلی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے: ”وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ“ (ابراہیم:۴)
”اور ہم نے ہر رسول اس کی قوم ہی کی زبان میں بھیجا کہ وہ انہیں صاف بتائے“۔

○ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ حجت پیش کرنے کے دقیق طریق کی طرف وہی شخص مائل ہوگا‘ جو جلی اور روشن کلام سے دلیل قائم کرنے سے عاجز ہوگا‘ ورنہ جو شخص ایسے واضح ترین کلام سے اپنی بات سمجھا سکتا ہے‘ جس کو اکثر لوگ سمجھ سکتے ہوں‘ اسے کیا پڑی ہے کہ ایسے غامض کلام کی طرف مائل ہو‘ جس کو بہت کم لوگ جانتے ہوں اور قادر الکلام شخص ہرگز اپنی بات کو معمہ اور چیستان بنانے کی کوشش نہیں کرے گا۔

○ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کے لیے دلائل بیان فرمانے کا نہایت واضح طریقہ اختیار فرمایا تا کہ عالم لوگ بھی خطاب کے اس صاف اور نہایت واضح اسلوب سے قرآن کے معانی اور مفاہیم کو تسلی بخش طریقے سے سمجھ جائیں اور اس طرح ان پر حجت تام ہو جائے اور خواص اس اثناء میں ایسے مطالب کو بھی پالیں‘ جو خطباء کے ذہنوں کی رسائی اور ان کے ادراک سے بلند و بالا ہوتے ہیں۔

قرآن کے اسلوبِ مجادلہ اور طرزِ جدل کی مثالوں میں ایک یہ ہے کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ نے معاد جسمانی پر کئی طرق اور اقسام سے دلائل قائم فرمائے ہیں‘ ایک قسم ابتداء یعنی پہلی حالت پر لوٹانے کا قیاس ہے‘ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ”كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ“ (الاعراف:۲۹)” جیسا اس نے تمہارا آغاز کیا‘ ویسے ہی پلٹو گے“۔

○ ”كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ“ (الانبیاء:۱۰۴)” ہم نے جیسے پہلے اسے بنایا تھا‘ ویسے ہی پھر کر دیں گے“۔

○ ”اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ“ (ق:۱۵)” تو کیا ہم پہلی بار بنا کر تھک گئے“۔

دوسری قسم معاد پر اس طرح استدلال فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ زمین اور آسمانوں کی تخلیق پر قادر ہے‘ پھر اس کے لیے مردوں کو زندہ کرنا بہ طریق اولیٰ ثابت ہے کہ یہ اس کی بہ نسبت (تمہارے سمجھنے کے لیے) نہایت آسان ہے۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

”اَوَلَيْسَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ“ (یٰس:۸۱)” اور کیا وہ جس نے آسمان اور زمین بنائی‘ ان جیسے اور نہیں بنا سکتا؟“

○ تیسری قسم: زمین کے مردہ اور ویران ہونے کے بعد بارش وغیرہ سے اس کے دوبارہ زندہ اور سرسبز و شاداب کر دینے پر قیاس کرنا ہے۔

○ چوتھے: تازہ و ہرے بھرے درخت سے آگ کے پیدا کرنے پر مردوں کو دوبارہ زندہ کرنے کا قیاس کرنا ہے۔

○ حاکم وغیرہ روایت کرتے ہیں کہ ابی ابن خلف ایک ہڈی لے کر آیا اور اس کو چکنا چور کر کے بکھیر دیا‘ پھر کہنے لگا: کیا اللہ اس ہڈی کو بوسیدہ اور ریزہ ریزہ ہو جانے کے بعد بھی زندہ کر دے گا؟ پس اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری کہ ”قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِیْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ“ (یٰس:۷۹)” آپ فرمایئے: انہیں وہ زندہ کرے گا جس نے پہلی بار انہیں بنایا“۔ پس اللہ سبحانہ نے نشاۃ ثانیہ کو نشاۃ اولیٰ کی طرف پھیرنے اور دونوں کے درمیان علت حدوث کے مشترک ہونے سے استدلال فرمایا‘ پھر حجت کو مزید پختہ کرنے کے لیے یہ قول بہ طور حجت ارشاد فرمایا کہ ”اَلَّذِیْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا“ (یٰس:۸۰)” جس نے تمہارے لیے ہرے پیڑ میں سے آگ پیدا کی“ اور دو چیزوں کے درمیان بہ حیثیت تبدیل اعراض جامع ہونے کی یہ آیت ایک شئی کی نظر پر قیاس کرنے کی نہایت واضح اور روشن دلیل ہے۔

○ اسی قسم سے تعلق ہے اس استدلال کا کہ صانع عالم ایک ہی ہے اور یہ استدلال دلالت

قانع کے طور پر کیا جاتا ہے' جس کی طرف آیت کریمہ ''لَوْ كَانَ فِيْهِمَا اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا'' (الانبیاء:۲۲) ''اگر آسمان وزمین میں اللہ کے سوا اور خدا ہوتے تو ضرور وہ تباہ ہو جاتے'' مشیر ہے اور آیت مذکور جس تمانع (یعنی متعدد معبودوں کے عدم اتحاد واتفاق) پر دلالت کرتی ہے' اس کی تقریر اس طرح کی جاتی ہے کہ اگر کائنات کے دو صانع و خالق ہوتے تو ہرگز ان کی تدبیریں ایک ہی نظام پر نہ چل سکتیں اور نہ یہ نظام کائنات ایک نہج پر مستحکم ہو سکتا اور لازماً ان دونوں کو یا کسی ایک کو عاجز ہونا پڑتا' اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر ان میں سے ایک صانع کسی جسم کو زندہ کرنے کا ارادہ کرتا اور دوسرے صانع کا ارادہ اسی جسم کو مردہ رہنے دینے کا ہوتا تو اس کی تین صورتیں بنتی ہیں:

(۱) یا دونوں خداؤں کا ارادہ نافذ ہوگا (۲) یا دونوں خداؤں کا ارادہ نافذ نہیں ہوگا (۳) یا ایک کا ارادہ نافذ ہوگا' دوسرے کا نہیں ہوگا۔

اس میں پہلی شق کی پھر دو صورتیں ہیں: یا تو دونوں کا اتفاق فرض کیا جائے گا یا اختلاف' بہ صورت اوّل فعل کی تجزی لازم آتی ہے اور بہ صورت ثانی اجتماع ضدین اور یہ دونوں باتیں محال ہیں۔

اور شق ثانی پر دونوں کا عجز اور بہ صورت ثالث کسی ایک صانع کا عاجز ہونا لازم آتا ہے اور جو عاجز ہو وہ خدا نہیں ہو سکتا' بلکہ خدا وہ ہے جو ہر ممکن پر قادر ہے۔

فن مجادلہ کی اصطلاحات میں سے ایک نوع ''قول بالموجب'' ہے' ابن ابی الاصبع بیان کرتے ہیں:

قول بالموجب کی حقیقت یہ ہے کہ فریق مخالف کے کلام کو اسی کے کلام کے فحوی معنی مدلول ومفہوم سے رد کر دیا جائے۔

اور ''قول بالموجب'' کی دو قسمیں ہیں:

(۱) پہلی قسم یہ ہے کہ غیر کے کلام میں کوئی صفت بہ طور کنایہ اس شئی کے لیے واقع ہو' جس کے لیے حکم ثابت کیا گیا ہے۔ اب وہ صفت اسی پہلی شئی کے سوا دوسرے کے لیے ثابت کر دی جائے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ''يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَا اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ'' (المنافقون:۸) ''کہتے ہیں: ہم مدینہ پھر

کر گئے تو ضرور جو بڑی عزت والا ہے وہ (عزت والا) اس میں سے نکال دے گا اسے جو نہایت ذلت والا ہے اور عزت تو اللہ اور اس کے رسول اور ایمان والوں کے لیے ہے''۔ اس آیت میں منافقوں نے لفظ اعز کنایہ کے طور پر اپنے گروہ کے لیے استعمال کیا ہے اور اذل (ذلیل) کا لفظ گروہ مومنین کے لیے بہ طور کنایہ استعمال کیا اور منافقوں نے اپنی جماعت کے لیے یہ بات ثابت کی تھی کہ وہ ایمان والوں کو مدینہ سے نکال دیں گے۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان کا رد فرماتے ہوئے صفت عزت کو منافقین کے بجائے ان کے مقابل جماعت کے لیے ثابت کر دی' جو اللہ' رسول اور ایمان والوں کی جماعت ہے' پس گویا یہ کہا گیا کہ ہاں یہ صحیح ہے کہ عزت والے وہاں سے ذلیل لوگوں کو شہر بدر کریں گے' مگر وہ ذلیل اور دلیس نکالے لوگ خود منافقین ہیں اور اللہ اور اس کے رسول مکرم عزت والے اور نکال باہر کرنے والے ہیں۔

○ قسم دوم یہ ہے کہ ایک لفظ کو جو غیر کلام میں واقع ہوا ہے' اس کو اس شخص کی مراد کے خلاف پر محمول کر دیا جائے اور وہ لفظ اپنے متعلق کے ذکر سے اس کا محتمل بھی ہو۔

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ میری نظر سے کوئی ایسا شخص نہیں گزرا' جس نے قرآن مجید سے اس کی کوئی مثال پیش کی ہو۔

ہاں خود میں اس قسم کی ایک آیت ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہوا ہوں' وہ آیت یہ ہے' اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

''وَمِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ'' (التوبہ:۶۱)

''اور ان میں کوئی وہ ہیں کہ ان غیب کی خبریں دینے والے کو ستاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ تو کان ہیں تم فرماؤ تمہارے بھلے کے لیے کان ہیں''۔ فن جدل میں قرآن کی اصطلاحات میں سے ایک مناقضہ بھی ہے۔

اور مناقضہ اس چیز سے عبارت ہے کہ ایک امر کو کسی محال اور ناممکن شئی پر لٹکا دیا جائے اور محال شئے سے متعلق کرنے میں اس بات کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ اس کا وقوع ہی دائرہ امکان سے خارج ہے' مثلاً اللہ تعالیٰ کا قول ہے:

''وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ'' (الاعراف:۴۰) ''اور

نہ وہ جنت میں داخل ہوں جب تک سوئی کے ناکے میں اونٹ نہ داخل ہو“۔

ایک اور قسم ”مجاراۃ الخصم“ ہے‘ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ خصم یعنی فریق مخالف اور مدمقابل لغزش کھائے اور پھسل کر اپنے ہی بعض مقدمات کو اس جگہ تسلیم کرے‘ جہاں کہ اس کو الزام دینا اور قائل کرنا مقصود تھا۔

مثلاً اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

”قَالُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ O قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ“ (ابراہیم ۱۱-۱۰)

”بولے: تم تو ہمارے جیسے آدمی ہو‘ تم چاہتے ہو کہ ہمیں اس سے باز رکھو جو ہمارے باپ دادا پوجتے ہیں‘ اب کوئی روشن سند ہمارے پاس لے آؤ‘ ان کے رسولوں نے ان سے کہا: ہم ہیں تو تمہاری طرح انسان“۔ اس جگہ رسولوں کا یہ کہنا کہ ”اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ“ (ابراہیم: ۱۱) ”بے شک ہم بھی تمہاری طرح انسان ہیں“‘ اس میں ایک طرح کا اقرار ان کے بشریت ہی میں منحصر ہونے کا پایا جاتا ہے اور اس طرح گویا انہوں نے اپنی ذوات سے رسالت کا انتفاء تسلیم کر لیا حالانکہ یہ قطعاً مراد نہیں ہے بلکہ ان کا یہ فرمان ”مجارہ خصم“ کے قبیل سے ہے‘ جس سے مقصود فریق مخالف کی دلجوئی کرنا اور ان کو بہلانا ہے‘ پس گویا کہ انبیاء کرام نے یوں کہا ہے: تم نے ہمارے بشر ہونے کی بابت جو کچھ کہا ہے‘ وہ بجا ہے اور ہم اس سے انکاری نہیں ہیں‘ لیکن یہ بات کچھ اس کے منافی تو نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل عظیم سے ہمیں منصب رسالت کے لیے چن لیا ہے۔

قرآن پاک میں واقع اسماء والقاب اور کنیتوں کا بیان

قرآن مجید میں انبیاء اور مرسلین علیہم السلام میں سے پچیس کے اسماء مبارک ذکر ہوئے ہیں اور وہ مشہور انبیاء علیہم السلام ہیں:

- ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام — حضرت نوح علیہ السلام
- حضرت ادریس علیہ السلام — حضرت ابراہیم علیہ السلام
- حضرت اسماعیل علیہ السلام — وہ ابراہیم علیہ السلام کے بڑے بیٹے ہیں۔

- حضرت اسحاق علیہ السلام‘ آپ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ولادت کے چودہ سال بعد پیدا ہوئے۔
- حضرت یعقوب علیہ السلام‘ آپ نے ایک سو سینتالیس سال عمر پائی۔
- حضرت یوسف علیہ السلام ابن یعقوب ابن اسحاق ابن ابراہیم علیہم السلام۔
- حضرت لوط علیہ السلام‘ ابن اسحاق کا قول ہے: وہ لوط ابن ہاران ابن آزر ہیں۔
- حضرت ہود علیہ السلام — حضرت صالح علیہ السلام
- حضرت شعیب علیہ السلام — حضرت موسیٰ علیہ السلام
- حضرت ہارون علیہ السلام — حضرت داؤد علیہ السلام
- حضرت سلیمان علیہ السلام‘ آپ حضرت داؤد علیہ السلام کے جگر گوشہ ہیں۔
- حضرت ایوب علیہ السلام — حضرت ذوالکفل علیہ السلام
- حضرت یونس علیہ السلام — حضرت الیاس علیہ السلام
- حضرت الیسع علیہ السلام — حضرت زکریا علیہ السلام
- حضرت یحییٰ علیہ السلام (آپ حضرت زکریا علیہ السلام کے بیٹے ہیں)۔
- حضرت عیسیٰ علیہ السلام
- خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ علیہ التحیۃ والثناء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

اسماء ملائکہ (فرشتوں کے نام)

قرآن مجید میں جن فرشتوں کے اسماء آئے ہیں‘ یہ ہیں:

حضرت جبرائیل‘ میکائیل‘ مالک (یہ فرشتہ جہنم کا داروغہ ہے)۔

ہاروت اور ماروت۔

نوٹ: علامہ سیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ عنہ نے الاتقان میں مختلف روایات کے حوالہ سے کچھ اور بھی اسماء ذکر کیے ہیں‘ مثلاً الرعد‘ برق‘ سجل‘ قعید‘ ذوالقرنین‘ روح اور سکینہ‘ اس طرح فرشتوں کے اسماء کی کل تعداد بارہ ہوئی۔ (مترجم)

صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کا نام قرآن مجید میں آیا ہے۔

رسولوں اور انبیاء علیہم السلام کے علاوہ جن متقدمین حضرات کے نام قرآن میں آئے ہیں' یہ ہیں:

عمران' مریم کے باپ عزیز' تبع' لقمان' یوسف (جن کا ذکر سورہ غافر میں ہے) اور یعقوب کا سورہ مریم کے اوّل میں ان کا ذکر آیا ہے اور ''تقی'' اللہ تعالیٰ کے قول ''اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا'' (مریم:۱۸)'' میں (مریم) تجھ سے رحمٰن کی پناہ مانگتی ہوں اگر تو اللہ سے ڈرنے والا ہے''۔ اس میں کہا گیا ہے کہ یہ ایک ایسے مرد کا نام ہے' جو عالمی شہرت کا حامل تھا اور اس کا نام زبان زد عام تھا' مراد یہ ہے کہ اگر تو نیک چال میں تقی کی مثل ہے تو میں تجھ سے پناہ مانگتی ہوں' اس بات کو ثعلبی نے نقل کیا ہے۔

قرآن مجید میں عورتوں کے نام

قرآن مجید میں صرف ایک عورت حضرت مریم کا نام آیا ہے' اس کے علاوہ کسی عورت کا نام مذکور نہیں' ایک قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ''اتدعون بعلا'' میں لفظ ''بعل'' ایک خاتون کا نام ہے' جس کو لوگ دیوی مانتے اور اس کی پرستش کرتے تھے' یہ قول ابن عساکر سے منقول ہے۔

قرآن پاک میں کافروں کے مندرجہ ذیل نام ذکر ہوئے ہیں:

قارون' آزر' جالوت اور ہامان۔

قرآن مجید میں جنات کے ناموں سے ان کے دادا ابلیس کا نام آیا ہے۔

قبائل کے نام

قرآن پاک میں قبیلوں میں سے یاجوج' ماجوج' عاد' ثمود' مدین' قریش اور الروم کے نام آئے ہیں۔

قوموں کے نام

اقوام کے نام جو کہ دوسرے ناموں کی طرف مضاف ہو کر آئے ہیں' حسب ذیل ہیں:
قوم نوح' قوم لوط' قوم تبع' قوم ابراہیم اور اصحاب الایکہ اور کہا گیا ہے کہ اصحاب الایکہ ہی مدین ہیں اور اصحاب الرس' قوم ثمود کے باقی ماندہ لوگ ہیں۔ یہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے' عکرمہ کہتے ہیں کہ وہ اصحاب یاسین ہیں اور حضرت قتادہ کا قول ہے کہ وہ قوم شعیب ہیں اور کہا

گیا کہ وہ اصحاب الاخدود ہیں' اسی کو ابن جریر نے پسندیدہ قول قرار دیا ہے۔ قرآن پاک میں بتوں کے ایسے نام جو کہ انسانوں کے نام پر رکھے گئے ہیں' حسب ذیل ہیں:

وڈ' سواع' یغوث' یعوق اور نسر یہ' قوم نوح کے اصنام تھے۔

لات' عزیٰ اور مناۃ بتان قریش کے نام تھے' اسی طرح ''الرجز'' اس شخص کے نزدیک بت کا نام ہے' جس نے اس کو راء کے پیش کے ساتھ پڑھا ہے۔

امام اخفش نے کتاب ''الجمع والواحد'' میں ذکر کیا ہے کہ ''رجز'' ایک صنم کا نام ہوتا تھا۔

اور جبت' طاغوت اور بعل بھی بتوں کا نام ہیں۔ قرآن پاک میں شہروں کے خاص مقامات' جگہوں اور پہاڑوں کے حسب ذیل اسماء ہیں:

بکہ (یہ شہر مکہ کا نام ہے)' مدینہ منورہ' بدر' احد' حنین' مشعر الحرام' مصر' بابل' الایکہ' الحجر' الاحقاف' طور سینا' الجودی' طوی (ایک وادی کا نام ہے)' الکھف' الرقیم' العرم' حرد' الصرم۔ ابن جریر' حضرت سعید ابن جبیر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ ملک یمن میں ایک خطہ زمین ہے جو اس نام سے موسوم ہے۔

''ق'': ایک پہاڑ جو زمین کے گرد محیط ہے۔

''الجرز'': یہ ایک خطہ زمین کا نام ہے۔

''الطاغیہ'': روایت ہے کہ یہ زمین کے اس علاقہ کا نام ہے' جہاں قوم ثمود کو پیوند خاک کیا گیا تھا' یہ دونوں قول الکرمانی سے منقول ہیں۔

قرآن مجید میں آخرت کے مقامات میں سے مندرجہ ذیل جگہوں کے نام آئے ہیں:

''فردوس'': یہ جنت میں چوٹی کا علاقہ ہے۔

''علیون'': روایت ہے کہ یہ جنت کا بالائی مقام ہے۔

''الکوثر'': جنت کی ایک نہر ہے۔

''سلسبیل'' اور ''تسنیم'': جنت میں دو چشموں کے نام ہیں۔

''سجین'': ایک جگہ کا نام ہے' جو کفار کی روحوں کا ٹھکانا ہے۔

''صعود'': جہنم میں ایک پہاڑ ہے جیسا کہ ترمذی میں ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے۔

''غی' آثام' موبق' سعیر' ویل' شائل ''اور'' سحق '': یہ سب جہنم کی وادیاں ہیں۔

''یحموم'': سیاہ دھوئیں کا نام ہے۔

قرآن پاک میں کواکب (ستاروں) کے ناموں میں سے شمس' قمر' طارق اور شعری آئے ہیں۔

بعض علماء نے بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں پرندوں کی دس جنسوں کے نام ذکر کیے ہیں:

سلویٰ' بعوض' مچھر' ذباب (مکھی)' النحل (شہد کی مکھی)' العنکبوت (مکڑی)' الجراد' ٹڈی' ہدہد' غراب' کوا' ابابیل' غل' چیونٹی اور رہی کنیت تو وہ قرآن پاک میں صرف ابولہب کی کنیت کا ذکر ہوا ہے' اس کے علاوہ اور کوئی کنیت مذکور نہیں ہوئی' ابولہب کا نام عبدالعزیٰ تھا۔

فوائد: مصحف شریف کو بوسہ دینا مستحب ہے' کیونکہ حضرت عکرمہ بن ابی جہل ایسا ہی کرتے تھے۔

مصحف کے چومنے کو حجر اسود کے بوسہ دینے پر بھی قیاس کرنا' بعض علماء نے ذکر کیا ہے۔

اور اس لیے بھی قرآن مجید کو چومنا مستحب ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدیہ ہے' لہٰذا اس کو چومنا ایسے ہی جائز امر ہوا' جس طرح کہ چھوٹے بچے کو بوسہ دینا مستحب ہے اور یہ عمل اظہارِ محبت کی غمازی کرتا ہے۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے اس سلسلے میں تین روایتیں آئی ہیں:

جواز' استحباب اور توقف' اس لیے کہ اگرچہ مصحف پاک کو بوسہ دینے میں کلام الٰہی کی رفعت اور اس کی تعظیم کا اظہار ہوتا ہے۔ مگر اس میں قیاس کو کچھ دخل نہیں ہے' اسی لیے حضرت امیر المومنین فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے حجر اسود کے بارے میں (اس کو مخاطب کر کے) فرمایا تھا کہ ''لولا انی رایت رسول اللہ (ﷺ) یقبلک ما قبلتک'' اگر میں نے رسول پاک ﷺ کو تجھے بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو میں کبھی تجھ کو بوسہ نہ دیتا۔

○ قرآن شریف کو خوشبو لگانا اور اسے رحل وغیرہ' کسی اونچی چیز پر رکھنا مستحب ہے اور اس کو تکیہ بنانا حرام ہے' اس لیے کہ اس طرح کرنے میں قرآن کریم کی بے ادبی اور بے

حرمتی ہوتی ہے۔

امام زرکشی نے کہا ہے کہ اسی طرح قرآن پاک کی طرف پاؤں دراز کرنا بھی حرام ہے۔

ابن ابی داؤد نے کتاب المصاحف میں سفیان سے روایت کیا ہے' ان کے نزدیک مصحف شریف کو لٹکانا مکروہ ہے اور ضحاک سے روایت ہے کہ حدیث شریف کے لیے قرآن پاک کی طرح کرسیاں (رحلیں یا بلند تپائیاں) استعمال نہ کرو۔

ایک صحیح روایت سے یہ ثابت ہے کہ قرآن پاک کو تعظیم کے لیے چاندی سے مزین اور آراستہ کرنا جائز ہے۔

امام بیہقی نے ولید بن مسلم سے روایت کی ہے' وہ کہتے ہیں کہ میں نے مالک رحمۃ اللہ علیہ سے مصاحف پر چاندی چڑھانے کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے ایک مصحف لا کر ہمیں دکھایا اور فرمانے لگے: میرے والد نے میرے دادا جان سے یہ روایت بیان کی ہے کہ صحابہ کرام علیہم الرضوان نے قرآن مجید کو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد میں جمع کیا تھا اور انہوں نے مصاحف کو اس طرح یا اس کی مانند آبِ سیم سے آراستہ اور مزین کیا تھا۔

لیکن یہ مسئلہ کہ مصحف کو آبِ زر سے آراستہ کرنے کا کیا حکم ہے؟ تو زیادہ درست بات یہ ہے کہ مرد کے لیے ناجائز اور عورت کے لیے جائز ہے۔

بعض علماء نے فرمایا ہے کہ مصحف پر سونا چاندی چڑھا کر آراستہ کرنے کا جواز صرف خود مصحف کے ساتھ خاص ہے' بخلاف جو اس سے جدا ہوتا ہے' اس حکم میں شامل نہیں ہے' مگر اظہر یہ ہے کہ دونوں کے لیے یکساں جواز ہے۔

قرآن پاک کے نسخے پرانے اور بوسیدہ ہونے کی صورت میں کیا کیے جائیں؟

اگر قرآن مجید کے اوراق کو پرانے اور بوسیدہ ہو جانے یا ایسی کسی اور وجہ سے از کاررفتہ اور ناقابل استعمال بنانے کی ضرورت پیش آ جائے تو ان کو دیوار کی دراڑ یا کسی اور ایسی جگہ رکھنا جائز نہیں ہے' کیونکہ وہاں سے ان کے گرنے کا احتمال ہے' اسی طرح وہ پاؤں کے نیچے آئیں گے اور بے حرمتی ہوگی۔

اسی طرح اوراق قرآنیہ کو پھاڑنا بھی جائز نہیں ہے' کیونکہ اس طرح کرنے میں حروف کی کتر برید اور کلام کے حصے بخرے کرنا لازم آتا ہے' اس طرح رقم شدہ اور مسطور چیز کی توہین

ہیں؟ انہوں نے عرض کیا: ہاں۔ اس روایت کو عبدالرزاق نے اپنی تفسیر میں اسی طرح بیان کیا ہے۔

ابن ابی حاتم نے عکرمہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے' وہ بیان کرتے ہیں کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا گیا کہ قرآن پاک میں ارجی (یعنی سب سے امید افزا) آیت کون سی ہے؟ تو انہوں نے ارشاد فرمایا کہ وہ اللہ تعالیٰ کا قول "اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا" (حم السجدہ: ۳۰) "بے شک وہ لوگ جنہوں نے کہا: ہمارا رب اللہ ہے' پھر اس پر قائم رہے"۔ ابن ابی حاتم' حسن سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا: میں نے ابوہریرہ اسلمی سے سوال کیا: قرآن پاک میں وہ کون سی آیت ہے جو اہل نار پر سب سے زیادہ گراں بار ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا: ان پر سب سے سخت آیت "فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا" (النباء: ۳۰) "اب چکھو! کہ ہم تمہیں نہ بڑھائیں گے مگر عذاب" ہے۔

بعض علماء کا بیان ہے:

- ○ قرآن مجید میں سب سے لمبی سورت البقرہ ہے۔
- ○ سب سے مختصر سورت' سورہ الکوثر ہے۔
- ○ سب سے لمبی آیت' آیت دین ہے۔
- ○ سب سے مختصر آیت قرآن میں "وَالضُّحٰى" (الضحیٰ: ۱) "چاشت کی قسم" اور "وَالْفَجْرِ" (الفجر: ۱) "اس صبح کی قسم" ہے۔
- ○ رسم الخط کے لحاظ سے قرآن مجید میں سب سے طویل کلمہ "فَاَسْقَيْنٰكُمُوْهُ" (الحجر: ۲۲) "پھر وہ (پانی) تمہیں پینے کو دیا" قرآن پاک میں دو آیتیں ایسی ہیں کہ ان میں ہر آیت میں حروف معجم جمع ہیں اور وہ یہ ہیں: "ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً (الایۃ)" (آل عمران: ۱۵۴) "پھر تم پر غم کے بعد چین کی نیند اتاری" اور "مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" (الفتح: ۲۹) "محمد اللہ کے رسول ہیں"۔
- ○ قرآن پاک میں (حا) کے بعد (حا) بغیر کسی فاصلہ اور آڑ کے صرف دو مقام پر آئی ہے: (۱) "عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى" (البقرۃ: ۲۳۵) "نکاح کی گرہ (پکی نہ کرو) یہاں تک کہ" (۲) "لَآ اَبْرَحُ حَتّٰى" (الکہف: ۶۰) "میں باز نہ رہوں گا یہاں تک کہ" اسی

طرح دو کاف بلا فاصل دو ہی جگہ آئے ہیں: (۱) "مَنَاسِكَكُمْ" (البقرہ: ۲۰۰) "حج کے کام" (۲) "مَا سَلَكَكُمْ" (المدثر: ۴۲) "تمہیں کیا بات لے گئی" اسی طرح دو غین بھی بلا رکاوٹ اور حرف فاصل کے ایک جگہ آئے ہیں: "وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ" (آل عمران: ۸۵) "اور جو اسلام کے سوا کوئی دین چاہے گا"۔

- ○ اور آیت دین کے سوا کوئی آیت ایسی نہیں ہے' جس میں تیئس کاف جمع ہوں۔
- ○ اور مواریث دو آیتوں کے سوا کوئی دو آیتیں ایسی نہیں' جن میں تیرہ وقف آئے ہوں۔
- ○ اور کوئی تین آیات والی ایسی سورت نہیں' جس میں دس واؤ آئے ہوں' سوائے سورہ والعصر کے۔
- ○ اور یہ خصوصیت صرف سورہ الرحمٰن کی ہے کہ اس کی اکیاون آیتوں میں باون وقف ہیں۔
- ○ ابوعبداللہ الخبازی المقری بیان کرتے ہیں کہ جب میں پہلی مرتبہ سلطان محمود بن ملک شاہ کے دربار میں گیا تو انہوں نے مجھ سے ایک سوال پوچھا کہ یہ بتاؤ کہ قرآن مجید کی وہ کون سی آیت ہے' جس کے اوّل میں (غین) ہو؟ میں نے جواب دیا کہ ایسی آیات تین ہیں: (۱) "غَافِرِ الذَّنْبِ" (الغافر: ۳) "گناہ بخشنے والا" (۲) "غُلِبَتِ الرُّوْمُ ○" (الروم: ۲) "رومی مغلوب ہوئے" (۳) اور "غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ" (الفاتحہ: ۷) "نہ ان کی جن پر (تیرا) غضب ہوا"۔

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے شیخ الاسلام ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کے مخطوطہ سے نقل فرمایا ہے کہ قرآن پاک میں چار پے در پے (لگاتار) شدات حسب ذیل آیات میں آئے ہیں:

(۱) "وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ○ رَبُّ السَّمٰوٰتِ" (مریم: ۶۵-۶۴) "اور حضور کا رب بھولنے والا نہیں ○ آسمانوں کا رب" (۲) "فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰهُ مَوْجٌ" (النور: ۴۰) "کسی کنڈے کے دریا میں جسے گھیرا ہوا ہو موج نے" (۳) "قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ" (یٰس: ۵۸) "مہربان رب کا فرمایا ہوا" (۴) "وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ" (الملک: ۵) "اور بے شک ہم نے مزین کیا آسمان کو"۔

مبہم آیات کا بیان

معلوم ہونا چاہیے کہ علم مبہمات کا مرجع محض نقل ہے (یعنی اس میں قیاس آرائی کی گنجائش نہیں ہے) اس جگہ ہم صرف بعض اہم آیات مبہمات کے ذکر کرنے پر اکتفاء کریں گے' ان کی مثالیں حسب ذیل ہیں:

مبہم آیات	ترجمہ آیات	مراد و مبہم کا بیان
(۱) اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً. (البقرہ: ۳۰)	میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں۔	آدم وحواء علیہم السلام سے مراد ہے۔
(۲) وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ. (البقرہ: ۲۰۴)	اور بعض آدمی وہ ہے کہ دنیا میں اس کی بات تجھے بھلی لگے۔	وہ اخنس بن شریک ہے۔
(۳) وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْرِیْ نَفْسَهُ. (البقرہ: ۲۰۷)	اور کوئی آدمی اپنی جان بیچتا ہے۔	وہ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ ہیں۔
(۴) مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ. (البقرہ: ۲۵۳)	ان میں سے کسی سے اللہ نے کلام فرمایا۔	مجاہد کا بیان ہے کہ اس سے حضرت موسیٰ علی نبینا مراد ہیں۔
(۵) وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ. (البقرہ: ۲۵۳)	کوئی وہ ہے جسے سب پر درجوں میں بلند کیا۔	مجاہد ہی کا قول ہے کہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔
(۶) اِمْرَاَتُ عِمْرٰنَ. (آل عمران: ۳۵)	عمران کی بی بی۔	ان کا نام حنہ بنت فاقوذ تھا۔
(۷) مُنَادِیًا یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ. (آل عمران: ۱۹۳)	(اے ہمارے رب!) ہم نے ایک منادی کو سنا کہ ایمان کے لیے ندا فرماتا ہے۔	وہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔
(۸) وَمَنْ یَّخْرُجْ مِنْ بَیْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ	اور جو اپنے گھر سے نکلا اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کرتا	وہ ضمرہ بن جندب تھے۔

مبہم آیات	ترجمہ آیات	مراد و مبہم کا بیان
ثُمَّ یُدْرِكْهُ الْمَوْتُ. (النساء: ۱۰۰)	پھر اسے موت نے آلیا۔	
(۹) وَاِنِّیْ جَارٌ لَّكُمْ. (الانفال: ۴۸)	اور تم میری پناہ میں ہو۔	اس سے سراقہ بن جعشم مراد ہے۔
(۱۰) اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ. (التوبہ: ۴۰)	جب اپنے یار سے فرماتے تھے۔	صاحب سے حضرت سیدنا ابوبکر صدیق خلیفہ اول مراد ہیں۔
(۱۱) وَمِنْهُمْ مَّنْ یَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّیْ. (التوبہ: ۴۹)	اور ان میں کوئی تم سے یوں کہے کہ مجھے رخصت دیجئے۔	مراد مصداق کا بیان: یہ کہنے والا الجد بن قیس تھا۔
(۱۲) وَمِنْهُمْ مَّنْ یَّلْمِزُكَ فِی الصَّدَقٰتِ. (التوبہ: ۵۸)	اور ان میں کوئی وہ ہے کہ صدقے بانٹنے میں تم پر طعن کرتا ہے۔	وہ شخص ذوالخویصرہ۔
(۱۳) اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَآئِفَةٍ مِّنْكُمْ. (التوبہ: ۶۶)	اگر ہم تم میں سے کسی کو معاف کریں۔	وہ مخشی بن حمیر تھا۔
(۱۴) وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ. (التوبہ: ۷۵)	اور ان میں کوئی وہ ہیں جنہوں نے اللہ سے عہد کیا۔	ثعلبہ بن حاطب وغیرہ۔
(۱۵) وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ. (التوبہ: ۱۰۲)	اور کچھ وہ ہیں جو اپنے گناہوں کا اقرار کرنے والے ہوئے۔	ابن عباس فرماتے ہیں: وہ سات آدمی ابو لبابہ اور اس کے ساتھی جد ابن قیس حرام' اوس کروم اور مرداس۔
(۱۶) وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ. (التوبہ: ۱۰۶)	اور کچھ موقوف رکھے گئے ہیں۔	وہ لوگ ہلال بن امیہ' مرارہ ابن الربیع اور کعب بن مالک رضی اللہ عنہم اور یہی تین حضرات جنگ تبوک کے موقع پر مدینہ منورہ میں پیچھے رہ گئے تھے۔

(۱۷)وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا. (التوبہ:۱۰۷)	اور جنہوں نے مسجد بنائی ضرر پہنچانے کو۔	ابن اسحاق کا بیان ہے کہ وہ بارہ افراد انصار میں سے تھے۔
(۱۸)اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ. (هود:۱۷)	اور کیا وہ اپنے رب کی طرف سے روشن دلیل پر ہو۔	مراد حضرت محمد ﷺ سے ہے۔
(۱۹)وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ. (هود:۱۷)	اور اس پر اللہ کی طرف گواہ لائے۔	اس سے مراد کون ہے؟ اس میں چند اقوال آئے ہیں: (۱) جبرائیل علیہ السلام (۲) قرآن مجید (۳) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ (۴) حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم۔
(۲۰)اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ. (الحجر:۹۵)	بے شک ان ہنسنے والوں پر ہم تمہیں کفایت کرتے ہیں۔	حضرت سعد بن جبیر کا بیان ہے کہ وہ ہنسی اڑانے والے پانچ شخص تھے' جن کے نام یہ ہیں: ولید ابن المغیرہ' العاص ابن وائل' ابوزمعہ' حارث ابن قیس' اسود ابن عبد یغوث۔
(۲۱)وَمَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ. (النحل:۷۶)	اور جو انصاف کا حکم کرتا ہے۔	حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ مراد ہے۔
(۲۲)هٰذٰنِ خَصْمٰنِ. (الحج:۱۹)	یہ دو فریق ہیں۔	حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ یہ آیت حمزہ' عبیدہ ابن الحارث' ولید ابن عتبہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

(۲۳)امْرَاَةً تَمْلِكُهُمْ. (النمل:۲۳)	ایک عورت ان پر بادشاہی کر رہی ہے۔	یہ عورت بلقیس بنت شراحیل تھی۔
(۲۴)اَلَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ. (النمل:۴۰)	اس نے عرض کی' جس کے پاس کتاب کا علم تھا۔	یہ آصف ابن برخیا' حضرت سلیمان علیہ السلام کے کاتب تھے۔
(۲۵)اِمْرَاَتُ فِرْعَوْنَ. (القصص:۹)	فرعون کی بی بی۔	آسیہ بنت مزاحم۔
(۲۶)اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا. (السجدہ:۱۸)	تو کیا جو ایمان والا ہے وہ اس جیسا ہو جائے گا جو بے حکم ہے۔	یہ آیت حضرت علی اور ولید بن عتبہ کے بارے میں نازل ہوئی۔
(۲۷)قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ. (المجادلہ:۱)	بے شک اللہ نے سنی اس کی بات جو تم سے بحث کرتی ہے۔	وہ خاتون خولہ بنت ثعلبہ ہے۔
(۲۸)فِيْ زَوْجِهَا. (المجادلہ:۱)	اپنے شوہر کے معاملہ میں۔	شوہر کا نام اوس بن صامت ہے۔
(۲۹)اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ. (التحریم:۳)	نبی پاک نے اپنی ایک بی بی سے راز کی بات فرمائی۔	وہ زوجہ محترمہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا ہیں۔
(۳۰)نَبَّاَتْ بِهٖ. (التحریم:۳)	پھر جب وہ اس کا ذکر کر بیٹھی۔	حضرت حفصہ نے حضرت عائشہ کو راز بتا دیا تھا۔
(۳۱)اِنْ تَتُوْبَآ (تا) وَاِنْ تَظٰهَرَا. (التحریم:۴)	نبی کی دونوں بیویو! اگر اللہ کی طرف تم رجوع کرو اور اگر ان پر زور باندھو۔	وہ دونوں حضرت ام المومنین حضرت حفصہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما ہیں۔
(۳۲)وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ. (التحریم:۴)	اور نیک ایمان والے۔	طبرانی نے الاوسط میں بیان کیا ہے کہ اس سے مراد حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما ہیں۔

آیت	ترجمہ	وضاحت
(۳۳) ذَرْنِیْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِیْدًا. (المدثر:۱۱)	اسے مجھ پر چھوڑ جسے میں نے اکیلا پیدا کیا۔	وہ ولید بن مغیرہ ہے۔
(۳۴) فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰی. (القیامہ:۳۱)	اس نے نہ سچ مانا اور نہ نماز پڑھی۔	یہ آیات ابوجہل کے بارے میں نازل ہوئیں۔
(۳۵) اَنْ جَآءَہُ الْاَعْمٰی. (عبس:۲)	اس پر کہ اس کے پاس وہ نابینا حاضر ہوا۔	وہ آنے والے حضرت عبداللہ ابن ام مکتوم تھے۔
(۳۶) اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی. (عبس:۵)	وہ جو بے پرواہ بنتا ہے۔	وہ امیہ بن خلف تھا اور ایک قول یہ ہے کہ وہ عتبہ بن ربیعہ ہے۔

قرآن مجید میں ابہام کے آنے کے اسباب و وجوہ کا بیان

قرآن میں ابہام کے آنے کی کئی وجوہ ہیں:

پہلی: وجہ یہ ہے کہ چونکہ دوسری جگہ اس کا بیان ہو جانے کی وجہ سے وہ مستغنی عن البیان ہے، لہٰذا مبہم ذکر کر دیا جاتا ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ کا قول: ''صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ'' (الفاتحہ:۶) ''ان لوگوں کی راہ جن پر تو نے انعام فرمایا'' اس جگہ بیان نہیں کیا کہ وہ کون لوگ ہیں جن پر انعام ہوا، مگر اس کا بیان دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کے قول ''مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ'' (النساء:۶۹) ''ان کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیا جو انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین ہیں'' میں آ گیا ہے۔

دوسری: وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس لیے مبہم رکھتے ہیں کہ وہ اپنے مشہور ہونے کی بناء پر متعین ہے مثلاً اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ''وَقُلْنَا یٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ'' (البقرہ:۳۵) ''اور ہم نے فرمایا: اے آدم! تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو'' کہ اس جگہ اللہ تعالیٰ نے ''حوا'' نہیں فرمایا، جس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی ان کے سوا کوئی دوسری

بیوی تھی ہی نہیں لہٰذا وہ متعین ہیں، محتاج نہیں ہے یا ''اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِیْ رَبِّهٖۤ'' (البقرہ:۲۵۸) ''(اے محبوب!) کیا آپ نے اس شخص کو نہ دیکھا جس نے جھگڑا کیا ابراہیم سے ان کے رب کے بارے میں'' کہ یہاں نمرود مراد ہے، اس کو بیان نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ بات مشہور ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نمرود کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔

تیسری: وجہ یہ ہے کہ بیان نہ کرنے میں کسی شخص کی پردہ پوشی مقصود ہوتی ہے تاکہ یہ طریقہ اس کو برائی سے بچانے میں زیادہ موثر ثابت ہو اور اس پر نرمی ہو جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ''وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا'' (البقرہ:۲۰۴) ''اور بعض آدمی وہ ہیں کہ دنیا کی زندگی میں اس کی بات تجھے بھلی لگے'' الایہ، وہ شخص اخنس بن شریق تھا، جو بعد میں دولت ایمان سے بہرہ ور ہوا اور بہت اچھا مسلمان ثابت ہوا۔

چوتھی: وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس مبہم چیز کے متعین کرنے میں کوئی بڑا فائدہ نہیں ہوتا جیسے ''اَوْ كَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰى قَرْیَةٍ'' (البقرہ:۲۵۹) ''یا اس کی طرح جو گزرا ایک بستی پر'' اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا قول ''وَسْئَلْهُمْ عَنِ الْقَرْیَةِ'' (الاعراف:۱۶۳) ''اور ان سے اس بستی کا حال پوچھو''۔

پانچویں: وجہ یہ ہے کہ اس چیز کے عموم پر تنبیہ کرنا مقصود ہوتی ہے کہ یہ خاص نہیں ہے، عام ہے کیونکہ اس کے برعکس اگر تعین کر دی جاتی تو اس میں خصوصیت پیدا ہو جاتی، ہمہ گیریت نہ رہتی، جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ''وَمَنْ یَّخْرُجْ مِنْۢ بَیْتِهٖ مُهَاجِرًا'' (النساء:۱۰۰) ''اور جو اپنے گھر سے نکلے ہجرت کر کے''۔

چھٹی: وجہ یہ ہے کہ اسم اس کے بغیر اس لیے ذکر کرتے ہیں کہ وصف کامل کے ساتھ موصوف کرنے میں اس کی تعظیم مقصود ہوتی ہے، جیسے ''وَلَا یَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ'' (النور:۲۲) ''اور تم میں سے جو لوگ صاحب فضل اور وسعت والے ہیں'' اور ''وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖۤ'' (الزمر:۳۳) ''اور جو سچی بات لے کر آئے اور جنہوں نے اس کی تصدیق کی'' اور ''اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ'' (التوبہ:۴۰) ''جب وہ اپنے ساتھی سے فرما رہے تھے'' حالانکہ ان سب جگہوں میں مراد سچا دوست (صدیق) ہی ہے۔

ساتویں: وجہ ابہام رکھنے کی یہ ہوا کرتی ہے کہ وصف ناقص کے ساتھ تحقیر کرنے کا قصد ہوتا ہے' مثلاً اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ''اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ'' (الکوثر:۳) بے شک تمہارا دشمن ہی وہی ہر خیر سے محروم ہے۔

قرآن کی تفسیر وتاویل کی معرفت اور اس کی ضرورت کا بیان

تفسیر اور تاویل کے بارے میں اختلاف ہے۔

ابوعبیدہ اور ایک گروہ کا کہنا ہے کہ یہ دونوں لفظ ہم معنی ہیں' امام راغب کا قول یہ ہے کہ تفسیر کا معنی تاویل کی بہ نسبت عام ہے' تفسیر کا استعمال زیادہ تر الفاظ اور مفردات میں ہوتا ہے اور تاویل کا استعمال اکثر معانی اور جملوں میں ہوتا ہے' پھر (یہ بھی فرق ہے کہ) تاویل کا استعمال کتب الٰہیہ میں ہوتا ہے اور تفسیر کو کتب الٰہیہ اور ان کے علاوہ دیگر کتابوں میں بھی استعمال کر لیتے ہیں۔

علامہ زرکشی بیان کرتے ہیں کہ تفسیر وہ علم ہے جس سے قرآن پاک کو سمجھا جاتا ہے اور اسی علم تفسیر کے ذریعے قرآن کریم کے معانی کا بیان' اس کے احکام کا استخراج اور اس کے اسرار ومضمرات کو معلوم کیا جاتا ہے' اس سلسلے میں علم لغت' علم نحو' علم صرف' علم بیان' اصول فقہ اور قوانین قراءت سے مدد لی جاتی ہے۔

اسی طرح تفسیر قرآن کے لیے اسباب نزول اور ناسخ ومنسوخ کی معرفت بھی ضروری ہے۔

علم تفسیر کی فضیلت

علم تفسیر کی فضیلت اور اس کا شرف ومرتبہ کوئی مخفی امر نہیں ہے' اس بارے میں خود اللہ تعالیٰ کا ارشاد مبارک ہے:

''يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا'' (البقرہ: ۲۶۹) ''اللہ حکمت دیتا ہے جسے چاہے اور جسے حکمت ملی اسے بہت بھلائی ملی''۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے' وہ بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے قول: ''یوتی الحکمۃ'' سے مراد معرفت قرآن ہے یہ کہ اس میں ناسخ کیا ہے' منسوخ کیا ہے' محکم کیا ہے اور متشابہ کیا

ہے؟ مقدم کون سی چیز ہے اور موخر کون سی اور حلال کیا اور حرام کیا اور امثال کی شناخت کہ کون سی ہیں۔

ابوذر ھروی ''فضائل القرآن'' میں سعید بن جبیر کے حوالہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: جو شخص قرآن مجید تو پڑھتا ہے مگر اس کی تفسیر اچھی طرح نہیں جانتا' اس کی حالت اس اعرابی جیسی ہے جو مطلب سمجھے بغیر بے ڈھب' شعر گنگناتا رہتا ہے۔

- امام بیہقی اور دیگر علماء نے بیان کیا ہے' حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے: ''اَعْرِبُوا الْقُرْاٰنَ وَالْتَمِسُوْا غَرَائِبَهٗ'' قرآن پاک کی تفسیر کرو اور اس کے عجیب وغریب معانی کی تلاش وجستجو میں لگے رہو۔
- ابن الانباری حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ مجھے قرآن پاک کی کسی ایک آیت کو حفظ کرنے کی نسبت اس کی تفسیر بیان کرنا زیادہ محبوب ہے۔

اسی راوی نے حضرت عبداللہ ابن بریدہ سے بہ واسطہ کسی صحابی کے روایت کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: اگر مجھے چالیس راتوں کا سفر کر کے بھی قرآن پاک کی کسی ایک آیت کی تفسیر کا علم حاصل کرنا پڑے تو میں ضرور اس کے لیے سفر اختیار کر لوں۔

اور اسی راوی نے شعبی کے طریق پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے' انہوں نے فرمایا کہ جس نے قرآن پاک کو تفسیر کے ساتھ پڑھا' اس کے لیے اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک شہید کا ثواب ملے گا۔

اعراب سے مراد تفسیر ہے

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں: مذکورہ بالا آثار کا معنی یہ ہے کہ اعراب و تعریب سے تفسیر مراد لی گئی ہے' اس لیے کہ اعراب کا اطلاق حکم نحوی پر مبنی اصطلاح ہے اور اس لیے کہ سلف صالحین اپنے سلیقہ میں اس کے سیکھنے کے محتاج نہ تھے۔

علامہ اصبہانی فرماتے ہیں کہ سب سے افضل صنعت یا فن جو انسان اختیار کرتا ہے' وہ قرآن مجید کی تفسیر ہے۔

فن تفسیر کو تین وجوہ سے دیگر علوم وفنون پر شرف حاصل ہے:

(۱) موضوع کے اعتبار سے' اس لیے کہ اس کا موضوع اللہ تعالیٰ کا کلام ہے' جو تمام حکمتوں کا سرچشمہ اور ہر طرح کی فضیلتوں کا معدن' اس میں ماضی' حال اور مستقبل کے حالات اور اخبار کا بیان ہے۔اس کے احکام مرورِ زمانہ کے ہاتھوں فرسودہ اور پرانے نہیں ہوتے اور نہ ہی اس کے عجائب ختم ہوتے ہیں۔

(۲) اور غرض کے اعتبار سے اس کو جو شرف و بزرگی حاصل ہے' وہ اس لیے کہ اس کی غرض و غایت ہے ''عُرْوَۃِ الْوُثْقٰی'' (البقرہ:۲۵۶) کو مضبوطی سے پکڑنا اور اس سعادت حقیقی کو پالینا' جسے کبھی فنا نہیں ہے۔

(۳) اس کی سخت ضرورت ہونے کے لحاظ سے شرف یوں ہے کہ دینی یا دنیوی ہر کمال جلد حاصل ہونے والا ہو یا بدیر علوم شرعیہ اور معارف دینیہ ہی کا محتاج ہوا کرتا ہے اور یہ علوم ومعارف کتاب اللہ کے علم پر موقوف ہیں۔

تفسیر کے اصل الاصول ماخذ

تفسیر قرآن کے چار ماخذ ہیں:

پہلا ماخذ: نبی کریم سے نقل کا پایا جانا اور یہ سب سے عمدہ ماخذ ہے' لیکن ضعیف اور موضوع روایت سے احتراز لازم ہے کیونکہ کمزور اور من گھڑت روایات بہ کثرت ملتی ہیں' اس لیے امام احمد رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ تین قسم کی روایتیں ایسی ہیں' جن کی کوئی اصل نہیں ہے: مغازی' ملاحم اور تفسیر۔

امام احمد کے اصحاب میں سے محققین نے کہا ہے کہ اس قول سے امام صاحب کی مراد یہ ہے کہ عام طور پر ان امور کی صحیح اور متصل اسناد نہیں پائی جاتیں' ورنہ یوں تو اس کے بارے میں اکثر صحیح روایتیں بھی آئی ہیں' جیسے سورہ انعام کی آیت میں لفظ ''ظلم'' کی تفسیر ''شرک'' اور ''الحساب الیسیر'' کی تفسیر عرض کے ساتھ اور قول باری تعالیٰ ہے: ''وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ'' (الانفال:۶۰) ''اور (اے مسلمانو!) تیار رکھو ان کے لیے (ہتھیاروں کی) قوت سے'' میں لفظ ''قوہ'' کی تفسیر ''رمی'' (تیراندازی'

بم باری) کے ساتھ صحیح روایت کے ساتھ منقول ہے۔

علامہ جلال الدین سیوطی زرکشی نے جو ثابت کیا ہے' اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: تفسیر کے متعلق صحیح روایات درحقیقت بہت ہی کم واقع ہوئی ہیں' بلکہ اس قسم سے اصل مرفوع احادیث حد درجہ قلت کے ساتھ پائی گئی ہیں۔

دوسرا ماخذ: اقوال صحابہ (علیہم الرضوان) سے اخذ کرنا کیونکہ ان کی تفسیر علماء کے نزدیک اس روایت کے درجہ میں ہے' جو حضور نبی اکرم ﷺ تک مرفوع ہو' جیسا کہ حاکم نے اپنی ''مستدرک'' میں بیان کیا ہے۔

تیسرا ماخذ: مطلق لغت کو ماخذ بنانا کیونکہ قرآن عربی زبان میں نازل ہوا ہے' اس بات کو علماء کی ایک جماعت نے ذکر کیا ہے' امام احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے بھی کئی مقام پر اسی بات پر صاد کیا ہے۔

لیکن فضل ابن زیاد نے امام احمد علیہ الرحمہ ہی سے نقل کیا ہے کہ ان سے ایک مرتبہ قرآن پاک کی مثال کسی شعر سے پیش کرنے کی بابت دریافت کیا گیا کہ یہ کیسا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: مجھے یہ بات اچھی نہیں لگتی' چنانچہ کہا گیا ہے کہ امام احمد کے اس قول کا ظاہر مطلب یہ ہے کہ ممنوع ہے' اسی لیے بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ قرآن مجید کی تفسیر لغت کے مقتضاء کے مطابق جائز ہونے میں امام احمد سے دو روایتیں آئی ہیں۔

اور یہ بھی قول ہے کہ اس سلسلے میں کراہت کا احتمال اس شخص پر ہوگا جو کہ آیت کو اس کے ظاہر سے ایسے معنی کی طرف پھیرے' جو اس کی ذات سے خارج اور محض محتمل ہیں اور کلام عرب کی دلالت اس معنی پر کم ہی ہو اور غالب اور زیادہ تر وہ معنی شعر اور اسی کی مثل کے علاوہ اور کلام میں نہیں پائے جاتے اور ذہن فوری طور پر اس کے خلاف کی طرف ہی سبقت کرتا ہو۔

چوتھا ماخذ: تفسیر قرآن کلام کے معنی کے مقتضی اور شریعت سے مقتضب اور ماخوذ رائے سے کی جائے اور یہی تفسیر ہے' جس کے بارے میں رسول اکرم ﷺ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے لیے دعا کی تھی کہ ''اللھم فقهه فی الدین و علمه التاویل'' ''اے اللہ! تو اسے فقیہ الاسلام اور عالم تفسیر بنا دے''۔

اور اسی امر کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے اپنے قول ''الا فھما یوتاہ الرجل فی القرآن '' مگر وہ فہم وادراک جو کسی شخص کو قرآن کے بارے میں عطا فرمائی گئی ہو' سے مراد لیا ہے اور اسی وجہ سے صحابہ رضی اللہ عنہم کا اس آیت کے معنی میں اختلاف ہوا اور ہر ایک نے اپنے منتہائے فکر ونظر کے مطابق اپنی رائے قائم فرمائی مگر قرآن مجید کی تفسیر بغیر کی اصل کے محض رائے اور اجتہاد کے ساتھ کرنا جائز نہیں ہے' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''وَلَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَکَ بِهٖ عِلْمٌ '' (بنی اسرائیل: ۳۶) ''جس چیز کا تمہیں علم نہیں' اس کے پیچھے نہ پڑو''۔

نیز فرمایا: ''وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰهِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ '' (الاعراف: ۳۳) '' اور یہ کہ اللہ پر وہ بات کہو جس کا علم نہیں رکھتے''۔

اسی طرح ارشاد ہے: ''لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ '' (النحل: ۴۴) ''تم لوگوں سے بیان کر دو جو ان کی طرف اترا'' اس میں ''بیان'' کی نسبت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف کی گئی ہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''من تکلم فی القرآن برایہ' فاصاب فقد اخطاء '' جس شخص نے اپنی رائے سے قرآن مجید میں کوئی بات کہی' چاہے اس کی بات درست بھی نکلی مگر اس نے ایسا کرنے میں غلطی کی ہے' اس حدیث کو ابوداؤد' ترمذی اور نسائی نے روایت کیا ہے۔

اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''من قال فی القرآن بغیر علم فلیتبوا مقعدہ فی النار '' (اخرجہ ابوداؤد) جس شخص نے قرآن پاک (کی تفسیر) میں بغیر علم کے کوئی بات کہی' پس وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنالے۔

امام بیہقی پہلی حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اگر یہ حدیث صحیح ثابت ہو جائے تو (حقیقت امر تو اللہ ہی جانتا ہے لیکن) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رائے سے وہی رائے مراد لی ہے' جس کی پشت پر کوئی دلیل قائم نہ ہو' ورنہ وہ رائے جس کی تائید وتوثیق کوئی روشن دلیل کر دے' اس کو تفسیر میں پیش کرنا جائز ہے۔

ماوردی رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ بعض محتاط اور پرہیزگار لوگوں نے اس حدیث کو اس کے ظاہری معنی پر محمول کرتے ہوئے اجتہاد سے قرآن پاک سے احکام کا استنباط

کرنا ممنوع قرار دیا ہے' اگرچہ شواہد اس کے جواز کا ساتھ دیتے ہوں اور کوئی نص صریح بھی ان کے قول کے شواہد کے معارض نہ ہو' پھر بھی وہ اپنے اجتہاد سے قرآن حکیم کے معانی کا استنباط کرنے سے دست کش رہے ہیں' لیکن یہ فعل ہمارے اس تعبد (عبادت گزاری) سے ایک قسم کا تجاوز ہے' جس کی معرفت کا ہمیں حکم ملا ہے کہ ہم قرآن میں نظر وفکر کر کے اس سے احکام مستنبط کریں' جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''لَعَلِمَهُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ '' (النساء: ۸۳) ''تو ضرور ان سے اس کی حقیقت جان لیتے'' یہ جو بعد میں کاوش کرتے ہیں اور اگر پرہیزگار لوگوں کی یہ منطق درست مان لی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اجتہاد کا دروازہ بند اور استنباط کے ذریعے سے کسی امر کو معلوم کرنا ہی شجر ممنوعہ ہے اور اکثر لوگ قرآن پاک سے کسی چیز کو سمجھیں ہی نہیں اور اگر حدیث مذکور صحیح ثابت ہو تو اس کی تاویل یعنی اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ جو شخص صرف اپنی رائے سے قرآن حکیم کے بارے میں کلام کرے اور بجز اس کے لفظ کے کسی اور بات پر توجہ نہ کرے تو خواہ وہ حق بات کو پالے' مگر وہ ہے غلط رو اور اس کا صحیح منہاج پر چلنا اتفاق ہی سے ہے! کیونکہ اس حدیث کا منشاء یہ ہے کہ ایسا قول محض رائے ہے' جس کا کوئی شاہد نہیں۔

حدیث پاک میں آتا ہے کہ ''القرآن ذلول ذو وجوہ' فاحملوہ علی احسن وجوھہ '' یعنی قرآن بہت ہی رام ہو جانے والی سہل الفہم چیز ہے اور وہ متعدد وجوہ (پہلو) رکھتا ہے' لہٰذا تم اسے سب سے اچھے پہلو پر محمول کرو۔ اس حدیث کو ابونعیم وغیرہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے' اس حدیث میں لفظ ''ذلول'' دو معنوں کا احتمال رکھتا ہے: (۱) ایک یہ کہ وہ قرآن اپنے حاملین (اٹھانے والوں) کا اس طرح مطیع اور ان کے زیر تصرف ہے کہ ان کی زبانیں اسی قرآن ہی کے ساتھ ناطق اور گویا ہیں (۲) دوسرے یہ کہ قرآن خود اپنے معانی کو واضح کرتا ہے' یہاں تک کہ ان مجتہدین کی سمجھ فہم القرآن سے قاصر اور عاجز نہیں رہتی۔

اور جو وجوہ کا قول بھی دو معنوں کا محتمل ہے: (۱) ایک یہ کہ قرآن کے بعض الفاظ ایسے ہیں جو تاویل کی کئی وجوہ کا احتمال رکھتے ہیں (۲) اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ قرآن پاک

میں اوامر ونواہی‘ ترغیب وترہیب اور تحلیل وتحریم کی قسم سے بہ کثرت وجوہ موجود ہیں۔

O اور اسی طرح قولہ ’’فاحملوہ علی احسن وجوھہ‘‘ بھی دو معنوں کا احتمال رکھتا ہے‘ ایک یہ ہے کہ اس کو اس کے بہترین معانی پر حمل کرنا ہے اور دوسرے یہ معنی ہیں کہ کلام اللہ میں جو بہترین باتیں ہیں‘ وہ عزیمتیں بغیر رخصتوں کے ہیں اور عفو بغیر انتقام کے ہے اور اس بات میں کتاب اللہ سے استنباط اور اجتہاد کے جواز پر دلیل بڑی روشن ہے۔

مفسر کون ہو سکتا ہے؟

علماء بیان کرتے ہیں کہ قرآن کی تفسیر وہ شخص کر سکتا ہے جو تمام ایسے علوم کا جامع ہو‘ جن کی حاجت مفسر کو ہوتی ہے اور وہ مندرجہ ذیل پندرہ علوم ہیں:

(۱) **علم لغت:** کیونکہ مفردات الفاظ کی شرح اور ان کے مدلولات باعتبار وضع اسی علم کے ذریعہ سے معلوم ہوتے ہیں۔

(۲) **علم نحو:** نحو کا علم اس لیے ضروری ہے کہ معانی کا تغیر اور اختلاف اعراب کے اختلاف سے وابستہ ہے‘ لہٰذا اس کا اعتبار ناگزیر ہے۔

ابوعبید نے حسن رحمۃ اللہ سے روایت کی ہے کہ ان سے اس شخص کے متعلق پوچھا گیا‘ جو کہ زبان سے الفاظ کو ٹھیک طریق سے ادا کرنے اور صحیح قراءت کرنے کے لیے عربی زبان سیکھتا ہے تو حسن رحمۃ اللہ نے جواب دیا: اس کو عربی کی تعلیم ضرور لینی چاہیے کیونکہ ایک آدمی کسی آیت کو پڑھتا ہے اور وہ وجہ اعراب میں لغزش کھا کر ہلاکت میں جا گرتا ہے۔

(۳) **علم صرف:** اس سے لفظوں کی ساخت اور صیغوں کا علم حاصل ہوتا ہے۔ ابن فارس رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ جس شخص سے علم صرف فوت ہو گیا‘ وہ ایک عظیم الشان چیز سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔

(۴) **علم اشتقاق:** کیونکہ اگر ہم اشتقاق دو مختلف مادوں سے ہو گا تو وہ اپنے دونوں مادوں کے مختلف ہونے کے لحاظ سے الگ الگ ہو گا‘ جیسے ’’مسیح‘‘ کہ معلوم نہیں آیا وہ ’’سیاحت‘‘ سے مشتق ہے یا ’’مسح‘‘ سے بنا ہے۔

(۵‘۶‘۷) **معانی‘ بیان اور بدیع کے علوم:** کیونکہ علم معانی سے مفید ہونے کے لحاظ سے ترکیب کلام کے خواص کی معرفت اور شناخت حاصل ہوتی ہے۔

علم بیان سے تراکیب کلام کے خواص کی معرفت‘ ان کے وضوح دلالت اور خفائے دلالت میں مختلف ہونے کے اعتبار سے حاصل ہوتی ہے اور علم بدیع وجوہ تحسین کلام کی معرفت کا ذریعہ ہے‘ انہیں تین علوم کو علوم بلاغت کہتے ہیں۔

اور مفسر کے لیے یہ تینوں علوم رکن اعظم ہیں کیونکہ مفسر کے لیے مقتضائے اعجاز کی رعایت لازمی امر ہے اور وہ صرف انہی علوم سے معلوم ہو سکتا ہے۔

(۸) **علم قراءت:** اس لیے کہ قرآن کے ساتھ نطق کی کیفیت اسی علم کے ذریعہ سے معلوم ہوتی ہے اور قراءتوں ہی کے ذریعہ سے احتمالی وجوہ میں سے بعض کو بعض پر ترجیح دی جاتی ہے۔

(۹) **علم اصول دین:** یہ علم اس لیے ضروری ہے کہ قرآن پاک میں ایسی آیات بھی ہیں‘ جو اپنے ظاہر کے اعتبار سے ایسی چیز پر دلالت کرتی ہیں جس کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر جائز نہیں ہوتا ہے‘ لہٰذا اصولی شخص (کہ جس کو اصول دین کا علم حاصل ہو گا) اس کی تاویل کر کے ایسا طریق نکال لے گا جو عقیدہ صحیحہ کے موافق ہو اور اللہ تعالیٰ کی طرف ان باتوں کی نسبت درست ہو سکے۔

(۱۰) **علم اصول فقہ:** کیونکہ اسی علم سے احکام پر دلیل قائم کرنے اور استنباط مسائل کا طریقہ معلوم ہوتا ہے۔

(۱۱) **علم اسباب نزول اور قصص کا علم:** یہ اس لیے ضروری ہے کہ شان نزول کے علم سے ہی آیت کے وہ معنی معلوم ہوتے ہیں‘ جن کے بارے میں آیت نازل کی گئی ہے۔

(۱۲) **علم ناسخ ومنسوخ:** اس علم کی ضرورت اس لیے ہے تا کہ محکم آیات کو اس کے ماسوا سے ممتاز کر سکیں۔

(۱۳) **علم فقہ:**

(۱۴): ان احادیث مبارکہ کا علم ہو کہ تفسیر مجمل اور مبہم کی مبین ہیں۔

(۱۵) **علم وہبی (یا علم لدنی):** یہ وہ علم ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے عالم باعمل بندوں کو عطا فرماتا

ہے اسی کی طرف اشارہ ہے اس حدیث میں ہے کہ "من عمل بما علم ورثه الله ما لم يعلم" یعنی جو شخص اپنے علم پر عمل کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو ان باتوں کا بھی علم عطا فرما دے گا جو اسے معلوم نہیں ہیں۔

ابن ابی الدنیا فرماتے ہیں:

قرآن کے علوم اور اس سے مستنبط ہونے والے احکام و مسائل ایک بحرِ بے کراں ہے۔

پس یہ علوم جو مفسر کے بارے میں بہ منزلہ آلہ کے ہیں اور چراغ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں ان کے حاصل کیے بغیر کوئی شخص مفسر نہیں ہو سکتا اور جو شخص ان علوم کے بغیر تفسیر قرآن کرے گا وہ تفسیر بالرائے کا مرتکب ہوگا جس کے بارے میں نہی وارد ہوئی ہے اور لیکن جب ان علوم کے حاصل کرنے کے بعد تفسیر کرے گا تو مفسر بالرائے نہ ہوگا جس کی ممانعت ہے۔

صحابہ کرام اور تابعین رضی اللہ عنہم علوم عربیہ کے طبعی اور فطری طور پر ہی عالم تھے وہ اکتسابی عالم نہ بنے تھے اور دیگر علوم کا انہوں نے حضور نبی اکرم ﷺ سے استفادہ کیا تھا اور تعلیم سے حاصل کیے تھے۔

کتاب البرہان میں ہے: معلوم ہونا چاہیے کہ صاحب نظر آدمی کے لیے اس وقت تک معانی وحی کا ادراک حاصل نہیں ہو سکتا اور اس پر وحی کے اسرار و رموز اس وقت تک آشکارا نہیں ہو سکتے جب تک کہ اس کے دل میں کوئی بدعت تکبر ہوائے نفس حب دنیا ہوتی ہے یا وہ گناہ پر اصرار کرتا رہتا یا اس کا ایمان تذبذب اور تزلزل کا شکار رہتا ہے یا اس کا پایۂ تحقیق ڈھیلا ہوتا ہے یا کسی ایسے مفسر کے قول پر اعتماد کرتا ہے جو علم سے کورا ہوتا ہے یا اپنی عقل ہی پر تفسیر کا پورا محل تعمیر کرنے والا ہوتا ہے اور یہ تمام باتیں ایسے موانع حجابات اور حصول فہم و عقل کی راہ کے روڑے ہیں ایک سے ایک بڑھ کر ہے۔

طبقات مفسرین

تفسیر صحابہ

صحابہ کی جماعت میں دس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مفسر مشہور ہوئے ہیں: خلفاء اربعہ (۵) حضرت عبداللہ ابن مسعود (۶) حضرت عبداللہ ابن عباس (۷) حضرت ابی ابن کعب (۸) حضرت

زید ابن ثابت (۹) حضرت ابو موسیٰ الاشعری اور (۱۰) حضرت عبداللہ ابن زبیر (رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین)۔

خلفائے اربعہ علیہم اجمعین میں سب سے زیادہ روایتیں تفسیر قرآن کے سلسلہ میں حضرت علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ الکریم سے آئی ہیں اور باقی تینوں خلفاء رضی اللہ عنہم سے اس بارے میں بہت ہی کم روایتیں منقول ہیں اور اس کا سبب یہ تھا کہ ان کا وصال پہلے ہو گیا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت حدیث کی قلت کا بھی یہی سبب ہے۔

تفسیر قرآن کے بارے میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بہت ہی کم آثار (اقوال) محفوظ ہیں جو تعداد میں تقریباً دس سے متجاوز نہیں ہوں گے مگر حضرت مولیٰ علی مشکل کشاء کرم اللہ وجہہ الکریم سے بہ کثرت آثار تفسیر کے بارے میں مروی ہیں۔

○ معمر نے وہب ابن عبداللہ رحمۃ اللہ سے اور وہب نے ابوالطفیل رحمۃ اللہ سے روایت کی ہے وہ بیان کرتے ہیں: میں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کو خطبہ دیتے ہوئے دیکھا وہ فرما رہے تھے:

ترجمہ: تم لوگ مجھ سے سوال کرو! کیونکہ اللہ کی قسم! تم جو بات بھی پوچھو گے میں تم کو اس کی خبر دوں گا ہاں! مجھ سے قرآن پاک کے متعلق سوال کرو اس لیے کہ واللہ کوئی آیت ایسی نہیں جس کے بارے میں مجھ کو علم نہ ہو کہ آیا وہ رات میں نازل ہوئی یا دن میں اور ہموار میدان میں اتری یا پہاڑی علاقہ میں۔ ابونعیم کتاب الحلیہ میں ابوبکر ابن عیاش کے طریق سے نصیر ابن سلیمان الاعمش سے اس کے باپ سلیمان کے واسطہ سے اور سلیمان حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے روایت بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا:

"واللّٰه ما نزلت آيته الا وقد علمت فيم انزلت واين انزلت ان ربى وهب لى قلبا عقولا ولسانا سئولا" (ترجمہ:) اللہ کی قسم! کوئی آیت ایسی نہیں نازل ہوئی جس کی نسبت میں نے یہ نہ معلوم کر لیا ہو کہ وہ کس بارے میں نازل ہوئی ہے میرے رب نے مجھ کو ایک نہایت سمجھ والا دل اور بہت سوال کرنے والی زبان عطا فرمائی ہے۔

○ ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے بہ نسبت حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کے بھی زیادہ روایتیں منقول ہیں۔

ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت ہے' وہ فرماتے ہیں:

اس ذات پاک کی قسم ہے جس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں ہے! کتاب اللہ کی کوئی آیت نہیں اتری مگر یہ کہ مجھ کو علم ہے کہ وہ کن لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی اور کہاں نازل ہوئیں ہے اور اگر میں کسی ایسے شخص کا مکان جانتا ہوتا جو کہ کتاب اللہ کا مجھ سے زیادہ علم رکھنے والا ہوا اور وہاں تک سواریاں پہنچ سکتی ہوں تو اس کے پاس میں جا پہنچتا۔

○ ابونعیم رحمۃ اللہ نے ابوالبختری سے روایت کی ہے' انہوں نے بیان کیا ہے کہ لوگوں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے دریافت کیا: آپ ہم سے ابن مسعود (رضی اللہ عنہما) کے بارے میں کچھ بیان فرمائیے' تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب میں ارشاد فرمایا: ''علم القرآن والسنه ثم انتهى وكفى بذلك علما'' یعنی انہوں نے قرآن اور سنت کا علم سیکھا اور پھر وہ منتہی ہو گیا اور ان کا اس قدر علم کافی ہے۔

○ رہے ابن عباس رضی اللہ عنہما تو وہ ترجمان القرآن ہیں اور وہ شخصیت ہیں جن کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعا کی کہ ''اللهم فقهه في الدين وعلمه التاويل'' اے اللہ! تو اس کو دین کا فقیہ بنا اور تاویل وتفسیر کا عالم بنا۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے لیے یہ بھی دعا فرمائی:

''اَللّٰهُمَّ اٰتِهِ الْحِكْمَةَ'' اے اللہ! تو اس کو حکمت عطا فرما اور ایک روایت میں ہے:

''اَللّٰهُمَّ عَلِّمْهُ الْحِكْمَةَ'' اے اللہ! تو اس کو حکمت سکھا۔

○ ابونعیم نے الحلیہ میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی' انہوں نے بیان کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حق میں دعا فرمائی تھی: ''اَللّٰهُمَّ بَارِكْ فِيْهِ وَانْشُرْ مِنْهُ'' یا اللہ! تو اس میں (اس کے علم میں) برکت عطا فرما اور اس کے علم کی اشاعت فرما دے اور اس کو پھیلا دے۔

ابونعیم نے اپنی ایک اور سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ

انہوں نے فرمایا: میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں اس حالت میں پہنچا' جب آپ کے پاس حضرت جرائیل علیہ السلام موجود تھے' پس جرائیل علیہ السلام نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا: یہ شخص اس امت کا ''جبر'' زبردست عالم ہونے والا ہے' لہٰذا آپ اس کی نسبت نیک وصیت فرمائیں۔

○ پھر اسی راوی نے عبداللہ بن حراش کے طریق پر بہ واسطہ عوام بن حوشب' مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ ابن عباس نے کہا: مجھ سے رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''نِعْمَ تَرْجُمَانُ الْقُرْاٰنِ اَنْتَ'' تم کیا خوب ترجمان قرآن ہو۔

○ ابونعیم نے مجاہد سے روایت کی ہے' انہوں نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اپنے علم کی کثرت کی وجہ سے بحر العلوم کہلاتے تھے (یعنی آپ کو علم کا سمندر کہا جاتا تھا)۔

اور ابن الحنفیہ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: ابن عباس اس امت کے ''جبر'' (زبردست) عالم ہیں۔

اسی راوی نے حسن سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: ابن عباس رضی اللہ عنہما کو فہم القرآن میں وہ بلند مرتبہ حاصل تھا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے کرتے تھے: ''ذاكم فتى الكهول ان له لسانا سؤلا وقلبا عقولا'' یہ ہیں تمہارے پختہ عمر نوجوان تحقیق ان کی زبان بے حد سوال کرنے والی اور دل اعلیٰ درجہ کا دانش ور ہے۔

○ امام بخاری نے سعید بن جبیر کے طریق پر ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے' انہوں نے بیان کیا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ مجھ کو اپنی خدمت میں شیوخ بدر کے پاس جگہ دیتے اور ان کے ساتھ بٹھاتے تھے' اسی وجہ سے ان شیوخ میں سے بعض کے دل میں یہ خیال آیا اور انہوں نے کہا: یہ لڑکا ہمارے ساتھ کیوں داخل کیا جاتا ہے حالانکہ یہ تو ہمارے بیٹوں کا ہم عمر ہے۔ حضرت عمر نے یہ اعتراض سن کر فرمایا: یہ لڑکا ان لوگوں میں سے جن کے درجہ کو تم جانتے ہو۔

چنانچہ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک دن شیوخ بدر کو بلا بھیجا اور ابن عباس کو بھی

انہی کے ساتھ بٹھایا۔ حضرت ابن عباس کہتے ہیں: میں سمجھ گیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آج مجھ کو ان لوگوں کے ساتھ محض اس لیے بلایا تا کہ ان کو میرا مقام دکھا دیں' چنانچہ حضرت عمر نے شیوخ بدر کو مخاطب کرتے ہوئے دریافت فرمایا: تم لوگ اللہ تعالیٰ کے قول "اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ" (النصر:۱) "جب اللہ کی مدد اور (اس کی) فتح آ جائے" کے متعلق کیا کہتے ہو (یعنی اس کا کیا مفہوم ہے)؟ بعض شیوخ نے کہا: ہمیں اس وقت اللہ تعالیٰ کی حمد کرنے اور اس سے بخشش مانگنے کا حکم دیا گیا ہے' جب کہ ہم کو نصرت عطا ہو اور ہمیں فتوحات نصیب ہوں۔ بعض شیوخ بالکل چپ رہے' انہوں نے کوئی بات نہیں کہی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے بعد میری طرف توجہ فرما کر کہا: کیوں ابن عباس (رضی اللہ عنہما) کیا تم بھی ایسا ہی کہتے ہو؟ میں نے کہا: نہیں! حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: پھر تم کیا کہتے ہو؟ میں نے کہا: وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال شریف کی طرف اشارہ ہے' جس کا علم اللہ تعالیٰ نے آپ کو دیا تھا اور فرمایا کہ "اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ" (النصر:۱) "جس وقت اللہ تعالیٰ کی نصرت اور فتح آئے" تو یہ بات تمہارے دنیا سے سفر کرنے کی علامت ہے' اس وقت تم اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ اس کی پاکی بیان کرنا اور اس میں مغفرت طلب کرنا' بے شک اللہ تعالیٰ بہت توبہ قبول کرنے والا ہے' میرا یہ جواب سن کر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مجھ کو بھی اس سورت کے بارے میں یہی معلوم ہوا ہے جو تم کہتے ہو۔

طبقہ تابعین

علامہ ابن تیمیہ کا بیان ہے: تفسیر کے سب سے بڑے عالم اہل مکہ ہیں' اس لیے کہ وہ لوگ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اصحاب میں سے ہیں (یعنی انہیں آپ کی صحبت اور رفاقت حاصل رہی ہے) جیسے مجاہد' عطاء ابن ابی رباح' عکرمہ مولی ابن عباس' سعید ابن جبیر اور طاؤس وغیرہ رضی اللہ عنہم اور اسی طرح کوفہ میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے اصحاب اور علماء مدینہ بھی تفسیر کے بارے میں اعلیٰ معلومات کے حامل ہیں مثلاً زید ابن اسلم جن سے کہ ان کے بیٹے عبدالرحمٰن ابن زید اور مالک ابن انس نے تفسیر کا علم حاصل کیا۔

ان بزرگوں میں سرفہرست حضرت مجاہد ہیں' حضرت فضل ابن میمون بیان کرتے ہیں:

میں نے حضرت مجاہد کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ انہوں نے کہا:

میں نے تیس مرتبہ قرآن مجید کو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما پر پیش کیا ہے۔

نیز اسی راوی کا بیان ہے کہ مجاہد کہتے ہیں: میں نے قرآن کو ابن عباس رضی اللہ عنہما کے سامنے تین مرتبہ اس کیفیت کے ساتھ پڑھا کہ اس کی ایک ایک آیت پر ٹھہر کر پوچھا کہ وہ کس کے متعلق نازل ہوئی ہے اور کیسے تھی؟

○ خصیف کا بیان ہے کہ ان لوگوں میں مجاہد بہت بڑے مفسر قرآن تھے' امام ثوری کہتے ہیں: اگر تم کو مجاہد سے تفسیر کی روایت ملے تو تمہارے لیے کافی ہے۔

ابن تیمیہ کا قول ہے: اسی سبب سے مجاہد کی تفسیر پر شافعی اور بخاری وغیرہ اہل علم اعتماد کرتے ہیں۔

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: فریابی اپنی تفسیر میں صحابی کے اقوال زیادہ اور تابعی کے اقوال بہت تھوڑے لاتے ہیں۔

○ اور منجملہ ان تابعین کے جن کی تفسیر قابل اعتماد ہے' سعید بن جبیر بھی ہیں' حضرت سفیان ثوری فرماتے ہیں:

تم تفسیر کا علم چار شخصوں سے حاصل کرو' سعید ابن جبیر سے' مجاہد سے' عکرمہ سے اور ضحاک سے۔

حضرت قتادہ کا بیان ہے:

تابعین میں سے چار شخص بہت بڑے عالم ہوئے ہیں۔ عطاء ابن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ' یہ مناسک کے بہت بڑے عالم تھے۔

○ سعید ابن جبیر' یہ تفسیر کے بہت ماہر تھے۔

○ حضرت عکرمہ کو علم سیر میں بہت دسترس حاصل تھی۔

○ اور حضرت حسن ان میں حلال اور حرام کے سلسلہ میں وسیع معلومات رکھتے تھے۔

اور منجملہ ان لوگوں کے عکرمہ مولی ابن عباس ہیں' شعبی کا قول ہے:

عکرمہ سے بڑھ کر کتاب اللہ کا عالم کوئی باقی نہیں رہا۔

سماک بن حرب کہتے ہیں: میں نے حضرت عکرمہ کو یہ کہتے ہوئے سنا' وہ فرماتے تھے کہ

بے شک میں نے اس چیز کی تفسیر کر دی ہے جو کہ دو لوحوں کے درمیان ہے (یعنی پورے قرآن پاک کی تفسیر کر دی ہے)۔

تابعی مفسرین میں سے حسن بصری، عطاء ابن ابی رباح، عطاء ابن ابی سلمہ الخراسانی، محمد ابن کعب القرظی، ابو العالیہ، ضحاک ابن مزاحم، عطیہ العوفی، قتادہ زید ابن اسلم، مرہ الہمدانی اور ابو مالک ہیں۔

ربیع ابن انس اور عبد الرحمٰن ابن زید، یہ دوسرے طبقہ کے بزرگ ہیں، یہ حضرات جن کے اسماء گرامی اوپر ذکر ہوئے ہیں، قدمائے مفسرین ہیں اور ان کے بیشتر اقوال اس قسم کے ہیں، انہوں نے ان اقوال کا صحابہ کرام سے سماع کیا اور ان سے لیے ہیں۔

پھر اس طبقہ کے بعد ایسی تفسیریں تالیف ہوئیں جو کہ صحابہ کرام اور تابعین دونوں کے اقوال کی جامع ہیں، جیسے سفیان ابن عیینہ، وکیع ابن الجراح، شعبہ ابن الحجاج، یزید ابن ہارون، عبد الرزاق، آدم ابن ابی ایاس، اسحاق ابن راہویہ، روح ابن عبادہ، عبد ابن حمید، سعید، ابوبکر ابن ابی شیبہ اور بہت سے دوسرے بزرگوں کی تفسیریں۔

○ اس گروہ کے بعد ابن جریر الطبری کا مرتبہ ہے اور ان کی کتاب تمام تفسیروں میں سب سے بڑی اور عظیم الشان تفسیر ہے اور ابن ابی حاتم، ابن ماجہ، حاکم، ابن مردویہ، ابو الشیخ ابن حبان اور ابن المنذر وغیرہ کی تفسیریں ہیں اور ان سب بزرگوں کی تفسیریں صحابہ، تابعین اور تبع تابعین ہی کی طرف مسند ہیں اور ان تفسیروں میں اس بات کے سوا کچھ بھی نہیں ہے، مگر ابن جریر کی تفسیر کہ وہ توجیہ اقوال اور بعض اقوال کو بعض پر ترجیح دینے اور اعراب و استنباط سے بھی بحث کرتے ہیں، لہٰذا وہ دوسروں پر اس لحاظ سے فوقیت رکھتے ہیں۔

○ اس کے بعد بہت سے لوگوں نے تفسیر میں کتابیں لکھیں اور انہوں نے اسانید کو مختصر کر کے پیش کیا اور اقوال کے پے در پے نقل کیا اور یہیں سے خرابیاں پیدا ہوئیں اور صحیح اور غیر صحیح اقوال گڈمڈ ہو گئے۔ بعد ازیں تو یہ ہوا کہ ہر شخص کو جو قول سوجھتا، وہ اس کو نقل کر دیتا تھا اور جس کے دل میں جو آتا، اس پر اعتماد کر لیتا تھا، پھر بعد کے لوگوں نے تو ان باتوں کو اس خیال سے نقل کرنا شروع کر دیا کہ اس کی کوئی اصل ہوگی، تبھی پہلوں نے

اس کو ذکر کیا ہے اور سلف صالحین کی تحریروں یا ایسے بزرگوں کے اقوال کی طرف بالکل التفات نہ کیا، جن کی جانب تفسیر کے سلسلہ میں رجوع کیا جاتا تھا۔

○ اس کے بعد ایسے لوگوں نے تفسیر کی کتابیں لکھیں جو کہ خاص خاص علوم میں عبور اور دسترس رکھتے تھے، پس ان میں سے ہر ایک مفسر اپنی تفسیر میں صرف اسی فن پر اقتصار کرتا، جس کا اس پر غلبہ ہوتا۔

چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ نحوی کو اعراب اور اس کے بارے میں متعدد وجوہ محتملہ کو ذکر کرنے اور علم نحو کے قواعد، مسائل، فروع اور اختلافات بیان کرنے کے علاوہ اور کوئی خیال ہی نہیں ہوتا، جیسے زجاج اور واحدی نے ''البسیط'' میں اور ابو حیان نے ''البحر والنہر'' میں کیا ہے۔

اور مؤرخ شخص کا شغل یہ رہا کہ اس نے اپنی تفسیر میں قصوں کی بھرمار کی اور اگلوں کی خبریں اور ان کے احوال کو درج کر دیا، اس کو اس سے سروکار نہیں ہے کہ وہ واقعات احوال اور قصص و اخبار، جو وہ درج کر رہا ہے سچے بھی ہیں یا نرا جھوٹ کا پلندا ہیں، جیسے کہ ثعلبی نے کیا ہے۔

○ اور فقیہ مفسر لگ بھگ تمام علم فقہ کو باب طہارت سے لے کر ام ولد تک پوری فقہی تفصیلات کو تفسیر میں بھر دیتا ہے اور بسا اوقات ان فقہی مسائل پر دلائل قائم کرنے پر اتر آتا ہے، جن کو آیت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا اور اسی کے ساتھ اپنے مخالفین کی دلیلوں کا جواب بھی دیتا جاتا ہے، جیسے علامہ قرطبی رحمۃ اللہ نے کیا ہے۔

○ اور علوم عقلیہ کے عالم خصوصاً امام فخر الدین رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر کو حکماء اور فلاسفہ کے اقوال اور اس قسم کی باتوں سے بھر دیا ہے اور ایک چیز کو بیان کرتے کرتے دوسری چیز کی طرف نکل جاتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کی تفسیر کا مطالعہ کرنے والے شخص کو آیت کے موقع محل کے ساتھ عدم مطابقت کی وجہ سے سخت حیرت ہوتی ہے۔

ابو حیان ''کتاب البحر'' میں لکھتے ہیں:

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں بہت سی طویل ابحاث اور لمبی چوڑی باتیں اکٹھی کر دی ہیں، جن کو علم تفسیر میں حاجت ہی نہیں پڑتی، اسی لیے بعض علماء نے کہا ہے

کہ علامہ رازی کی کتاب میں (تفسیر) کے علاوہ سب چیزیں ہیں۔

- اور بدعتی کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ آیتوں کی تحریف کر کے انہیں اپنے فاسد مذہب پر منطبق اور چسپاں کرے کیونکہ جہاں اس کو دور سے بھی کسی آوارہ چھٹیل شکار کی صورت دکھائی دی' اس نے فوراً اس کو شکار کر لیا یا ذرا بھی کہیں گنجائش پائی' پس جھٹ ادھر کو دوڑ گیا۔

علامہ بلقینی کا بیان ہے کہ میں نے ''تفسیر کشاف'' میں آیت کریمہ ''فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ'' (آل عمران:۱۸۵) ''تو جو آگ سے بچا کر جنت میں داخل کیا گیا وہ مراد کو پہنچا'' کی تفسیر میں اعتزال کی واضح علامت پائی ہے' بھلا جنت میں داخل ہونے سے بڑھ کر اور کیا کامیابی ہو سکتی ہے' جس سے مفسر نے عدم رویت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

مستند اور قابل اعتماد تفسیر کون سی ہے؟

علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

اگر تم یہ کہو کہ پھر کون سی تفسیر اچھی ہے' جس کی طرف تم راہنمائی کرتے ہو اور اس پر اعتماد کرنے کا حکم دیتے ہو؟

تو میں کہوں گا کہ وہ مستند امام ابوجعفر ابن جریر طبری رحمۃ اللہ تعالیٰ کی تفسیر جس پر تمام معتبر علماء کا اتفاق ہے کہ فن تفسیر میں اس ایسی کوئی تفسیر نہیں پائی جاتی۔ امام نووی رحمۃ اللہ تہذیب میں لکھتے ہیں:

ابن جریر کی تفسیر ایسی شاہکار ہے کہ اس کی مثل کسی نے کتاب تصنیف ہی نہیں کی۔

